راجپوت اور مغل زن وشو کی معاشرت

از

مقبول احمد صمدنی

مؤلف

تاریخ الہ آباد، حیات جلیل، یا فیلسوف استانبول کا داستان گو وغیرہ

بار اول — مارچ ۱۹۴۷ء

تعداد — ایک ہزار جلد

قیمت — ۳ روپے ۱۲ر

پبلشر

الٰہ آباد پبلشنگ ہاؤس۔ الٰہ آباد

مطبوعہ سلیمی برقی پریس۔ الٰہ آباد

تہدیہ و انتساب

بجناب علّامۂ مفضال استاذ الاساتذہ

پروفیسر محمد احسان اللہ خاں صاحب تاجور نجیب آبادی

شمس العلماء

متعنا اللہ بطول بقائہٖ و فیوضہٖ و برکاتہٖ

نازاں توئی کہ ہم چو منے مدح خوانِ تو
نازاں منم کہ ہم چو توئے قدردانِ من

مقبول

ربیع الآخر ۱۳۶۶ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(اللہ کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جو) نہایت رحم والا مہربان (ہے) -

چشمِ گرم

معاشرت[1] کے پُرلطف نشاط انگیز موضوع پر اُس وقت قلم اُٹھانے کا "اتفاق" ہوتا ہے جب میری عمر کی خزاں ہے۔ اور وہ خزاں بھی اپنی پوری بہار پر۔ قوائے نفسانی[2] جواب دے رہے ہیں حافظہ رخصت ہو چکا۔ تاہم حضرت "اتفاق" کا تقاضا ہے اور میں اُن کے ارشاد کی تعمیل پر مجبور ہوں۔

راقم سطور نے اس عالمِ ہستی میں گزشتہ صدی میں قدم رکھا تھا جو اس وقت ہر حیثیت سے گزری ہوئی چیز ہے۔ ہجری تقویم[3] سے

---

[1] باہم زندگی بسر کرنا۔ [2] قوائے نفسانی۔ جن کا دماغ سے تعلق ہے شاؤ بینائی۔ سونگھنا۔ سُننا۔ چکھنا۔ چھونا۔ خیال، فکر، وہم وغیرہ۔ [3] نجموں کا حساب۔ کیلنڈر۔

بھی، عیسوی حساب سے بھی، فصلی اور بکرمی شمار کے پوچھنے کے لئے بھی کسی اختر شناس[۴] کی ضرورت نہیں۔ باوجودیکہ میں وہی ہوں اور زمانہ بھی وہی چلا آتا ہے۔ لیکن سالہائے عمر کا ایک دوسری تقویم سے گھٹ بڑھ جانا ایک طرفہ[۵] مضمون ہے۔ مانتا ہوں کہ پرانے واقعات پر ہم ایسے پیرانِ فرتوت[۶] کو بھی دسترس ہونا چاہیئے تھی مگر دنیا بدل گئی ہے۔ دنیا کے موسم اور فصلیں بدل گئی ہیں۔ اب ایسی دلچسپ، نازک خدمتیں ہمارے ہونہار اور عزیز، فاضل ڈاکٹروں، جواں ہمت، جواں سال، جواں اقبال عالِم پروفیسر صاحبان کے شایانِ شان[۷] ہیں۔ دماغ کی تیزی، ذہن کی جودت، نگاہ کی وسعت اُن کا حصہ ہے صرف انھیں کا حصہ۔ ناکارہ بوڑھوں سے کیا توقعات!

کسی ستم ظریف مستشرق[۸] نواز علم دوست کا ایک لطیفہ مشہور ہے جو مجھ تک میڈیم راگوزن ZENAIDE A. RAGOZIN کی معرفت پہنچا ہے، کہ ہند قدیم کے متعلق اگر کوئی کتاب لکھی جائے تو آخری باب تک پہنچتے پہنچتے، پہلے باب کی نظر ثانی کی ضرورت ہو جاتی ہے[۹]

[۴] نجومی۔ ستاروں کا ماہر [۵] نئی چیز، انوکھی [۶] نہایت بوڑھا۔ سال خوردہ۔ از کار رفتہ [۷] لائق، سزاوار [۸] اورینٹلسٹ۔ علوم مشرقیہ کا متبحر [۹] از۔ ویدک ہند، ترجمہ حمید، صفحہ ۱۷۲۔ رسالہ معارف نمبر ۳ جلد ۴۹ ماہ فروری ۱۹۴۲ء۔ صفحہ ۱۳۳۔

یہ کلیتاً[۱۰] صحیح ہے۔ "تاریخ قنوج" لکھتے وقت مجھے بھی سابقہ پڑا ہے۔ اور اُس کتاب کی اشاعت اسی باعث سے معرضِ[۱۱] تاخیر میں ہے۔ جس زمانہ کے متعلق اسوقت تحقیق و تحمیص[۱۲] پیش نظر ہے، وہ اصطلاحاً "قدیم" تو نہیں، مگر عہد قدیم کا وابستہ بلکہ پابستہ ضرور ہے۔ اُس عہد کی بہت سی خصوصیات اور مشکلات اپنے اندر رکھتا ہے۔ اسی کی بدولت مجھے طرح طرح کی دشواریاں پیش آئیں اور آرہی ہیں۔ زبردست، ناقابل عبور۔ اوراقِ تاریخ کو آغاز کار ہی سے ان باتوں کا پتہ دینے اور سراغ بتانے سے انکار ہے۔ اُن مبارک، مختصر بینہ ایام میں سیاح اور مُورّخ ایسے حالات اور معاشرتی معاملات کو حوالۂ قلم فرمانا تہذیباً و اخلاقاً نازیبا و ناپسندیدہ سمجھتے تھے۔ محتسب را درونِ خانہ چہ کار۔ دانشمندِ یگانہ شیخ شیراز[۱۳] خوش تقدیر تھا اور خوش تدبیر، جس کو فخر ہے

تمتع زہر گوشۂ یافتم زہر خرمنے خوشۂ یافتم

مجھے اپنی حرماں نصیبی اور مساعی[۱۴] کی ناکامی کا شکوہ ہے، یاس

---

[۱۰] تمام و کمال [۱۱] ظاہر کرنے کی جگہ [۱۲] صاف کرنا [۱۳] حضرت سعدیؒ
[۱۴] کوششیں، مساعۃ کی جمع۔

اور بے بسی کا دُکھڑا۔ بہر حال اس بارِ عظیم سے سبکدوش ہونے کی کوشش کی ہے۔ جانتا ہوں کہ یہ صفحات جو پیش کئے جاتے ہیں اپنے لکھنے والے کی ناقابلیت کی رُسوائی اور بے استعدادی کو طشت ازبام کرنے میں کوتاہی نہ کریں گے۔ پھر بھی جراُت کر رہا ہوں۔ اِن بے ربط خیالات، بے سلسلہ تحریرات اور بے ترتیب سلسلۂ مضامین کے ملاحظہ سے قدر شناسانِ علم و فن کو جو زحمت ہوگی اُس کی معافی چاہتا ہوں۔

شرم دارم کہ نوا ہائے پریشاں زدہ ام

راجپوت[۱۵] اور مغل[۱۶] زن و شو[۱۷] کی معاشرت[۱۸]

(۱) بات چیت - بول چال

دنیائے حُسن و عشق کے پیغام رساں دو ہی مانے جاتے ہیں - ایک آنکھ - دوسری زبان - ملائے جامی[۱۹] سا باکمال و ذی شعور بھی جب اِن دونوں کی باہمی فوقیت، افضلیت و بزرگی اور ان کے کارناموں کی اہمیت کا مقابلہ اور فیصلہ نہ فرما سکا تو یہ کہہ کر خاموش ہو گیا :-

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد   بسا کیں دولت از گفتار خیزد

پہلی کے متعلق تو ہمارے دیس (وطن) کا ایک فدائی اور ناموسِ آلہیہ[۲۰] کا رمز شناس و حسّاس شاعر پہلے ہی سے چند لفظوں میں سب

---

۱۵ دیکھیے فرہنگ و حواشی پہلا مقالہ ۱۶ دیکھیے فرہنگ و حواشی دوسرا مقالہ ۱۷ شُوی - شوہر ۱۸ باہم زندگانی بسر کرنا - ۱۹ دیکھیے فرہنگ و حواشی و تتمہ نمبر ۲ - ۲۰ احکام و قواعد و دستورات خداوندی

کچھ کہہ گزرا ہے۔ وہ ان حسن و جمال کی مورتوں اور عصمت و عفت کی
دیویوں کی فطرت اور خلقی شرم و حیا کی حقیقت کو یوں بے نقاب
کرتا ہے۔

تاروں سے حیا آتی ہے پردہ ہے قمر سے — ڈر ہے کہ کوئی دیکھ نہ لے روزنِ در سے
خلوت میں سرکتی نہیں چادر کبھی سر سے — بیگانہ نظر رہتی ہے شوہر کی نظر سے

خلوت میں نگاہوں سے نگاہیں نہیں ملتیں
دل ملتے ہیں دل ملنے کی راہیں نہیں ملتیں

اس لئے اب دیکھنا ہے کہ خدائے سخن کا دوسرا پیامبر (زبان) اپنے
فرض سے کس طرح سبکدوش ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں تو زوجین[۲۱]
میں ہر چیز، ہر بات کا اختلاف ہے۔ یوں کہئے کہ طرفین[۲۲] میں زمین
و آسمان کا فرق ہے۔ ملک و قوم ہی کا فرق نہیں، مذہب کا بھی فرق ہے
۔ بول چال کا فرق ہے۔ عادات و اطوار کا فرق ہے۔ آداب
و اخلاق کا فرق ہے۔ تبلیغ رسالت ہو تو کیسے ہو؟ کون بتا سکتا ہے
کہ خلوت و جلوت کی صحبتوں میں، لطفِ طبع اور حسنِ اختلاط کی

---

[۲۱] مرد عورت۔ میاں بی بی [۲۲] طَرَف یعنی منکوحہ۔ چنانچہ ہمسرہ، ہمخوابہ۔ از
"شمیم شاداب" صفحہ ۱۴۱۔ دیکھو "غیاث اللغات" باب طا مع رائے مہملہ صفحہ ۳۸۰۔
"آئینِ اکبری" جلد سوم، صفحہ ۱۵۴

ابتدائی منزلیں کیونکر طے ہوتی ہوں گی! مقبولؔ دیرینہ سال
کانپتی ہے جس کی پیری کو جوانی دیکھ کر ہنس رہا ہے اپنے خامے کی روانی دیکھ کر
یادہ سرائے شوریدہ حال مقبولؔ نے اپنی طبعِ جواں و رواں سے
بارہا پوچھا، مگر اس کا جواب شافی یا کافی کبھی نہیں پایا کہ یہ عجیب و غریب
اجنبی جوڑے مختلف المزاج مختلف الذہن مختلف الخیال روحیں
باہم دگر عرضِ مطلب اور ادائے خیال پر کس طرح قادر ہوتی تھیں؟
شاید شروع شروع میں اشاروں ہی سے کام چلتا ہوگا۔ سورج منبی
چندر منبی راجکماریاں تورانی[23] تاتاری شوہروں سے بولنا چالنا چاہتی
ہوں گی تو کیا طریقہ اختیار کرتی ہونگی۔

ع۔ زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمیدانم

اعتراف ہے کہ میرا دماغ اس گتھی کو آج تک سلجھا نہ سکا اور ہر مرتبہ

---

[23] دیکھئے فرہنگ و حواشی، نوٹ نمبر ۴ [24] کرنیل ٹاڈ فرماتے ہیں کہ اشاعتِ اسلام سے پہلے سب لوگ ہندو تھے اور ہندو مت کے پیرو، خواہ وہ انڈو سیتھک رہے ہوں یا تاتاری (راجستھان مترجم صفحہ ۱۴۶۷ نوٹ ۱) اور چغتائی تو انہیں یادو کی اولاد تھے۔ (انگریزی مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۴ء صفحہ ۸۲ نوٹ جلد دوم)۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا، جلد ۲ صفحہ ۸۴۴۔ منوچی لکھتا ہے کہ ترکوں کی قدیم زبان تاتاری ہے۔ دہلی کے شاہزادے جب پانچ سال کی عمر کو پہنچتے تھے تو اُن کی پدری زبان (تاتاری) اُنکو سکھائی جاتی تھی۔ جلد سوم صفحہ ۲۲۔ ترجمہ۔ نیز دیکھئے فرہنگ و حواشی، نوٹ پانچواں۔

یہ کہہ کر ٹال گیا کہ فطرت اپنے مطالبات کو پورا کرا لینے پر اُس وقت بھی ایسی ہی قدرت رکھتی تھی جیسی اب رکھتی ہے۔ انسانی اور جنسی ضرورتیں اپنا کام نکال لینا خوب جانتی تھیں۔ شکسپیر[25] SHAKSPERE کا یہ قول بالکل درست ہے کہ "فطرت کے ذرا سے اشارہ پر بنی نوعِ آدم میں رشتہ اور قرابت پیدا ہو سکتی ہے"۔

"ONE TOUCH OF NATURE MAKES THE WHOLE WORLDKIN"....TROILUS AND CRESSIDA

ایسی مخلوط و مختلط[26] قراتوں کا زور شور شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں زیادہ رہا ہے۔ مگر اُس عہد کے نامور سرکاری درباری تاریخ نویس نے اسی قدر لکھ کر قلم روک لیا ہے کہ "ہندوستان ایسے وسیع ملک میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ وہ اختلافات جو ایک کو دوسرے کے سمجھنے سمجھانے سے باز نہیں رکھتے، شمار سے باہر ہیں۔ جن کو حاصل یا دریافت ہی نہیں کر سکتے، دہلی، بنگالہ، ملتان، مارواڑ، گجرات، تلنگانہ، مرہٹ، کرناٹک، سندھ، افغانستان، شال[27] بلوچستان اور

---

[25] ولیم شکسپیر۔ انگلستان کا نامور عدیم المثال شاعر۔ پیدائش ۱۵۶۴ء وفات ۱۶۱۶ء

[26] باہم ملی جلی۔ آمیختہ۔ [27] شال۔ سندھ کابل اور قندھار کے بیچ میں ہے۔

کشمیر کے ہیں[۲۸] - اب بھی

فریادِ جنوں اور ہی بلبل کی فغاں اور   صحرا کی زباں اور ہے گلشن کی زباں اور[۲۹]

اس سے بھی پرانی اطلاع یہی ہے کہ مملکتِ ہند کے مختلف
حصوں اور قطعوں میں مختلف قوموں اور باشندوں کی بول چال
الگ تھی[۳۰] - نو سو برس سے زیادہ ہوا کہ مشہور و معروف حکیم و
فیلسوف ابوریحان محمد بن احمد بیرونی (خوارزمی)[۳۱] یہاں آیا تھا۔ اپنی
قابلِ قدر یادگار کتاب الہند (صفحہ ۸۲) میں لکھتا ہے کہ بھاتی
یا بھاطیہ کا خطہ مابین زابین (حال راج اَوَر) اور ملتان کے واقع تھا
یہاں اور اَرور (روہڑی) میں اور ہی زبان رائج تھی - یہاں کی الف بے
بھی مخصوص اور جدا تھی جو "اردھنا گری" کہلاتی تھی - اور وہی سندھ میں
بھی استعمال ہوتی تھی[۳۲] - اسی پہ موقوف نہیں - جابجا کی بولیوں، زبانوں

---

[۲۸] آئین اکبری جلد سوم صفحہ ۴۵ - زبانہا [۲۹] زبانوں کا اختلاف [۳۰] آب حیات
آزاد دہلوی، مطبوعہ وکٹوریہ پریس ۱۸۸۰ء طبع اول، صفحہ ۱۲ [۳۱] دیکھئے فرہنگ خوارزمی
نمبر ۶ [۳۲] صفحہ ۶۴ مجلہ کابل، نمبر ۱۰۳، ماہ سنبلہ ۱۳۱۸ ہجری شمسی - علامہ ابو یعقوب حسن نے بیان کیا
اصل کتاب عربی سے ہے جس کی تدوین و اشاعت جرمن پروفیسر ساچو E.C. SACHAU
نے کی تھی - موصوف نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا، یہ اسی سے ماخوذ ہیں -
کم از کم اس حصہ کا وہ ترجمہ تو سراسر غلط اور گمراہ کرنے والا بتایا جاتا ہے -

کے اختلافات اور ان کی وجہ سے دشواریوں کا ہر پرانا سیاح، ہر جغرافیہ نویس، ہر تاریخ نگار اقرار کرتا نظر آتا ہے۔ ان کا طرزِ ادا شکوہ و شکایت نہیں تو اور کیا سمجھا جائے۔ اصطخری[33] اور ابن حوقل[34] کے سفرناموں کو دیکھئے منہاج سراج جرجانی[35]، سراج الدین سامانی[36]، قاضی ضیائے برنی[37] اور شمس سراج عفیف[38] سے پوچھئے۔

فرنگستان کے سیاحوں نے بھی اس اختلاف کو محسوس کیا ہے۔ ہولانڈ (HOLLAND) کا متوطن ڈی لیٹ DE LAET اپنے

---

٣٣ دیکھئے فرہنگ و حواشی نوٹ نمبر ٧۔ ٣٤ دیکھئے فرہنگ و حواشی نوٹ نمبر ٨۔

٣٥ طبقاتِ ناصری۔ بنام ناصر الدین محمود شاہ بادشاہ دہلی۔ مطبوعہ کلکتہ صفحہ ١٥٢، مصنفہ قاضی صدرِ جہاں ابو عمر منہاج الدین۔ سراج جرجانی۔ ٦٥١ھ = ١٢٥٣ء ٣٦ خلجی نامہ قلمی از سراج الدین سادی سامانی، بہ اسم سلطان جلال الدین فیروز خلجی۔ قبل ٦٩٥ھ (١٢٩٦ء)۔

٣٧ قاضی ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی (٧٥٨ھ = ١٣٥٧ء) میں اس بادشاہ کی صرف ابتدائی چند برسوں کا ذکر ہے۔ ٣٨ شمس سراج عفیف، مولف تاریخ فیروز شاہی بعہد سلطان فیروز شاہ باربک۔ ٨٠١ھ = ١٣٩٨ء۔ اس میں فیروز شاہ کے مذہبی کارناموں اور تشدد کا ذکر ہے۔ لیکن ان ہی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ اُس وقت ہندوئیت کس حد تک مسلمان دماغوں پر چھائی ہوئی تھی۔ "فتوحاتِ فیروز شاہی" خود فیروز شاہ کے قلم سے ہے۔ سیرتِ فیروز شاہی سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ فتوحات کی ضخامت ٣٢ صفحہ سے زیادہ نہیں جس کا مکمل ترجمہ الیٹ نے جلد سوم صفحات ٣٧٤ لغایۃ ٣٨٨ میں دے دیا ہے۔ فیروز شاہ ان کو "زندیق" کہہ کر یاد کرتا ہے۔

سیاحت نامہ میں اس ملک کی زبانوں کی نسبت لکھتا ہے۔ عام باشندوں کی زبان اپنی اپنی مخصوص ہے۔ اس کا بولنا (تلفظ) آسان ہے۔ بائیں سے داہنے کو لکھی جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے خود ہماری زبانیں لکھی جاتی ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقوں کی زبان فارسی ہے یا عربی۔ لیکن یہ طبقے کچھ بہت زیادہ نہیں ہیں[39]۔

افسوس ہے کرنیل ٹاڈ[40] LIEUTENANT COL. JAMES TOD ایسے وسیع النظر بھی ہماری توقعات کو پورا نہ کر سکے، وہ جو راجپوتانہ کے رنگین نوا داستان سرا اور وہاں کے چپے چپے سے واقف و باخبر تھے۔ جو راجپوتوں کی ہر ادا پر شیفتہ و فریفتہ[41] تھے۔ جنھوں نے

---

[39] صفحہ ۸۴ THE EMPIRE OF THE GREAT MOGAL ترجمہ انگریزی مطبوعہ بمبئی ۱۹۲۸ء۔ ڈی لیٹ نے سفر نامہ اپنی پدری زبان میں لکھا تھا۔ اس نے ۱۶۴۹ء میں وفات پائی۔ سفر نامہ کا انگریزی ترجمہ ہائی لینڈ T. S. HOYLAND نے کیا۔ اور حواشی پروفیسر بونرجی S. BONNERJEA نے لکھے۔ ایک زبان سے دوسری میں منتقل کرتے وقت اور پھر حاشیہ آرائی میں کچھ غلطیاں ہو گئی ہیں۔ ان کی تفصیل کا نہ یہ موقع ہے نہ ضرورت نہ گنجائش۔ [40] دیکھئے فرہنگ و حواشی نوٹ نمبر ۹

[41] ٹاڈ کا راجستھان، ترجمہ افق، جلد اول، صفحات ۷۴، و ۲۹۰ - ڈاکٹر ولیم کروک کا مقدمہ، صفحات ۴۲ و ۴۳ تاریخ ٹاڈ مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۲۰ء جلد اول۔

اپنی دلچسپ و مطول کتاب ''تاریخ راجستھان''[۴۲] ANNALS AND ANTIQUITIES OF RAJASTHAN (1829) میں اُن کے تمام مراسم و عادات کو کمال دلآویزی و تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ سارے حالات گزشتہ و عصری[۴۳] اور اخلاق و آداب عالیہ کو قلمبند کر دیا ہے۔ اُن کے عیوب کو بھی محاسن[۴۴] اور پستیوں کو بلندی و رفعت بنا کر دکھایا[۴۵] ہے۔ غرضکہ اپنا رنگ جمانے اور گہرا روغن چڑھانے، اپنی تحریر کو نگین و رنگین بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں فرمایا[۴۶]۔ وہ جب

---

[۴۲] پیش نظر نسخہ انگریزی طبع دوم مطبوعہ مدراس ۱۸۷۳ء کا ہے۔ اس سے پیشتر بھی یہ کتاب ۱۸۲۹ء تا ۱۸۳۲ء میں طبع ہو چکی تھی۔ ان کا ''غربی ہندوستان میں سفر'' TRAVELS IN WESTERN INDIA ان کی وفات کے بعد ۱۸۳۹ء میں شایع ہوا۔ ٹاڈ صاحب کی کتاب کا ترجمہ ہندی میں بھی موجود ہے۔ پنڈت گوری شنکر اوجھا اس کے لئے مستحق شکرگزاری ہیں۔ [۴۳] اپنے ہی زمانے کے، اپنے وقتوں کے۔ [۴۴] خوبیاں، نیکیاں، اچھائیاں

[۴۵] جلد دوم کا انگریزی تعنون ولیم چہارم کے نام، طبع آکسفورڈ ۱۹۲۰ء۔ ولیم کروک کا مقدمہ صفحہ ۲۷، مطبوعہ بالا۔ جاپادری ہیبر کا سفر صوبجات بالائی میں مطبوعہ ۱۸۶۱ء صفحہ ۵۴ جلد دوم۔ [۴۶] کوارٹرلی ریویو، لندن، جلد ۴۸ اکتوبر دسمبر ۱۸۳۲ء، صفحہ ۴۸ مقدمۂ رقعات عالمگیر از پروفیسر نجیب اشرف ندوی، صفحہ ۲۷۶۔

راجپوت دیویوں کی عفت و عصمت، اُن کے ولولۂ محبت، اشتیاقِ فنا
جذبۂ ایثار و قربانی، جلنے مرنے[46] دیواروں میں چُن دئے جانے کی
داستانیں بیان فرمانے پر آتے ہیں[47] تو کم سے کم مجھ ایسے کمزور و رقیق
قلب والے انسان، جنسِ نازک و لطیف کے حق شناس و منت گزار
پر بجلیاں گرانے لگتے ہیں۔ روح کانپ جاتی ہے۔ درد و
الم کی حسرت بار و عبرت پاش کیفیت طاری ہو جاتی[48] ہے۔ وہ
جن کی تاریخ کو مسٹر اوسی نے حیرت انگیز کارنامہ WONDERFUL
WORK سے تعبیر کیا ہے۔[49] جن کی نسبت اُن کے ایک ہم پیشہ،
ہم فن، ہم وطن کرنیل مے لیسن COL. MALLESON کا
فیصلہ یہ ہے کہ "کرنیل ٹاڈ خود راجپوتوں سے بھی زیادہ" اپنی
ہمدردیوں میں بڑے سے بڑے راجپوت ہیں[50]۔ [illegible]

---

[46] ترجمہ انوق، صفحہ ۲۴۳ - نیز ڈاکٹر ولیم کروک کا مقدمہ صفحہ ۴۴، کتاب انگریزی، مطبوعہ ۱۹۲۰ء

[47] ٹاڈ کی تاریخ راجستھان میں کرشن کنواری بائی کا سانحہ، صفحہ ۵۳۹، مطبوعہ ۱۹۲۰ء - مع نوٹ نمبر ۳، صفحہ ۵۴۰ - نیز صفحہ ۳۴۸ -

[48] ناگاہ ظاہر ہو جاتی -

[49] جورنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی سنہ ۱۹۱۷ء، صفحہ ۸۶۳ -

[50] اکبر اعظم سلطنت مغلیہ کا عروج، صفحہ ۱۸۲ انگریزی -

(BISHOP REGINALD HEBER) نے تو یہاں تک[۵۱]
صاف گوئی سے کام لیا اور ایک سرکاری راز کو افشا فرما دیا ہے
کہ "ٹاڈ صاحب نے اس دیس کے شاہزادوں پر اس قدر نوازش
و عنایت فرمائی کہ کلکتہ کی گورنمنٹ اُن پر کاربشن (رشوت خوری)[۵۲]
کا شبہ کرنے لگی۔ اُن کے اختیارات محدود و دو تنگ کردیے اُن
کے ساتھ اور عہدہ دار شریک کار و اختیار و منصب[۵۳] از خدمت
بنا دئیے۔ حتیٰ کہ وہ دل شکستہ ہوکر مستعفی[۵۴] ہوگئے[۵۵]۔ یہ استعفاء
خدمت قبل از وقت چالیس سال کی عمر میں خرابی صحت کے عذر
یا حیلے سے کرنا پڑا تھا۔ ڈاکٹر ولیم کروک WILLIAM CROOKE
نے اپنی تاریخ کی تمہید میں اقرار کیا ہے کہ "ٹاڈ بدنام طور پر راجپوتوں
کا طرفدار تھا"[۵۶]۔ وہ ایک دوسرے موقع پر "ٹاڈ صاحب کے مبالغہ
اور راجپوتوں کی ستائش پر متعجب نظر آتے ہیں[۵۷]۔
کرنیل موصوف نے جو کچھ لکھا ہے 'کم ہے یا زیادہ' میں تو اس

---

[۵۱] آشکارا اور ظاہر کر دینا۔ [۵۲] از خود عہدۂ خدمت کو چھوڑ دینا۔ ادب کے ساتھ
ہٹ جانا۔ [۵۳] صوبجات بالائی میں سفر، جلد دوم صفحہ ۴۵ مطبوعہ ۱۸۶۱ء۔ [۵۴] صفحہ
۲۷ جلد اول مطبوعہ ۱۹۲۰ آکسفورڈ۔ [۵۵] ٹاڈ صاحب کے راجستھان کا مقدمہ صفحہ ۲۳ مطبوعہ
۱۹۲۰ء۔

ہے یہی نتیجہ نکال سکا ہوں کہ اُس وقت تک ملک بھر کی زبان بھاشا[56] تھی۔ راجپوتانہ میں یہی بولی جاتی تھی۔ گھروں میں بھی، بازاروں میں بھی۔ سرکاروں میں بھی، درباروں میں بھی اسی کا رواج عام تھا۔ رنواسوں میں نیز جہاں تک کہ مسلمانوں کی ہندو رانیوں اور محلاتِ شاہی کی راجپوت نژاد بیگمات کا تعلق ہے، بھاشا ہی بھاشا ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔

سرسید احمد خاں "آثار الصنادید"[57] میں پروفیسر گارساں دتاسی (GARCIN DE TASSEY)[58] اپنے خطبات میں میرے مہربان مسٹر ایف۔ ایس گروس (F. S. GROWSE)[59] اپنے مشہور مقالہ[60] میں تائیداً

---

[56] خدائے سخن امیر مینائی لکھنوی اپنے ایک شاگرد کو (مکتوب نمبر ۱۲۹ صفحہ ۲۳۶) لکھتے ہیں کہ "بھاکا" اصل میں بھاشا ہے اور ہندی میں "شا" اور "کھا" کا بدل ہوتا ہے۔ اردو میں فصحا کی زبان پر بیشتر "بھاکا" اور کمتر "بھاشا" مستعمل ہے۔

لسان العصر اکبر الہ آبادی بھی یہی فرماتے ہیں:۔

ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہو گی لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے

[57] باب سوم، صفحہ ۱۰۴۔ [58] ترجمہ اردو صفحہ ۹۴، مطبوعہ اورنگ آباد دکن۔ [59] دیکھئے زبنگ، حواشی، نوٹ نمبر ۱۰۔

[60] جورنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نمبر ۱۸۶۶ء صفحہ ۱۷۲۔ رسالہ اردو، حصہ ۵۲، جلد ۱۳، صفحات ۷۶۱ و ۷۶۲۔

ایسا ہی فرماتے ہیں۔ پیٹرو ڈی لا ویلی کے قدیم ترسیاحت نامۂ ہندوستان میں بھی ناگری اور دیوناگری کے متعلق دونوں نوٹ قابل ملاحظہ ہیں۔[۶۱]

بھاشا کے قلمرو کی وسعت اور انگلوں کی ایک ستم ظریفی بھی دیکھ لیجیے۔ سلطان محمود اول خلجی[۶۲] فرمانروائے مالوہ (جلوس شوال ۸۳۹ھ = مئی ۱۴۳۶ء۔ وفات ذی قعدہ ۸۷۳ھ[۶۳] = مئی ۱۴۶۹ء) کو سلطان ابوسعید مرزا تاجدار سمرقند و خراسان نے کچھ تحفے (بقول ابوالفضل "گزین ارمغانی"[۶۴]) خواجہ جمال الدین استرآبادی کے ہم دست بھیجے تھے۔ محمود نے اس نوازش و آبرو افزائی کے عوض یا شکریہ میں جو کچھ بھیجا اس کے علاوہ ایک شاندار قصیدہ[۶۵] بھی تھا۔ مالوہ کا

---

[۶۱] ہیورس ڈگرے صاحبان کا انگریزی ترجمہ، صفحہ ۱۱۳، نوٹ ۱ و ۲، مطبوعہ لندن۔

THE TRAVELS OF PIETRO DELLA VALLE IN INDIA.

[۶۲] دیکھیے فرہنگ و حواشی، نوٹ ۱۱ [۶۳] دیکھیے فرہنگ و حواشی نوٹ ۱۲ [۶۴] آئین اکبری جلد دوم، صفحہ ۱۰۶، مالوہ۔ [۶۵] شاعروں کی اصطلاح میں ایسی نظم جس کی پہلی بیت کے دونوں مصرعے باقی بیتوں کے مصرع ثانی کے ہم قافیہ ہوں اور جس میں یا تو کسی کی مدح یا مذمت کا، یا نصیحت یا حکایت کا، یا اسی قسم کی باتوں کا بیان ہو اور پندرہ شعروں سے کم نہ ہوں۔

مزاج شناس معاملہ فہم امیر شیخ علاؤ الدین اس سفارت پر مامور اور روانہ کیا گیا تھا۔ کوئی صاحب صاف طور پر تو لکھتے نہیں، لیکن تاریخ فرشتہ کے مؤلف ملا قاسم ہندو شاہ کا خیال ہے کہ یہ قصیدۂ غرّا ہندی میں تھا۔ "ظاہراً بزبان ہندی بود" [66] یہ تو ممکن ہے کہ خود بدولت (محمود مالوی) ہندی میں شاعری کر لیتے ہوں یا بہ طریق تنزل اسکو سمجھ لیتے ہوں۔ لیکن شاہِ کج کلاہ نے اس قصیدہ سے کیا لطف اٹھایا ہوگا؟ کیا سمجھے ہوں گے؟ بھاشا سیکھنے کے لئے اپنی ولایت میں کس گورو یا پنڈت کے سامنے زانوے ادب تہ کیا ہوگا؟ بہرحال یہ ایک واقعہ ہے جس کی توثیق [67] پر فرشتہ کی مہر ثبت ہے۔ اور مولوی امیر احمد علوی نے "شاہانِ مالوہ" میں افسوس کیا ہے کہ "اس قصیدہ کا کوئی شعر مورخین نے قلمبند نہیں کیا۔ ورنہ معلوم ہو سکتا کہ پانچ سو برس بیشتر ہندوستان کی زبان میں مسلمان کیوں کر شاعری کرتے تھے" [68]

ایک اور ہم نام (محمود اعظم) کو بھی دیکھ لیجئے اور پھر اس کے عمل کو، نام "محمود" کی برکات و کمالات میں شمار کیجئے یا عجائب تصرفات میں۔ یہ تو اس سے بھی چار سوا چار سو برس پہلے کی بات ہے جب مسلمان

---

٦٦ جلد دوم، صفحہ ۳۵۲، مقالہ پنجم ٦٧ محکم و استوار کر دینا۔
٦٨ صفحات ۸۵ و ۸۶۔

حملہ آوروں کو ہندوستان میں پاؤں پھیرنا تو نصیب ہو چکا تھا لیکن حقیقتاً اس ملک کی ہوا ابھی اطمینان سے لگنے نہیں پائی تھی حکیم سید شمس اللہ قادری فرماتے ہیں " ۴۱۳ھ (۱۰۲۲ء) میں سلطان محمود نے قلعہ کالنجر کا محاصرہ کیا تو وہاں کے راجہ نندا نے تین سو ہاتھی دے کر صلح کر لی۔ اور ہندی زبان میں ایک قصیدہ مدحیہ لکھ کر سلطان کی خدمت میں روانہ کیا۔ دربار میں ہند اور عرب و عجم کے جو علماء تھے انھیں سلطان نے یہ قصیدہ سنایا۔ سبھوں نے اس کی تعریف و توصیف کی۔ تو سلطان نے اس کے صلہ میں نندا کے تمام علاقے واپس کردئے۔ اور علاوہ اس کے چودہ قلعوں کو اپنی طرف سے اسے دیدیا[۶۹]

تو مپندار کہ ایں قصہ زخود می گویم
گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

ہندو شاہ بھی یہی کہتا ہے ۔" ونندا بزبانِ ہندی در مدحِ سلطان شعرے گفتہ نزد او فرستاد۔ سلطان آں را بفضلائے ہند و عرب و عجم کہ در ملازمت او بودند نمود و ہمگی تحسین و آفریں کردند۔ سلطان بایں مباہات کردہ منشورِ حکومت پانزدہ قلعہ کہ یکے از انہا کالنجر بود با

---

۶۹ آثار الکرام، صفحہ ۵۲۔

تحف دیگر در وجہ صلۂ او فرستاد۔[نشہ]

آفریں کہتا ہوں سلطان کی عالی ہمتی، اولوالعزمی اور دریا دلی پر۔

ع۔ در بجود ہر آنچہ بہ فتح بستاند۔

مگر یہ ذہنی جودت یا دماغی کرتب بازی میری ناقص فہم سے باہر ہے کہ محمود کو اس قدر جلد ہندوستان اور اس ملک کے اُن بہت سے قطعات کی زبانوں پر عبور ہوتا جاتا تھا۔ جن میں اس خواندہ (لکھے پڑھے) سپاہی مگر مہمان نواز ہندوستان کے ناخواندہ مہمان کا گزر ہوتا تھا۔ اس نے اپنے اہلِ دربار کو یہ ہندی قصیدہ پورے طور پر یا کسی قدر روانی ہی سے سنا دیا ہو! کہہ دینا تو آسان ہے مگر غور تو فرمائیے کہ عرب کے غریب الدیار اور عجم کے بڑے وہی مگر پردیسی علما و شعرا نے (جو اس وقت شاہی تقرّب اور حضوری کا شرف حاصل کر رہے تھے) انھوں نے اس اجنبی اور بیگانہ چیز کو کیا سمجھا ہوگا۔ اپنی کم واقفیت اور عدمِ مہارت کی عذر خواہی کے بجائے اس قصیدہ کی تحسین و ستایش کس زبان سے کی ہوگی؟ کوئی اس کو مانے یا نہ مانے اور محمود کے لئے قابلِ افتخار بتائے یا نہ بتائے لیکن میرے نزدیک تو یہ صرف راجہ ندا کے کمالِ اعجاز اور تسخیر و کرامت ہی کی دلیل ہو سکتی ہے۔[لہ]

نشہ تاریخ فرشتہ صفحہ ۲۱ مقالہ اول۔ طبقات اکبری صفحہ ۹۔ لہ دیکھئے فرہنگ و حواشی، نوٹ ۱۴۔

آٹھویں صدی ہجری پر ذرا نگاہ ڈالئے۔ محمد شاہ تغلق اول کو ملاحظہ کیجئے (جلوس ۷۲۵ھ = ۱۳۲۵ء وفات ۷۵۲ھ = ۱۳۵۱ء)۔ وہ بہت سے علوم اور زبانوں کے سوا ہندی بھی خوب جانتا تھا۔ سیکھی تھی۔ اپنی قیام گاہ یا قصر شاہی کا "سرگ دواری"[ح۲] یا "سرگ دوار"[ح۳] نام رکھا تھا موسیو بیمز (M. BEAMES) نے تو یہ خیال تک ظاہر کر دیا ہے کہ ہندی (ہندوی) اصل میں سنسکرت سے پہلے موجود تھی۔ وہ تورانی الاصل ہے۔ آریاؤں نے اسے ایسا مٹایا کہ اس کے رہے سہے الفاظ (یعنی جو کچھ بچا کھچا باقی تھے وہ) بھی سنسکرت سے منسوب ہونے لگے۔ پروفیسر[ح۴] میکس مولر (MAX. MULLER) کو اس رائے سے اتفاق ہے یاد رہے کہ خود بڑے بڑے مسلمان محققین و مفسرین اور علمائے لسانیات نے ہندی کے وہ الفاظ گنا دئے ہیں جو قرآن مجید میں پائے جاتے ہیں مثلاً

ح۲ تاریخ فرشتہ، جلد اول، صفحہ ۱۳۹ - مطبوعہ ۱۲۸۱ھ - منتخب تنقیح الاخبار، صفحہ ۴۴، مطبوعہ ۱۲۶۶ھ، سلطان المطابع - بیل کی اورنٹیل ڈکشنری، صفحہ ۱۹۲ - ڈی لافوس کی تاریخ ہندوستان - صفحات ۷۹ و ۸۰ -

ح۳ رحلہ ابن بطوطہ، جلد دوم، صفحہ ۵۳، مطبوعہ مصر ۱۲۸۸ھ -

ح۴ گارساں دی تاسی کا سولھواں خطبہ، صفحہ ۵۴۵

٭ ٭ ٭

طوبیٰ، سُندُس، اِبلَعی وغیرہ[۵۴] ذوالکفل[۵۶] کی نسبت اگرچہ مفسرین میں اختلاف ہے، تاہم ان کی ایک جماعت دہاتما بدھ ہی کو ذوالکفل قرار دیتی ہے۔ اس لفظ کے اصلاً ہندی اور بحالت موجودہ معرّب ماننے پر دلائل و شواہد[۵۵] پیش کرتی ہے۔ ایسی ہی کیفیت "جودیؔ" کی بھی ہے[۵۷]۔ اس بحث کا بڑھانا مدنظر نہیں، ختم کرتا ہوں۔ نتیجۂ تحقیق و تفحص موقع مناسب پر تفصیلاً گزارش کروں گا۔ برہم چاری دھرم پال نے عالمانہ تجسّس و تلاش کے ساتھ عربی و عبرانی کے بعض متحدالمخارج والمعانی[۵۹] الفاظ و کلمات کی اصلیت کا سنسکرت سے پتہ چلایا ہے[۶۰]۔

بہر صورت ہر گوشہ سے صدا یہی آتی ہے کہ جب مسلمان فاتحانہ حیثیت

---

[۵۴] تفسیر دُرِ منثور از شیخ جلال الدین سیوطی۔ ابن جریر۔ شیفتہ صاحب کتاب برہان۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی، مؤلف سبحۃ المرجان، سروِ آزاد، صفحہ ۲۰۶۔ نیز ملاحظہ ہو برہم چاری دھرم پال کی تہذیب الاسلام (صفحات ۶ لغایۃ ۹، جلد اول) میں عربی و عبرانی کے بعض لغات کی سنسکرت سے سراغ جوئی۔ دیکھو "غصن البان" صفحہ ۷۰ طبع قسطنطنیہ

[۵۶] دیکھئے فرہنگ و حواشی۔ نوٹ ۱۴

[۵۵] شاہد کی جمع گواہان۔ [۵۷] دیکھئے فرہنگ و حواشی نوٹ ۱۵

[۵۹] ایک ہی مخرج اور ایک سے معنی والے [۶۰] تہذیب الاسلام، جلد اول صفحات ۶ لغایۃ ۹، جالندھر۔

سے ہندوستان میں داخل ہوئے تو اس وسیع کشور[۸۱] کے مختلف قطعات میں مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں، جو سنسکرت کے زوال یا خارج از استعمال ہو جانے پر پراکرت کی شاخوں سے نکلی تھیں۔ ہمارے صوبہ متحدہ میں جو اسلامی تہذیب و علم و فضل کا گہوارہ اور خاص مسلمانوں کا پایۂ[۸۲] تخت تھا بلکہ "پورب[۸۳]" کے تمام علاقوں میں، اسی ہندی کا زور شور تھا۔ قطب الدین ایبک کے زمانہ، سنہ ۶۰۱ھ (۱۲۰۴ء) سے لیکر سنہ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) تک سرکاری دفاتر فارسی زبان میں رہے۔ تمام خط و کتابت فارسی میں ہوتی تھی۔ دربار شاہی کی زبان فارسی تھی[سہ]۔ لیکن گھروں میں ہندی بھاکھا ہی بولی جاتی تھی[۸۴]۔ جو رفتہ رفتہ گھروں کی چاردیواری سے نکل کر منظر عام پر آگئی۔ رزم آزمائیاں کیں۔ بزم آرائیاں دیکھیں۔ اسکی حقیقت ہمارے ہم وطن ملک شیخ محمد جایسی[۸۵] اور ان کی دلکش مثنوی پدماوت[۸۶] سے پوچھیے، جو جہانگیری عہد کی ایک اچھی یادگار ہے[۸۷]۔ جو فصاحت

---

۸۱ ملک۔ کشور کاف کے زیر اور زبر دونوں سے درست ہے۔ ۸۲ دیکھیے فرہنگ و حواشی، نوٹ ۱۶۔ ۸۳ خطبات گارساں دتاسی، تیرھواں خطبہ صفحہ ۱۷۱، ۳۰۔ ۸۴ رسالہ الناظر، جلد ۱۶ نمبر ۹۲ صفحہ ۴۴۔

۸۵ ہندی شاعری، اعظم کریوی، صفحات ۸۰، ۹۰ و ۱۱۹۔

۸۶ دیکھیے فرہنگ و حواشی، نوٹ ۱۶۔ ۸۷ بیلس ڈکشنری، صفحہ ۱۶۸۔

سہ انتزاع خطاب بادشاہی اور انقلاب سنہ ۱۸۵۷ء تک ابو ظفر بہادر شاہ کا روزنامچہ یعنی سراج الاخبار فارسی میں نکلتا تھا۔

وبلاغت کے لحاظ سے داماین کے ہم پلّہ مانی جاتی ہے۔ اور جس کی بازاروں میں آج تک مانگ ہے۔[۸۸]

آپ کے اسی سلیم (سلطان سلیم) کے ذوقِ سلیم کی یہ یادگار بھی صفحاتِ روزگار پر باقی رہے گی کہ ہندو امرائے شاہی امیروں اور رئیسوں کو جو خطابات دربارِ شہنشاہی سے اُس وقت مرحمت ہوتے تھے، اکثر بھاشا ہی کے ہوتے تھے۔ بدتمیزی یا چھوٹرپن کو اس بارہ میں کم دخل ہوتا تھا مثلاً کہنا چاہتا ہوں کہ مشہور مردِ میدان انوپ رائے کو "انی رائے سنگھ دَلَن" خطاب عطا ہوا تھا۔ وہ "شیر افگن"[۸۹] نہیں بنایا گیا۔ جہانگیر اس کی توجیہ و توضیح خود کرتا ہے کہ "انی رائے" ہندی زبان میں مقدمۃ الجیش یعنی فوج کے پیش رَو سردار کو کہتے ہیں اور "سنگ دَلن" کے معنی ہیں شیر کا خون بہانے والا۔[۹۰] شہنشاہ اکبر کی محبوب حرم جس نے آگرہ میں ایک بڑا وسیع و خوش منظر باغ اپنی یادگار چھوڑا تھا "من بھاوتی بیگم" کہلاتی تھی۔ "دل پسند" نہیں۔[۹۱] دادا نے اگر سریر شہنشاہی

---

[۸۸] نظام الملک طوسی، دیباچہ، صفحہ ۸ ۔ آب حیات، صفحات ۲۰ و ۴۸۔

[۸۹] "انی کن" کے معنی سنسکرت میں فوج کے ہیں۔ اور رائے ایک خطاب ہے جس کا مفہوم "قیادت" یا "لیڈرشپ" ہے۔ یعنی رہبر۔ لاجہ انی رائے کے متعلق ملاحظہ ہو نوٹ ۱۸ فرہنگ و حواشی۔

[۹۰] ترجمہ تزک از راجرس و بیورج، صفحہ ۱۸۸، مطبوعہ سنہ ۱۹۰۹ء

[۹۱] بیل کی ڈکشنری، صفحہ ۱۶۹۔

کا نام "تخت طاؤس" رکھا تھا تو ایک سعادت مند پوتا "کنچن سُمیر" پر بیٹھنے ہی سے فخر و نازش کرتا تھا[۹۲]۔ آگرہ کے دو مورخ ایک منشی سیل چند (فارسی) دوسرے منشی قمر الدین لکھتے ہیں کہ دارالخلافت کے سرسبز و شاداب باغوں میں سے ایک کا نام "کام بھون" تھا[۹۳]۔

جودھ بائی، شاہ جہاں کی ماں کا لقب آج تک زبان زد خاص و عام ہے۔ دوشیزگی یعنی کنوارپن کا خطاب جگت گوسائیں اور بال مُنی اصلی نام بھی بخوبی شہرت رکھتا ہے[۹۴]۔ لیکن شاہی محلسرا میں کیا وہ کسی اور نام سے یاد کی جاتی تھی؟ شاید کوئی مورخ نہیں بتا سکتا!

امر سنگھ کی بیٹی، جگت سنگھ والی منوہر پورہ کی ہمشیر جب اورنگ زیب کی بہو اور چہیتے شاہزادہ کام بخش کی دُلہن بنکر آئی تو اپنے حُسن و جمال کی بدولت عُرفاً جمیلۃ النسا بیگم کہلانے لگی۔ مگر سرکاری طور پر اُس کا پُرانا نام کلیان کنور قائم رہا۔ بدلا نہیں گیا[۹۵]۔ شاہزادہ عظیم الشان کی بیگم، جس کے

---

[۹۲] "کنچن" "سونا" سُمیر، ہندوؤں کا اولمپس (OLYMPUS) پہاڑ۔ جہاندار شاہ کے تخت سلطنت کا یہ نام تھا۔ (منشی فیض بخش کی تاریخ فرح بخش، ترجمہ انگریزی از ڈاکٹر ہوئی، صفحہ ۲۱۷)۔ [۹۳] مرقع اکبر آباد، صفحہ ۲۰۷۔ از منشی سعید احمد [۹۴] بیل کی ڈکشنری، صفحہ ۱۳۵۔ امرائے ہنود، صفحہ ۹۴۔ تاریخ الہ آباد، جلد اول، صفحات ۸۱ و ۸۲۔ مؤلفہ مقبول۔ ادیاق مغول، صفحہ ۴۲۴۔ مرقع اکبر آباد، صفحہ ۱۸۹۔ [۹۵] ادیاق مغل، صفحہ ۵۵۲

بطن سے فرخ سیر تھا راؤ کیسری سنگھ کی دختر تھی - اس کا ہندوانہ نام بھی بدستور رہا - لیکن دخل در معقولات دینے والے مورخ اس کو بھی 'صاحبہ زمانی بیگم' لکھتے ہیں[۹۶] - ایک نہیں - ایسی صدہا مثالیں ہیں - منوچی کا بیان ہے کہ "بادشاہ (عالمگیر؟) بعض ایسے نام خود رکھتا تھا - بیگمات اور شہزادیوں کو کبھی کبھی اس قسم کے ناموں سے عزت دیتا تھا - مثلاً اودے پوری[۹۷] (بقول ٹاڈ خوشی سے بھری ہوئی) گیسر چتر وتی وغیرہ[۹۸] - منوچی نے غیر ضروری طوالت کے ساتھ متعدد طبقوں اور طبقے والیوں کے نام گنا دئے ہیں جو عالمگیر کے ذاتی خدم وحشم سے تعلق رکھتے تھے - دراصل یہ ان عورتوں کے نام نہ تھے بلکہ وہ خطاب تھے جو بادشاہ کی طرف سے ان کے (اعتراف خدمت) کمال فن اور جوہر شناسی کے صلہ میں عطا ہوئے تھے مثلاً زنانہ پہرہ داروں کے نام (۱) تول بائی بانو[۹۹] (۲) جنترائی بانو (۳) لعل بائی بانو (۴) ہیرا بائی بانو (۵) مانک بانو - گانے والیوں کے خطابات (۱) سندر بائی - (۲) چلبلا بائی (۳) مرگ نین (۴) لعل بائی (۵) ہیرا بائی (۶) منا بائی (۷) جالیا بائی (۸) مس بائی (۹) نین جوت بائی[۱۰۰]

---

[۹۶] ادبیاتِ مغل، صفحہ ۵۶۶ [۹۷] دیکھئے فرہنگ وحواشی، نوٹ ۱۹ - [۹۸] ہندوستان عہد مغلیہ میں، جلد سوم، صفحہ ۷ - [۹۹] ایضاً جلد سوم صفحہ ۹ - [۱۰۰] روشنی

(۱۰) مرگ بالا بائی (۱۱) چنچل بائی (۱۲) دھیان بائی (۱۳) گیان بائی (۱۴) ہار بائی (۱۵) آکاش بائی[۱۰۱] (۱۶) اسیرابائی (۱۷) نہال بائی (۱۸) گلال بائی (۱۹) کشوری بائی (۲۰) کیسر بائی[۱۰۲]

اسی طرح بادشاہ کے خاصہ کے گھوڑوں، خاص ہاتھیوں اور بعض توپوں اور ہتھیاروں کے نام بھی ایک بڑی تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ جن کے بارہ میں وہ خود کہتا ہے کہ ان میں سے بہت سے نام ہندوانہ وضع و ساخت کے ہیں۔[۱۰۳]

عالمگیر اپنے رقعات میں اپنی بعض جدّتوں کا ذکر کرتا ہے، ایسے ناموں کا بھی جو اس نے از خود یا کسی شاہزادہ کی درخواست پر تجویز کردئے تھے۔ جیسے آموں کے لئے (۱) سدھارس (۲) رسنابلاس[۱۰۴] گلشنِ رواں گھوڑے کے واسطے پھلواری (۲) چراخیدن[۱۰۵]۔ باغوں کے (۱) نور باڑی (۲) سرند باڑی[۱۰۶] ایسی متعصب اور ہندو کش اورنگ زیب

---

[۱۰۱] آسمانی [۱۰۲] زعفران [۱۰۳] ہندوستان عہد مغلیہ میں جلد سوم، صفحہ ۹۔ [۱۰۴] جلد سوم، صفحہ ۱۰۔ [۱۰۵] رقعہ ۹، کلمات طیبات، نول کشور، سنہ ۱۹۱۶ء بار دوازدہم۔ ڈاکٹر عبدالحق اپنی فاضلانہ تالیف "مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر" میں اس دوسرے نام کو "رسنا ولاس" لکھتے اور فرماتے ہیں کہ یہ دونوں نام بھی سنسکرت کے دو لفظ ہیں۔ (صفحہ ۸۲) بے شبہ یہ تحقیق صحیح ہے۔ [۱۰۶] رقعہ ۴۲، ایضاً

[۱۰۷] رقعہ ۱۱۷، ایضاً۔

عالمگیر کا ایک ظالمانہ کارنامہ یہ بھی ہے کہ اُس نے ساہو جی پسر سمبھاجی کو "ساہو" کا خطاب دیا تھا جس کے معنی ایماندار اور عزت کرنے والے کے ہیں[۱۰۸]- برعکس نہند نام زنگی کافور؟

شاہی محل اور امیروں کے گھروں میں جو کنیزیں خدمت کے لئے رکھی جاتی تھیں اُن کے نام نہایت دلکش رکھے جاتے تھے۔ اکثر نام پھولوں کے نام پر ہوتے تھے۔ مثلاً چنبیلی، رائے بیل، کیتکی، گلاب سیوتی، نرگس وغیرہ - زیادہ تر ہندو کنیزوں کے نام اس قسم کے ہوتے تھے - کام روپ، شیام روپ، چت لگن، تن سکھ، نین سکھ[۱۰۹]، رنگیلی، بعض نام ہندو مسلمانوں میں مشترک تھے اور عام سمجھے جاتے تھے

اسی سلسلہ میں پنڈت سری نراین چترویدی نے تحریر فرمایا ہے کہ ہندی کے شاعر مسلمان بادشاہوں کے دربار میں بھی رہتے تھے - اورنگ زیب کے دربار میں بھی ہندی کے شاعر تھے اور بادشاہ سے جاگیر اور انعام پاتے تھے[۱۱۰]

قصہ مختصر - دورِ جدید کے ایک نازک خیال مولف اور زباندان

حٰ۱۰۸ گرانٹ ڈف، صفحہ ۱۰۴ - ٹاڈ جلد دوم صفحہ ۷۴۱ - نز ٹ اول مطبوعہ ۱۹۲۰ء - بیل کی ڈکشنری صفحات ۲۳۱ و ۲۳۲ حٰ۱۰۹ روح تنقید صفحہ ۳۰۷ - حٰ۱۱۰ صفحہ ۲۹۶، تعارف تاریخ اردو صفحہ ۱۹۳۳ء -

خواجہ عشرت لکھنوی کی تحقیق یہ ہے کہ "برج بھاشا یعنی بھاکا جو کسی وقت میں عام زبان ہند تھی۔ اس میں بھی عربی فارسی الفاظ بہ کثرت شامل تھے[۱۱۱]۔ اسی سبب سے مقدس پنڈتوں نے اس زبان (بھاکا) کو ملیچھ[۱۱۲] کی زبان کا خلعت دیا تھا۔ کیونکہ ان کی زبان (تو) سنسکرت تھی"[۱۱۳]

یہی بھاشا تھی اور اس کی شاعری، جس نے فارسی کی شاعری پر بھی کم و بیش اپنا اثر ڈالا۔ مثنوی میں قصیدہ اور غزل کا پیوند اسی سے لے کر لگایا گیا۔[۱۱۴]

یہ فیصلہ یا نتیجہ قائم رہے گا کہ بھارت ورش کا بڑا حصہ اُس وقت صرف بھاشا بولتا اور جانتا تھا۔ مرد ہو یا عورت، اس کا امتیاز و انحصار نہ تھا۔[۱۱۵] رجواڑے کی بھاکھا پھر بھی الگ تھی۔[۱۱۶]

تاریخیں شاہد ہیں کہ سلطان سکندر لودی کے عہد (جلوس ۸۹۵ھ = ۱۴۸۹ء۔ وفات ۹۱۵ھ = ۱۵۱۰ء)[۱۱۷] سے فارسی کا پورا دور دورہ ہوا۔ یا

---

[۱۱۱] دیکھئے فرہنگ حواشی۔ نوٹ ۲۰ [۱۱۲] امرائے ہنود و دولت مغلیہ میں لکھا ہے کہ مدتوں ہندو مسلمانوں کی زبان کو ملیچھ بھاشا کہہ کر نفرت کرتے رہے۔ صفحہ ۳۶۔ آب حیات، صفحہ ۱۶ [۱۱۳] ہندو شعراء صفحہ ۵ [۱۱۴] مقدمہ قران السعدین، از مولوی محمد اسماعیل میرٹھی، صفحہ ۷۹ [۱۱۵] دیکھئے فرہنگ حواشی۔ نوٹ ۲۲ [۱۱۶] ٹاڈ کا راجستھان جلد دوم مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۴ء صفحہ ۳۷۸ [۱۱۷] صفحات ۱۷۶ تا ۱۸۸ تاریخ فرشتہ مقالہ دوم، نول کشوری۔

یوں کہیے کہ باضابطہ اجرا ہوا۔ پہلے تو کایستھوں نے پھر ہندوؤں کے
اَور اَور اونچے طبقوں نے بھی عربی، فارسی پڑھنا شروع کیا[118]۔ دفتروں
اور کچہریوں میں، سیاق و سباق میں، اس کا رواج بڑھتا گیا۔ غالباً
اسی بنیاد پر فاضل تاسی کا گمان ہے کہ ۸۹۴ھ (۱۴۸۸ء) تک عوام
میں فارسی نہیں پھیلی۔ رعایا و برایا کی زبان بدستور بھاشا رہی[119]۔
یہ بھی پیش نظر رہے کہ رانی مان بائی[120] کا بیاہ رچائے جانے (۹۹۳ھ/
۱۵۸۴ء) کے چار سوا چار سو برس بیشتر سے مسلمانوں کا عمل دخل
ہندوستان میں ہو چکا تھا[121]۔ کیونکہ معز الدین محمد سام معروف بہ
شہاب الدین غوری[122]۔

---

[118] ملاحظہ ہو فرہنگ و حواشی، نوٹ ۲۲، تاریخ فرشتہ، مقالہ دوم صفحہ ۱۸۷۔ تاریخ بادشاہان دہلی، موسومہ بہ تاریخ حبیب مطبوعہ ۱۲۷۳ھ صفحہ ۸، گلستان ہند، دفتر دوم، صفحہ ۱۱۰۔ بیل صاحب کی اورنٹیل ڈکشنری، صفحہ ۲۶۰۔ دربار اکبری، صفحہ ۹۴۵۔ آب حیات، صفحہ ۱۸۔ تاریخ الٰہ آباد، جلد اول صفحہ ۳۴۔

[119] خطبات گارساں دی تاسی، صفحہ ۹۴۔

[120] رانی مان بائی، شاہ بیگم خطاب، جہانگیر کی پہلی بی بی، سلطان خسرو کی والدہ جو الٰہ آباد میں پیوند خاک ہے۔ تاریخ الٰہ آباد جلد اول صفحات ۱۸ لغایت ۴۲)

[121] آئین اکبری جلد دوم صفحہ ۱۴۸، و جلد سوم صفحہ ۴۵۹۔ بیلس ڈکشنری صفحہ ۲۴۳، منتخب تنقیح الاخبار صفحہ ۴۳۔ تاریخ مبارک شاہی کلکتہ، صفحہ ۱۱۔

[122] ملاحظہ ہو فرہنگ و حواشی، نوٹ ۲۳۔

عمرہا گل رخت بربست و گشاد
خاکِ ما دیگر شہاب الدین نہ زاد — اقبال

کے زمانۂ فتح و تسلط (ابتدا از ۵۸۷ھ = ۱۱۹۱ء)[۱۲۳] ہی سے فارسی کا چرچا بلکہ عروج شروع ہونا سمجھا جاتا ہے۔[۱۲۴] ایسا تو نہیں ہے کہ پروفیسر علام نے یہ رائے قائم کرنے میں عجلت سے کام لیا ہے۔ شاید غور نہیں فرمایا کہ اکبر کے عہد میں تو شاہی دربار کی زبان تمام و کمال فارسی تھی، مسلمان ارکانِ دولت، اعیانِ مملکت کا ذکر نہیں، جن کی مادری بولی بدرجۂ فارسی تھی یا ہو گئی۔ اور ہونا ہی چاہیے تھی۔ بہت سے راجے مہاراجے، ہندو سردار اور سپہ سالار اس (فارسی) زبان میں اچھی خاصی استعداد و مہارت رکھتے تھے۔

پوری شیرینی، کامل حلاوت اور لذت اندوزی کے ساتھ اسی میں بات چیت کرتے تھے۔[۱۲۵] باہم کبھی چشمک یا کھٹ پٹ ہو جاتی تو لامحالہ ورنہ خوش طبعی ہی سے دربارِ ملوکی میں یا محفل و مجلسِ احباب بے تکلف

---

[۱۲۳] سیر المتاخرین صفحہ ۱۰۴۔ [۱۲۴] خطباتِ گارساں دتاسی، صفحہ ۹۴۔ مسلمان تاجدارانِ ہند، جلد اول، صفحہ ۳۷۔ [۱۲۵] جیسے کہ مان سنگھ اور شاہ دولت (دربارِ اکبری، صفحہ ۴۶۵)، مان سنگھ اور خانِ خاناں (صفحہ مذکور)۔ اس کے بعد چودھرانی اور نورجہاں (بیربل نامہ، صفحہ ۴۲، مطبوعہ [illegible] پرنٹنگ ورکس)۔ قصصِ ہند، حصہ دوم، صفحہ ۱۱۱ - تاریخ الٰہ آباد، جلد اول، صفحہ ۱۰۹)۔ امیر خاں اور برہان الملک (قصصِ ہند، حصہ دوم، صفحات ۱۷۹ و ۱۸۰)۔ نیز دیکھیے نوٹ ۳۴ - فرہنگ و حواشی۔

میں موقع و محل سے ایک دوسرے پر چوٹیں کرتے رہتے[126] اور تواور ہفت ہزاری اعتضادالملک مان سنگھ[127] جے سنگھ[128] وغیرہ بڑے بڑے راجپوت سپہ سالار اپنے ہستوں اور لشکروں (افواج سلطانی) کی کمانڈ (کمان) فارسی میں کرتے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے بہادر سینا پتی جے سنگھ کچھواہہ مرزا راجہ کو ہندی اور فارسی زبانوں پر اُسی قدر قدرت حاصل تھی جتنا اقتدار و قوت وہ شاہنشاہی فوجوں پر اور قابو رکھتا تھا[129] وہ عربی اور ترکی بھی خوب سمجھتا اور بقدر ضرورت بول لیتا تھا۔ جے سنگھ کی وقعت و عظمت کو جوہر شناس اورنگ زیب سے پوچھئے اور اُس کے طرزِ تخاطب کو یاد کیجئے "سلامت باشید راجہ جی! سلامت باشید بابا جی"[130]

---

[126] دفتر اول ابوالفضل صفحہ ۱۵۰ مطبوعہ مصطفائی ۱۲۹۱ھ طبقات اکبری صفحہ ۳۸۲۔ دربار اکبری صفحہ ۵۶۰۔ ڈنمن صاحب کی آگرہ ہینڈ بک صفحہ ۱۲۹ نوٹ، مان چرتر قلمی [127] بیل کی بیاگرفی کل ڈکشنری صفحہ ۹۳۔ پنج ہزاری مقالات شبلی، جلد اول، صفحہ ۲۲۶۔ مختصر تاریخ راجپوتانہ از مولوی عبد الرحمن کلیانی، صفحات ۴۷، ۴۸ [128] آب حیات صفحہ ۱۹ [129] رشحات الفنون قلمی، اوراق ۲۳۹ و ۲۴۰۔ قصص ہند حصہ دوم، صفحہ ۱۴۸ جنگ نامہ نصرت خان عالی، صفحہ ۳۸، انتخاب مطبوعہ الہ آباد۔ سیاحت نامہ ٹیورنیر مطبوعہ آگرہ، ۱۸۹۶ء صفحہ ۱۵۔ بیل کی ڈکشنری صفحہ ۱۲۹۔

[130] سلطنت مغلیہ کے اجزائے پریشاں، از اورمی، مطبوعہ ۱۷۸۲ء ORMES HISTORICAL FRAGMENTS OF THE MUGHAL EMPIRE IN INDOSTAN.

جس پر پروفیسر چونک پڑتا ہے۔[۱۳۱] اوراق تاریخ میں تلاش کیجیے۔
عالمگیر نے کابل کو فتح کرنے کے لئے ہفت ہزاری مہاراجہ جسونت
سنگھ والی مارواڑ کو بالتخصیص کیوں مامور کیا تھا؟ محض اس وجہ سے
ترجیح دی تھی کہ وہ فارسی اور پشتو خوب جانتا تھا۔ وہ افغانوں کے ملک
کو گیا اور اس مہم کو سر کیا۔[۱۳۲] اسی (بعد کو بغاوت کرنے والے) جسونت
سنگھ کی نسبت پروفیسر نجیب اشرف ندوی مقدمۂ رقعات عالمگیر
میں لکھتے ہیں کہ اپنی متعصبانہ کارروائیوں کی وجہ سے غیر فانی شہرت
حاصل کر چکا ہے۔[۱۳۳] شاہ عالم کا بارہ ہزار سواروں کا جرنیل بھاؤ سنگھ تھا۔
جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ہندو اور ہندو نژاد تھا۔ اورنگ زیب نے اسکو
شاہ عالم کے زیر فرمان مستقل مامور کر دیا تھا۔[xx]

جے سنگھ کا ایک پیش رو، اکبر کا وزیر جنگ، امیر فوج، مرزا عبدالرحیم
خان خاناں عربی، فارسی، ترکی کے سوا ہندی اچھی جانتا تھا۔ وہ ہندی کا
مقبول و مشہور شاعر مانا گیا ہے۔[۱۳۴] عالمگیر کا دوسرا مور جرنل راؤ راج سنگھ

---

۱۳۱ سیاحت نامہ جلد اول صفحہ ۱۳۶ ۔ ۱۳۲ ٹاڈ کا راجستھان مطبوعہ ۱۸۹۴ء
جلد اول صفحہ انگریزی ۱۶۹ ۔ ۱۳۳ صفحہ ۳۴۶ ۔ xx منوچی جلد سوم صفحہ ۷۸۔
۱۳۴ دربار اکبری صفحہ ۲۳۰ ۔ ید بیضا آزاد بلگرامی، قلمی، ورق ۴۲، ہندی
شاعری، صفحات ۷۸، ۱۷۴، ۱۷۵ ۔ نیز دیکھیے فرہنگ و حواشی نوٹ ۲۵۔

[۱۳۵] تا ٹھور جب فتح دکن کے لئے بھیجا گیا ہے تو ماتحت افواج سے کس زبان میں بات چیت کرتا تھا؟ فارسی میں! موتمن الدولہ عمدۃ الملک راجہ ٹوڈرمل[۱۳۶] نے حسابات کے پنچ میل دفتر کو فارسی میں منتقل کیا[۱۳۷] جو درہم و برہم سا رہتا تھا۔ ہندو محاسب ہندی کاغذوں سے کام چلاتے تھے۔ ولایتی اہل کار فارسی میں رکھتے تھے۔ اس نے بے ترتیبی مٹائی۔ یکسانی پیدا کی۔ وہ دفتر کی فارسی تحریروں کو خود پڑھتا اور اُن پر اعتراض یا حکم خود لکھتا تھا[۱۳۸]۔ پرنسپل بلاک مین (H. BLOCHMANN) کا یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے جو آئین اکبری کے ترجمۂ انگریزی میں حوالۂ قلم فرمایا ہے کہ "ٹوڈرمل کے طریقِ عمل یعنی سررشتۂ حسابات اور سیاق و سباق[۱۳۹] کو فارسی جامہ پہنا دینے سے عظیم فوائد و نتائج مترتب ہوئے۔ یوں کہئے کہ اُس نے اپنے ہم وطنوں، ہم مذہبوں کو مجبور کیا تھا کہ حکمراں قوم کی (درباری) بولی سیکھیں۔ اس کی صورت و ضرورت بالکل ایسی ہی سمجھنی چاہیے

---

[۱۳۵] بیل کی ڈکشنری، صفحہ ۲۲۳ [۱۳۶] دیکھئے نوٹ نمبر ۲۶ فرہنگ و حواشی
[۱۳۷] دیکھئے فرہنگ و حواشی نوٹ ۲۷ [۱۳۸] دربار اکبری صفحہ ۵۲۸۔ الناظر، جلد ۱۲ نمبر ۲، صفحہ ۵۰۔ تاریخ راجستھان از پرمانند صفحہ ۲۴۳۔ [۱۳۹] سِیاق۔ علم حساب، حساب لکھنے کے قواعد۔ سِباق۔ دوڑ میں بڑھ جانا۔

جیسی آج کل ہندوستان کی عدالتوں میں انگریزی زبان کی ہورہی ہے۔ اس لیے فارسی کا مطالعہ اور اس میں استعداد حاصل کرنا بڑے مالی منافع اور سود و بہبود کا ذریعہ ثابت ہوا۔"[۱۴۰] ٹوڈرمل کے اس حکم کا مآل و اثر کیا ہوا؟ اس کو بھی بلاک مین صاحب نے دو فقروں یا دو ٹکڑوں میں سمجھا دیا ہے۔" ایک۔ اٹھارویں صدی کے اختتام سے پہلے ہی ہندو مسلمانوں کے استاد فارسی میں ہو چکے تھے۔ دوسرے۔ ایک نئی بولی بالائی ہند میں پیدا ہو گئی تھی یعنی اردو۔ جو ہندوؤں کے اشتراکِ عمل اور قبول و اعانت کے بغیر عالم ہستی میں قدم نہیں جما سکتی تھی۔"[۱۴۱] مان سنگھ اگر سلطنتِ مغلیہ کا دست و بازو تھا، تو ٹوڈرمل ایک ستونِ آہنین ثابت ہوا۔ ذی فہم و ہوش مند مورخین ان دونوں کی جتنی تعریف کریں زیبا ہے۔ اس کی ضرورت نہ حقیقت کو سمجھ لینا کچھ دشوار نہیں عالم آشکارا ہے۔ بھائی پرمانند نے بالکل یہی رائے تاریخ راجستھان میں ظاہر کی ہے۔ وہ بھی ٹوڈرمل کے اس فعل کو ہندوؤں کو نفع پہنچانے والی فائدہ اور سرکاری نوکریاں دلانے پر محمول و منسوب کرتے ہیں۔

---

[۱۴۰] جلد اول، صفحہ ۳۵۲، مطبوعہ ۱۸۷۳ء۔ نیز دیکھیے فرہنگ حواشی نوٹ ۲۸۔ [۱۴۱] ایضاً، صفحہ ۳۵۲۔

اُن کو تسلیم ہے کہ دراصل اسی عمل نے موجودہ اُردو زبان کی بنیاد ڈالی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے بھی مسلمان بادشاہوں کے وقت میں تمام سرکاری حساب ہندی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ اس ہمدرد قوم پیچھ نواز کو شکایت ہے کہ ٹوڈرمل نے اپنے اس فعل سے ہندؤں کی قومیت کو سخت نقصان پہنچایا۔ اسی نے ہندؤں کو مجبور کیا کہ فارسی زبان کا مطالعہ کریں۔

بلاک مین صاحب کے مذکورۂ بالا امرادلی کے متعلق مجھے یہ اضافہ کرنا ہے کہ فارسی میں ہندؤں کی تالیف و تصنیف کا ذخیرہ بے شمار ہے۔ کسی خاص فن یا شعبۂ علم پر اس کا انحصار نہیں۔ دینیات کو چھوڑ کر لُغت، انشا، فلسفۂ اخلاق، حکمت طب و معالجۂ انسانی، تذکرہ و تاریخ اور تصوف، کون سی شاخ ہے، جس میں انھوں نے نظم و نثر میں جھنڈے نہیں گاڑ دیے تھے معتدبہ ادبی و علمی سرمایہ فراہم نہیں کردیا تھا۔ منشی ٹیک چند بہار، پنڈت چندربھان برہمن، رائے رایان انند رام مخلص، منشی مادھو رام وغیرہ بیسیوں اہلِ کمال و فضل کے نام اس سلسلہ میں ہمیشہ روشن اور اہلِ علم و صاحبانِ بصیرت کی زبان پر رہیں گے۔

مجھ نامہ سیاہ نے ہمیشہ دیکھا اور ان نیک خصلت، نیک نہاد، نیک دل بزرگوں کی وضع احتیاط و ادب کی قدر کی ہے۔ یہ حضرات جب اپنی مادری زبان میں لکھنے بیٹھتے ہیں تو اُس کا سرِ آغاز "سری گنیش ایمنہ" سے ہوتا ہے۔ فارسی میں تحریر کرنا مد نظر ہوتا ہے تو "بسم اللہ الرحمن الرحیم" سے شروع فرماتے ہیں۔ پھر خدائے پاک کی حمد اور رسولِ عربی صلعم کی نعت اِن روشن دلوں کے قلم کی نوک پر ہوتی ہے۔ اردو لکھتے وقت "سری گنیش" اور "اللہ جل شانہ" دونوں یک لخت یاد آتے ہیں۔ حسب ضرورت۔ کبھی وہ کبھی یہ۔

اِسی سلسلہ میں، اِسی عہد اکبری سے کالیستھوں کا ذکر ایک ممتاز فرقہ کی حیثیت سے شروع ہو جاتا ہے۔ مسلمان مورخ ان کو احترام سے یاد کرتے ہیں۔ کلہن[۱۴۲] کی راج ترنگنی میں[۱۴۳] بھی کالیستھ کا لفظ بار بار آیا ہے۔ لیکن سر اوریل اسٹائین (SIR. M AUREL STEIN)[۱۴۴] کے نزدیک اس سے سردار بالخصوص برہمن مراد ہیں۔[۱۴۵]

---

[۱۴۲] ملاحظہ ہو مقالہ نمبر ۲۹، فرہنگ و حواشی [۱۴۳] ملاحظہ ہو میرا مقالہ تاریخ ہائے کشمیر پر صفحات ۹ تا ۱۲ لغایت ۱۲۱ مندرجہ رسالہ معارف نمبر ۲ جلد ۴۹ ماہ فروری ۱۹۴۲ء [۱۴۴] سر مارک اوریل اسٹائین نے اکتوبر ۱۹۴۳ء میں بمقام کابل انتقال کیا۔ ہمارے زمانہ کے بڑے جہاں گرد و جہاں گشت سیاح اور صاحب تصانیف تھے۔ ان کا انتساب کشمیر کے ساتھ ہوتا ہے [۱۴۵] رسالہ ادب، دسمبر ۱۹۳۱ء صفحہ ۴۴۔

رجوع - میں اس سے بے خبر نہیں ہوں کہ اسی اکبر کے عہد میں برہمنوں کے طفیل اردو میں سنسکرت کے الفاظ روشناس کئے گئے تھے۔ لیکن یہ طریقہ بعد کو ترک ہوگیا۔ زیادہ دن نہیں چلا[۱۴۶]۔ سنسکرت کی عظمت کم و بیش اسو وقت تک قائم تھی۔ وہ پہلے سے ہندو والیانِ ملک کی درباری زبان چلی آتی تھی اور "دیوبانی" یا "زبان الٰہی" مانی جاتی تھی۔

اس سے بیشتر کا کچھ زمانہ البتہ فارسی کے لئے ناساز گار رہا تھا۔ سوریوں کو فارسی سے سخت دشمنی تھی۔ چنانچہ شیر شاہی عہد کے پٹھانوں کے ذکر میں آخوند درویزہ اپنے مرشد سید علی ترمذی کے یہ الفاظ نقل کرتے ہیں " بحکم آنکہ جہل و ضعنی بر افغانان غالب است تا ہر کہ بزبانِ فارسی نطق و تکلم کند اورا دشمن می گیرند[۱۴۷]۔"

جیساکہ پروفیسر محمود خانِ شیرانی فرماتے ہیں " پٹھانوں (سوریوں) کے عہد میں مذہب و تصوف اور شاعری کا سب سے زیادہ چرچا تھا۔ دیسی زبانوں کی طرف عام توجہ ہوگئی تھی۔ برج، اودھی اور قنوجی کے بعض مشہور شاعر اسی مذہب میں پیدا ہوئے۔ دنیا مذہب و تصوف

---

[۱۴۶] پنجاب میں اردو "مقدمہ" صفحہ ک۔ [۱۴۷] ایضاً، صفحہ ۲۰۶

کے پیچھے دیوانی ہو رہی تھی۔ ہر قسم کے شتیا[۱۴۸] دستانی و طبّاعی[۱۴۹] سے کامیاب ہو جاتے تھے۔ طبیبوں نے طب یونانی کو ہندوستانی فضا کے مطابق ڈھالا۔ اسماء کو مطابقت دی[۱۵۰] ایسی حالت میں غلا رہی کی کیا قدر رہتی۔ میں عرض کروں گا کہ خود ان (افاغنہ) کی ملکی زبان پشتو کو دیکھئے۔ اس میں ذرّہ برابر عبرانی یا کنعانی کا نشان نہیں ملتا، اگرچہ مورخین و محققین کے ایک طبقہ کو تسلیم ہے کہ افاغنہ نسلاً یہودی ہیں۔ البتہ ان کی زبان (پشتو) ژند اور سنسکرت سے ملتی جلتی بتائی جاتی ہے۔[۱۵۱]

سلطان ابراہیم حسین بن اسکندر لودی کا ایک فرمان نوشتہ ۹۲۷ھ (۱۵۲۱ء) میں نے دیکھا ہے۔ سوریوں کے عہد کے تو کئی فرمان نظر سے گزرے ہیں۔ کہہ سکتا ہوں کہ یہ فرمان بالکل لودیوں کے فرامین کے طرز پر بلا کسی تکلف و اہتمام کے لکھے جاتے تھے۔ اوپر کے حصہ میں سادہ فارسی عبارت، فارسی کا لیقرء[۱۵۲] خط میں رواں قلم سے ہوتی تھی، نیچے کی طرف وہی عبارت مگر بہ حرف ناگری۔ فارسی

---

۱۴۸ مکار۔ فریب دینے والا۔ ۱۴۹ تیز زبان ۱۵۰ پنجاب میں اردو، صفحہ ۲۰۶ ۱۵۱ ٹاڈ صاحب کا راجستھان، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۴ء صفحہ ۲۲۰ ۱۵۲ جو پڑھ لیا جائے

اور ناگری کی یہی ملی جلی لکھائی فیروز شاہ باقی خاندانِ افغانان کے سکّوں پر بھی پائی جاتی ہے۔ یہ مسئلہ میرے مبحث سے زیادہ تعلق نہیں رکھتا لہذا مزید تفصیل و تحریر سے گریز کرتا ہوں۔ اس قدر روشن ہی ہے کہ بولنا ہو یا سننا، پڑھنا ہو یا لکھنا ہر صورت میں فارسی کی شہنشاہی کے ساتھ ساتھ بھاکھا اور ہندی کا رواج اور دور دورہ قائم تھا۔

جیساکہ عرض کرچکا ہوں شاہانِ مغلیہ کے عہد میں اُن کی سرکاری و درباری مراسلت کی زبان فارسی تھی۔ یہی نیم سرکاری۔ کرنیل ٹاڈ نے اودے پور کے راناکی ماں (کوئین مدر) کے نام اورنگ زیب عالمگیر کے دو خط تعلیم خاص دیکھے تھے۔ وہ اتعات کی نزاکت کا احساس اور رانی کی بڑائی اور حرمت و منزلت کا لحاظ و پاس کرتے ہوئے "ڈیر اینڈ ورچواس سسٹر" (پیاری نیک نہاد بہن) کر کے تخاطب کیا تھا۔[۱۵۳] کاش موصوف فارسی کے القاب و آداب بھی لکھ دیتے تو ہم تشنگان علم و تحقیق پر بڑا احسان ہوتا۔ لیکن اس سے انکار بھی نہیں کرسکتا کہ انگریزی کتاب میں یہ ٹکڑا کچھ اکھل بیکھ جوڑ سا ہوتا گول خانہ میں چوکھونٹی چیز براہ راست کسی بیگانہ صورت کو مخاطب

---

۱۵۳ راجستھان، انگریزی مطبوعہ مدراس ۱۸۷۳ء صفحہ ۲۹۲۔

کرنے کی شاید یہ پہلی مثال ہے۔ اور عالمگیر ایسے متشرع[۱۵۴]، خشک مزاج، ضابطہ شناس کے قلم سے تو یقیناً پہلی ہی ہوگی۔ قیاس چاہتا ہے کہ عالمگیر نے اپنی منہ بولی بہن کا نام تو نہ لیا ہوگا۔ بہن تو بہن ہے، کسی وقت راجپوتوں میں اپنی بی بی کا نام لے لینا بھی معیوب و ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا۔[۱۵۵] ہر چھوٹا بڑا اس کا پابند تھا۔ بادشاہ تو غیر ذات غیر کفو[۱۵۶] تھا۔ کرنیل صاحب نیز دیگر مورخین اس بارہ میں خاموش ہیں کہ رانی کرناوتی نے ہمایوں کے پاس جب راکھی بھیجی اور دستگیری کی خواہش کی تھی، جب یہ ہمایوں بنگالہ کی مہم اور فتوحات چھوڑ کر جوانمردی کے ساتھ چتوڑ کو بچانے کے لئے پہنچا تھا تو رانی نے اپنے راکھی بند بیرن (قوت بازو) کو کس زبان میں اور کیا کہہ کر پکارا یا بلایا تھا۔ میں نے ان دونوں تحریروں کا یہاں ذکر کردینا ضروری سمجھا اس لئے کہ ان دونوں میں ایک نہ ایک فریق (کاتبہ یا مکتوب الیہا) ایک راجپوتنی رئیسہ ضرور تھی۔ مجھے معلوم ہے اور مشہور عام بھی ہے کہ راماین اور

---

[۱۵۴] شریعت، یعنی دین محمدی میں بندوں کی عبادات اور معاملات کے لئے خدا کی طرف سے جو راہ پیدا کردی گئی ہے، اُس پر چلنے والا۔

[۱۵۵] ٹاڈ کا راجستھان، مطبوعہ ۱۸۷۳ء مدراس، جلد اول، صفحہ ۳۴۲، نوٹ۔

[۱۵۶] ہم جنس، ہم نسب، مانند، برابر کا۔ [۱۵۷] ایضاً، صفحہ ۲۶۳

مہابھارت میں عورت خاوند کا واحد نام لے کر بلاتی ہے۔ کنبہ میں اپنے رشتہ داروں اور دوستوں سے کوئی شرم نہ تھی۔ آزادی سے بات چیت کی جاتی تھی۔ ۔ ۔ ۔ عورتیں بڑے شوق سے باغوں میں ہوا خوری اور کھیل کے لئے جایا کرتی تھیں[۱۵۸]۔

فارسی کا اثر و رسوخ تقریباً چھ سو برس تک قائم و برقرار رہا۔ اس کی عظمت و قدر نہ صرف سلطنتِ اسلامی میں ہوئی بلکہ سکھوں[۱۵۹] نے بھی اپنا دفتر فارسی میں رکھا تھا۔ اُن کے رہبرِ اعظم گورو گوبند سنگھ کے خطوط فارسی میں ہوتے تھے۔ اُن کا گرنتھ بھی فارسی میں ہے جس میں خود اُن کا اور اُن کے متقدمین[۱۶۰] و منتسبین[۱۶۱] مثلاً بابا فرید، بھگت کبیر وغیرہ کا کلام درج ہے۔ اسی گرنتھ کو لیجئے۔ فارسی اور ہندی کے اختلاط[۱۶۲] کی کیسی اچھی مثال ہے[۱۶۳]۔

کپتان ولیم ہاکنز WILLIAM HAWKINS جو جہانگیر کے دربار میں عرصہ تک رہا ہے اور جس نے اپنی بعض تحریروں میں جہانگیر اور عہدِ جہانگیر کی پوری تصویر کھینچی ہے، لکھتا ہے کہ دربار کی زبان فارسی تھی۔

---

۱۵۸ تاریخ پنجاب، بھائی پرمانند، صفحہ ۱۲۰ ۔ ۱۵۹ سنہ ۱۷۰۸ء میں ایک پٹھان سپاہی کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ ۱۶۰ پیشتر ہو جانے والے، پہلے لوگ ۱۶۱ نسبت رکھنے والے، تعلق والے۔

۱۶۲ خلط ملط۔ آمیزش۔ ۱۶۳ زبان اردو کی تاریخ از الف دین نفیس، الناظر لکھنؤ نمبر ۹۲ جلد ۲۲، سنہ ۱۹۱۶ء

سب لوگ ہندوستانی بولتے تھے۔ لیکن جہانگیر ترکی زبان بھی سمجھتا تھا اور اکثر ترکی زبان میں اُس سے باتیں کرتا تھا[۱۶۴]۔

تزکِ جہانگیری میں تحریر ہے کہ اکبر وغیرہ کے عہد میں اکثر بلکہ تمام مدات اور صیغوں کے نام بھی ترکی ہی تھے[۱۶۵]۔

آج سے ایک صدی پیشتر حکومت انگریزی کی بدولت فارسی پر زوال آیا۔ حتےٰ کہ یہ زبان رفتہ رفتہ اُنیسویں صدی کے ثلث اول میں بالکل اُٹھا دی گئی[۱۶۶]۔ میرے وطن کی پرانی تاریخ "تواریخ ضلع فرخ آباد" نام "فتح گڑھ نامہ" عرف میں رائے کالی رائے ڈپٹی کلکٹر ارقام فرماتے ہیں کہ ۱۶ اگست سنہ ۱۸۳۶ء کو کلکٹری سے فارسی عبارت کی تحریر موقوف ہوئی۔ اُس کی جگہ زبان ہندی اُردو شروع ہوئی۔ ۲ مئی ۱۸۳۹ء کو دیوانی سے بند ہوئی۔ اس کی بجائے ہندی زبان رائج کی گئی[۱۶۷]۔ لالہ درگاہی لال وکیل اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ "زبان خاص ہندوستان کی ہندی ہے [عملداری اسلام سے زبان

---

۱۶۴ تاریخ راجستھان، صفحہ ۳۷۹ ۱۶۵ ترجمہ راس بیورتج مطبوعہ سنہ ۱۹۰۹ء صفحہ ۳۵ ۱۶۶ یہ نتیجہ تھا آنریبل (بعد کو) لارڈ بی میکالے کی تحقیقات و تحریرات اور اخیر یادداشت کا جو دیسیوں کی تعلیم پر ۲ فروری سنہ ۱۸۳۵ء کو ختم کی تھی۔

۱۶۷ صفحہ ۲۰۲، مطبوعہ سنہ ۱۸۷۳ء۔

فارسی ہوئی ۱۸۳۷ء سے زبان اردو ہی[۱۶۵] میرے ہم زبان دوست سُن
لیں کہ یہ دونوں کتابیں صحیح و فصیح اردو میں ہیں اور یہ دونوں مورخ ہند
(ایلیٹ) ڈیش اگروال تھے۔ جو سو برس پہلے کی رائج ملکی اور عدالتی زبان
کو "ہندی" سے تعبیر فرماتے ہیں۔ رہا دفاتر سے فارسی کا اخراج۔ یہ تو
نومبر ۱۸۳۷ء کے اُس ریگولیشن سے ہوا جس میں گورنر جنرل باجلاس
کونسل کو تبادلۂ زبان کا اختیار دیا گیا تھا۔ ۱۸۳۹ء میں صدر دیوانی
عدالت نے بھی اپنے ماتحت افسروں کو اُردو کے استعمال کی ہدایت
فرمائی اور سرکلر جاری کردیا۔ عنان گیرانِ حکومت کے بدل جانے کے
بعد ۱۸۵۹ء میں ایک قدم اور بڑھایا گیا۔ ریاست ہائے ہند کے ساتھ
جو مراسلت گورنر جنرل فارسی میں کرتے تھے وہ بھی اُردو میں ہونے لگی،
پھر انگریزی میں کردی گئی۔

یہی اُردو، موجودہ اردو یا ہندوستانی وہ زبان ہے جو بھاشا اور
فارسی کے ساتھ ساتھ ترقی کر رہی تھی بلکہ اچھا خاصا فروغ پاچکی تھی مسٹر
کین (KEANE) لکھتے ہیں کہ "اردو یا ہندوستانی زبان کی نہ
صرف بنیاد ہمایوں اور شیر شاہ کے زمانہ میں پڑگئی تھی بلکہ خوب رواج

---

۱۶۵ تاریخ ضلع کان پور، صفحہ ۷۵، مطبوعہ ۱۸۶۹ء

ہو چکا تھا۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ یہ بھی ثابت ہے کہ سب سے پہلی تصنیف یا تحریر جو اس مخلوط زبان میں معرضِ وجود میں آئی وہ جو پور میں اُسی زمانہ میں ہوئی تھی۔[169] اسی کی نسبت مسٹر لین پول (STANLEY LANE-POOLE) اپنی "تاریخ قرونِ وسطیٰ کا ہندوستان زیر حکومت مسلمانان" میں تحریر فرماتے ہیں کہ اُردو کی بنیاد ٹوڈرمل کی توجہ سے پڑی۔[170] ایک دوسرے موقع پر اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے "اور اگرچہ دربار کی زبان فارسی تھی مگر ہر شخص ہندوستانی بولتا تھا۔ ان کی سند[171] ولیم ہاکنس CAPTAIN WILLIAM HAWKINS کی تحریرات ہیں۔ جو ۱۶۰۸ء سے ۱۶۱۳ء تک اس ملک میں رہا تھا۔ "تاریخ کی زبان اس بات کے بتانے سے قاصر ہے کہ شاہی محل سراؤں اور زنان خانوں میں یہ تیسری مخلوط زبان کہاں تک دخل و رسائی حاصل کر سکی تھی۔ وہ اس کا فیصلہ قیاس پر چھوڑتی ہے۔ قیاس کا فتوےٰ یہ صادر ہوتا ہے کہ اُردو کا جنم بھوم تو یہی شاہی رنواس تھے۔ انھیں کی ضرورتوں سے اس جدید کشترکی زبان کی بنیاد پڑی تھی۔ اس نے یہیں نشو و نما پایا تھا۔

---

[169] آگرہ کی ہینڈ بک بحوالہ تاریخ الفنسٹن، جلد ہشتم، صفحہ ۱۰۱ - [170] MEDIAEVAL INDIA UNDER MOHAMMADAN RULE صفحہ ۲۹۶

[171] ایضاً، صفحہ ۳۰۰

ہیں پھولی پھلی تھی۔

ہندی بھاکا[۱] زبان کی خوبیاں بیان کرنے کا یہ وقت نہیں مگر آئندہ شاید اتنا موقع بھی نہ ملے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی[۲] ایک بڑے باکمال ماہر السنہ سخنور، مصنف و مورخ گزرے ہیں۔ جنھوں نے عربی، فارسی اور ہندی شعرا کے متعدد مبسوط تذکرے لکھے ہیں۔ جا بجا اپنی تحریرات و مقالات میں مختلف زبانوں کی خوبیوں اور خصوصیتوں[۳] کا بھی تفصیلاً ذکر فرمایا ہے۔ ایک ہندی نگار مسلمان شاعر مرزا ضمیر[۴] بھی "تخلص (یعنی عشق) کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ "عربی میں مذکر کے لیے علیحدہ صیغے ہیں مونث کے لیے جدا۔ فارسی میں دونوں کے واسطے ایک ہی ہے۔ لیکن ہندی سنسکرت (؟) زبان کے واضع نے کمال کیا ہے۔ طرفہ تفصیل کر دی ہے کہ جہاں مذکر و مونث کے لئے الگ الگ صیغے قرار دیدیے ہیں، خنثے (نیوٹر) کے لئے بھی ایک تیسرا صیغہ وضع فرمادیا ہے۔ یہ بھی قدرت الٰہی کے عجائب میں سے ہے کہ ہندی بھاکا کی نثر اچھی نہیں ہوتی۔

---

[۱] اردو میں فصحا کے کلام میں بھاکا پایا جاتا ہے۔ زاہد شاگرد امیر۔ واقفت نہیں کوئی مرے انداز بیاں سے ہر شخص یہاں بولتا ہے اپنی ہی بھاکا (مکاتیب امیر مینائی صفحہ ۴۲) نیز حاشیہ ۵۶۔ ———

[۲] وفات سنہ ۱۲۰۰ھ (۱۷۸۶ء) مدفن روضہ، سرزمین دکن۔

[۳] متوفی سنہ ۱۰۷۷ھ (۱۶۶۶ء) مدفن سورت۔ علم موسیقی و رقص کے کامل استاد تھے۔ ہندی میں عشق کو کہتے ہیں (رسالہ الناظر اگست سنہ ۱۹۳۰ء، صفحہ ۱۰۲۔ بحوالہ ہمیشہ بہار اخلاص شاہجہاں آبادی) مرزا موصوف ضمیر تخلص کرتے تھا۔ عالمگیر کی فتح، شجاع کی شکست، مقابلہ

جس طرح عربی و فارسی میں پوری رنگینی کے ساتھ نثر لکھی جاتی ہے، ہندی میں وہ لوچ اور شوخی پیدا نہیں ہو سکتی۔ کیا کیا جائے۔ اس زبان کا طور و طریق ہی ایسا واقع ہوا ہے۔[۱۷۵]

باز آمد۔ کہنے کی بات زبان پر آئے بغیر نہیں رکتی۔ یہ فرمان پزیر رانیاں، شایستہ کماریاں، جہاں حسن و جمال، خوبی و محبوبی کی پتلیاں ہوتی تھیں، وفاکوشی و وفا کیشی، غیرت مندی و انجام اندیشی میں بھی فرد ہوتی تھیں۔ زیرکی و فراست، زود فہمی و نکتہ رسی، ادا شناسی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں[۱۷۶] پروفیسر کرپال سنگھ بیدار نے کیا خوب فرمایا ہے۔

بتانِ ہند بھی، ہیں کس قدر کافر ادا یارب!
زباں سے رام کہتے ہیں نظر سے رام کرتے ہیں

ظفر خانِ "احسن" گورنر کشمیر نے اسی مضمون کو تین سو برس ہوئے ان الفاظ میں ادا کیا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

کچھوہ کی تاریخ عین لڑائی کے موقع پر کہی تھی۔ ایک ہزار انعام ملا تھا۔ [۱۷۵] خزانہ عامرہ صفحہ ۲۹۸، نول کشوری۔ [۱۷۶] شالا چودہ بانی راجہ ہند، صفحہ ۴۹۔ اکبر اور سلطنت مغلیہ کا عروج، از کرنیلی مے لیسن صفحہ ۱۶۵

در بتانِ ہند چوں او دلبرِ خودکام نیست
رام رامم گرچہ می گوید و لیکن رام نیست[۱۷۶]

قیاس کا تقاضا ہے کہ شبستانِ شاہی تک پہنچتے پہنچتے اندک توجہ و تربیت سے یہ رانیاں سب کچھ سیکھ لیتی ہوں گی۔ ان کی مہذب و خوش فہم انگہ بانوں[۱۷۷] آتونوں[۱۷۸]۔ چیریوں، باندیوں اور سلیقہ مند و باتمیز کنیزوں کی کا جمگھٹ ان کو چند روز میں کیا کچھ نہ بنا دیتا ہوگا۔ ٹاڈ صاحب فرماتے ہیں کہ "جے پور[۱۷۹] میں دہلی کی زبان کا اثر اور طور طریقہ مدت سے چلا آتا تھا۔ یہاں تک کہ ہندو خواتین اور رانیوں کے نام یا رشتہ کے ساتھ آخر میں "صاحبہ" بھی لگا دیتے تھے جو فارسی (؟) کا لفظ ہے۔"[۱۸۰] ایسے حالات میں مان بائی اپنے میکے ہی سے مغلوں کے آداب اور تہذیب و معاشرت کی معمولی باتیں سنی سنائی ضرور سیکھ آئی ہوگی خوش نصیبی سے اس کو یہاں بھی اچھے سے اچھا موقع یہ حاصل تھا کہ اس کی پھوپی (جو اس وقت بھی ہوئی) مریم زمانی اکبر کے مشکوے

---

[۱۷۶] سرو آزاد، صفحہ ۹۴۔ [۱۷۷] انگہ، دایا نگہ۔ دائی، استانی (راز ہمایوں نامہ)
انگہ بانوں، مرضعہ، دودھ پلانے والی۔ (تاریخ فرشتہ، جلد اول، صفحہ ۲۵۲)
[۱۷۸] آتون۔ وہ عورت جو لڑکیوں کو پڑھنے کی تعلیم دیتی ہو۔ [۱۷۹] دیکھئے فرہنگ حواشی،
نوٹ نمبر ۳۰۔ [۱۸۰] راجستھان، جلد دوم، مطبوعہ ۱۹۲۰ء کلکتہ صفحہ ۳۴۶۔

دولت میں جلوہ افزا تھی[۱۸۲]۔ اس عقیل و خوش تدبیر ملکہ کے سوا اس کی بہت سی تربیت یافتہ اور بہ ہمہ فن کامل ہیلیاں، ہندو پاترین، مسلمان خواصین بھی قلعۂ معلّٰی کی بہاریں تھیں۔ فرزانہ مشیر و محافظ تھیں پرستاریں بھی۔ انھوں نے علم مجلس اور آداب محفل میں طاق کر دیا ہوگا۔ اپنے حسن تربیت اور سلیقہ آموزش[۱۸۳] سے چار چاند لگائے ہوں گے۔ شیریں زبان و شیوا بیان سلیم سلطان دوسری ساس نے حاضر جوابی، خوش سلیقگی، خوش تدبیری کے گُر سکھائے[۱۸۴] ہوں گے۔ ہونہار شعور[۱۸۵] والی رانی کو چاند سے سورج بنا دیا ہوگا۔ رانی منجھلا دیور اکبر کا منجھلا بیٹا، سلطان دانیال، جو راجہ بہاری مل کچھواہہ کا نواسا تھا،

---

[۱۸۲] دختر راجہ بہاری مل کچھواہہ۔ (طبقات اکبری صفحہ ۲۵۶۔ اکبر نامہ جلد دوم صفحہ ۱۹۰۔ دربار اکبری صفحہ ۵۴۷۔ مرقع اکبر آباد صفحہ ۱۶۴۔ قاموس المشاہیر صفحات ۱۳۹ و ۱۸۴۔ مرآۃ السلاطین صفحہ ۱۴۴۔ مسلمان تاجداران ہند جلد دوم صفحہ ۵۴۔ امرائے ہنود صفحہ ۵۷۔ ڈنکن کی آگرہ ہینڈ بک صفحہ ۱۴۹ نوٹ۔ ٹاڈ کا راجستھان، ترجمہ افق صفحات ۶۷۹ و ۶۷۷۔ بیل کی ڈکشنری صفحہ ۱۷۲۔ تاریخ تاج (انگریزی) صفحہ ۱۴ نوٹ۔ اورنگ زیب اور زوال سلطنت مغلیہ (انگریزی)، سلسلہ حکمرانان ہند صفحہ ۱۴۔ ایضاً ترجمہ اردو صفحہ ۱۰۔ جورنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۱۷ء، صفحہ ۵۶۰۔ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا THE MONUMENTAL ANTIQUITIES AND INSCRIPTIONS جلد دوم تیغ A. FÜHRER. 1891, PP. 71, 72.

[۱۸۳] سکھانا۔ استادی [۱۸۴] اکبر نامہ جلد دوم، صفحہ ۹۵، جلد سوم صفحات ۱۲۴ و ۷۳۴۔ منتاح التواریخ، بیل صاحب صفحہ ۲۲۵ اور بیل ڈکشنری صفحہ ۱۳۴۔ [۱۸۵] جان لینا۔ دریافت کر لینا۔

اپنی نانہالی (مادری) زبان ہندی پر فدا تھا۔ اُس کے ساتھ خاص شغف رکھتا تھا[۱۸۶]۔ اس کی جھلک بھی رانی پر پڑی تھی۔ مگر یہ سب اس عاجز راقم سطور کی قیاس آرائیاں اور غریب ذہن ہے۔ یا گزرے ہوئے زمانہ کی ہوا شناسی کا تخیل کہہ لیجئے۔ ورنہ فارسی و فرنگی مورخوں نے پرانے ہوں یا نئے اس مبحث و موضوعِ گفتگو کو قطعاً نظر انداز کر دیا ہے۔ خاموش نظر آتے ہیں۔ بے شبہ محلات و محارمِ شاہی کے متعلق یا اُن کے معمولات اخلاق و آداب کے بارہ میں کچھ لکھنا اب و آداب سلطانی سے بعید تھا۔ گستاخانہ فعل سمجھا جاتا ہوگا۔ جیساکہ میر عبدالجلیل بلگرامی نے "مثنوی طوے محمد فرخ سیر" میں اعتراف و اقرار کیا ہے۔

سخن چوں در گلستانِ حَرَم شد ۔۔۔ ادب این جا عنان گیرِ قلم شد[۱۸۷]

بھولے سے ملّا عبدالحمید لاہوری کے قلم سے بادشاہ نامہ میں اتنا نکل گیا ہے کہ اکبر کی سب سے پہلی بیگم خدیجۃ الزمانی رقیہ سلطان[۱۸۸]

---

۱۸۶ ہیل کی ڈکشنری، صفحہ ۷۔ مقالات شبلی (مسلمانوں کی علمی بے تعصبی) صفحہ ۴

۱۸۷ صفحہ ۶۱، مطبوعہ لکھنؤ۔ خزانہ عامرہ صفحہ ۳۵۸۔ حیات جلیل حصہ دوم صفحہ ۵۰۔

۱۸۸ فرشتہ، جلد اول صفحہ ۲۳۰۔ قاموس المشاہیر، صفحہ ۲۶۴۔ ڈی لیٹ کا حاشیہ نویس بنرجی، صفحہ ۹۳۔ نوٹ ۸۰۔ سیر المصنفین جلد دوم صفحہ ۲۸

جو[189] اکبر کے چچا ہندال مرزا کی بیٹی تھی، خالص ترکی زبان بولا کرتی تھی۔ یاد رہے کہ یہی ترکن رقیہ ہمارے ہندوستان اور ہندوستانی میں آکر خوش لیاقت خوش فہم اہل قلم دیسیوں اور پردیسیوں کے ہاتھوں رکیہ اور روکیہ بنا دی گئی[190] تو غیر ملکی سیاحوں میں سے ڈی لیٹ (۱۶۲۰ء) نے اسی کو "روکیا سلطان"[191] لکھا ہے۔

ان چغتائی ترکوں[192] نے ہندوستان میں رہ کر اپنی اصل و نسل

تزک جہانگیری میں اس کا نام رقیہ سلطان بیگم لکھا ہے۔ مسٹر بیورج نے اپنے نوٹ نمبر ۲ صفحہ ۴۸ ترجمہ تزک مطبوعہ لندن ۱۹۰۹ء میں لکھتے ہیں کہ یہی پہلی اور خاص بی بی اکبر کی تھی۔ مگر اس سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اکبر کے بعد مدت تک زندہ رہی۔ نیز ملاحظہ ہو دوسرا حصہ نوٹ نمبر ۱۳۔ [189] بادشاہ نامہ جلد اول صفحہ ۷۶۔

[190] مفتاح التواریخ صفحہ ۴۸۰۔ جلیس اور نیل ڈکشنری صفحہ ۲۲۷۔ فوہرر کے آثار قدیمہ و کتبات صفحہ ۱۰ THE MONUMENTAL ANTI QUITIES AND INSCRIPTIONS A FÜHRER.

[191] ڈی لیٹ کی تاریخ سلطنت مغل اعظم ترجمہ انگریزی صفحہ ۱۰۰ اور ۱۰۲ باب ۲۴۔ [192] چغتائی مغلوں کے لئے ملاحظہ ہو الیاس راس ELLIAS ROSS کی "وسط ایشیا کے مغلوں کی تاریخ" تعارف صفحہ ۲۸۔ لیکن اس اصل و نسل کی اصلیت و حقیقت کیا تھی؟ کہاں تک تھی؟ جہانگیر کے محسن مورخ ڈاکٹر بینی پرشاد سے سن لیجئے۔ "بابر بذات خود نیم چغتائی اور نیم مغل تھا۔

(باقی صفحہ آئندہ پر)

خاندانی و جماعتی خصائص کو خیر باد[193] کہا تھا۔ وہ اپنے باپ دادا کی زبان کے بڑے دالہ و شیدا[194] تھے۔ گہری محبت رکھتے تھے۔ بزرگوں کی تمام باتوں، امتیازات اور خصوصیات کی حفاظت کرتے تھے۔

جیسا کہ گلبدن بیگم کا ہمایوں نامہ پڑھنے سے واضح ہوتا ہے۔ بہت سے اسبابِ خانہ داری ہر قسم کا سامان، ظروف و طعام، سامان و زادِ سفر، وضع و لباس وغیرہ کے نام ترکی ہی تھے۔ یہ ترکی الفاظ مغلی محل سرا میں آخر وقت تک رائج رہے۔ جب قلعہ اجڑا، سلطنت مٹی، بادشاہی کا نام گیا، اُس وقت یہ بھی رخصت ہوگئے[195]۔ جہانگیر اپنے بچپن کے حالات میں لکھتا ہے "میرے باپ کو بڑا خیال تھا کہ مجھے ترکی زبان آئے۔ اس واسطے بیوی جی کے سپرد کیا تھا کہ اس سے ترکی ہی بولا کرو اور ترکی ہی پڑھا کرو[196]۔ اس قدغن[197] کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام ماوراء النہری امرا، اُن کے اہل فوج، خدم و حشم

ہمایوں کی والدہ چغتائی تھی۔ اکبر نیم ایرانی تھا۔ جہانگیر نیم راجپوت تھا۔ اور شاہجہاں ترک سے زیادہ راجپوت تھا۔ [193] یہ کلمہ رخصت کے وقت ایک دوسرے سے کہا جاتا ہے۔ جنازہ یعنی رخصتِ سفر [194] لام کے نیچے زیر۔ شیفتہ، سرگشتۂ عشق، مفتون۔ [195] مسز اینیٹ بیورج، صفحہ ۲۵۴، انگریزی۔ [196] تزک جہانگیری، دربار اکبری، صفحہ ۱۴۱-۱۴۲ [197] یعنی تاکید و تقید۔ (ظاہرا ترکی لفظ ہے)۔

سب کی زبان ترکی تھی - ایرانی بھی ترکی بولتے تھے - سمجھتے تو سب تھے۔ اکبر خود بہت خوب ترکی بولتا تھا۔[۱۹۵] بیٹا (جہانگیر) ان پڑھے باپ سے کئی قدم آگے گیا۔ شستہ و رفتہ ترکی بولتا تھا - بے تکلف لکھتا تھا۔ تزک میں اپنے ترکی خط کا فخریہ ذکر بھی کرتا ہے[۱۹۶] - کون انکار کر سکتا ہے کہ ایسے مسخر مجسم سرتاجوں سے جو ملکوں اور لشکروں ہی کے فرمانروا نہ تھے بلکہ اقلیم محبت و دلداری کے بھی بادشاہ تھے، جن کی حکمرانی دلوں پر بھی تھی،[۲۰۰] کیا اکبر و جہانگیر کے فیض صحبت اور شرف عاطفت اثر التفات سے جودہ بائی کلاں زوجۂ سلطان[۲۰۱] جودہ بائی خورد،[۲۰۲]

---

[۱۹۵] دربار اکبری، صفحہ ۵۰۶ [۱۹۶] ترجمہ راجرس بیورتج، صفحات ۱۰۹ تا ۱۱۰ و صفحہ ۳ ترک ۱ [۲۰۰] رسالہ جہانگیر شبلی نعمانی، صفحہ ۴۳ [۲۰۱] اکبر نامہ صفحہ ۱۹۸ - مسلمان تاجداران ہند جلد دوم صفحہ ۴۵ - ٹاڈ کا راجستھان ترجمہ، صفحات ۶۱۹ و ۷۶۶ - ۱۶۱۹ - ایکراس انڈیا COTTON'S ACROSS INDIA صفحہ ۶ - اکبر اور سلطنت مغلیہ کا عروج (انگریزی) صفحات ۱۴۵ و ۱۸۵ - آرکیالوجی کل سروے آف انڈیا صفحات ۷۱ و ۷۲ - [۲۰۲] مرقع اکبرآباد صفحہ ۱۸۹ - مغل اور اردو صفحہ ۱۷ - مآثر الامرا جلد دوم صفحہ ۱۸۱ - تزک جہانگیری صفحہ ۸ - مسلمان تاجداران ہند جلد دوم صفحہ ۱۷ - امرائے ہنود صفحہ ۴۹ - بیل کی ڈکشنری صفحہ ۱۳۵ - اکبر اور سلطنت مغلیہ کا عروج صفحہ ۱۸۲ - تعمیرات ہندوستانی (انڈین آرکیٹیکچر) ہیول صفحہ ۱۷۲ -

مان بائی، ملکہ جہاں[۲۰۳] وغیرہ رانیوں نے ترکی زبان کے بولنے اور سمجھنے پر قدرت حاصل نہیں کر لی تھی؟ مستشرقیات کے مشہور عالم ولیم اِروین WILLIAM IRVINE اپنی تاریخ انگریزی "افواجِ مغلانِ ہند" میں تحریر فرماتے ہیں کہ چغتائی زبان[۲۰۴] کو ۱۱۳۳ھ / ۱۷۶۰ء تک بادشاہ اور امرائے دربار بولتے اور سمجھتے تھے۔[۲۰۵] ان کی سند سیر المتاخرین ہے۔ یہ بھی اگلوں سے سنی سنائی بات ہے کہ محلات شاہی اور امراء و مقربین کی بی بیاں تو بی بیاں، لونڈی باندیاں بھی بقدر ضرورت ترکی بول لیتی تھیں اور سمجھتی تو سب تھیں۔ اوپر عرض کر چکا ہوں کہ اکبر کی بڑی بیگم رقیہ سلطان خالص ترکی بولنے کی عادی تھی۔[۲۰۶] شاہجہاں کی عزیز بیٹی جہاں آرا کی ہستی کس قدر قابل نازش تھی۔ اس کی عربی و فارسی انشا پردازی اور شاعری بڑے بڑوں کو حیرت زدہ بنا دیتی ہے، وہ ترکی زبان کی بھی ماہر تھی۔[۲۰۷]

اچھا تو کیا یہ بھی سمجھ لیا جائے کہ محل سرائے شاہی میں رونق افروز

۲۰۳۔ ملکہ جہاں، جہانگیر کی بی بی، راول بھیم والی جیسلمیر کی بیٹی تھی۔ راول کلیان بھائی کا نام تھا (بیل کی ڈکشنری صفحہ ۱۶۷)۔ ۲۰۴۔ چغتائی، خالص ترکی بولی ہے (بیل، صفحہ ۳۹) اس میں نظم و نثر علوم و فنون کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ ۲۰۵۔ صفحہ ۱۸۴، مطبوعہ لندن، ۱۹۰۳ء۔ ۲۰۶۔ جلد سوم صفحات ۱۴۲۲ و ۱۰۰۴۔ ۲۰۷۔ ترجمہ آئین اکبری جلد اول صفحہ ۲۵۲ مطبوعہ ۱۸۷۳ء۔ ۲۰۸۔ رسالہ ادب لکھنؤ جنوری ۱۹۳۲ء صفحہ ۲۲۔

ہوتے وقت یہ رانیاں بھی ترکی یا فارسی سے کم یا زیادہ آگاہ و آشنا ہوتی تھیں؟ شاید یہ قیاس صحیح نہ ہوگا۔ بقول مسٹر بلاک مین اکبر اکبر کے عہد سے پہلے ہندو مرد ہی فارسی نہیں پڑھتے تھے۔ اور اس طرح خود کو اپنے مسلمان فرمانرواؤں سے علمی و سیاسی طور پر فروتر رکھتے تھے۔ تابہ زنان و دختران چہ رسد[۲۰۹]۔ ان کی عورتوں اور لڑکیوں کو بہرۂ وسعتِ معلومات، یہ اعلیٰ تعلیم و تربیت عجمی کب حاصل یا میسر رہی ہوگی!

رہے شاہزادے۔ نواب نصیر حسین خاں خیال کی نفیس تالیف ”مغل اور اردو“ سے پایا جاتا ہے کہ تیموری شاہزادوں کی تعلیم و تربیت بڑے سلیقہ و اہتمام سے ہوتی تھی۔ اُن کو مغربی علوم و فنون یعنی عربی و فارسی کے ساتھ ساتھ مشرقی علوم اور زبانیں (سنسکرت اور بھاشا) اچھی طرح سکھائی جاتی تھیں۔ یہ شاہزادے بہمہ ہنر و فن کامل، علوم و فنون کے ماہر و مربی، اور اپنے علم و فضل میں مشہور اور ممتازِ روزگار ہوتے تھے ان کو سنسکرت اور بھاشا سے الفت ہوتی تھی۔ ہندی شعرا کی سرپرستی فرماتے تھے[۲۱۰]۔ اگر حسب طور پر شاہزادوں اور اپنے امیروں اور راجاؤں کی اولاد کی تعلیم کرانا

---

[۲۰۹] ترجمہ آئینِ اکبری جلد اول صفحہ ۵۷، مطبوعہ ۱۸۷۳ء [۲۱۰] صفحہ ۳۶

تھا اور اہتمام و شغف رکھتا تھا، اکبر نامہ کے اوراق سے اس کا پتہ چلتا ہے۔[۲۱۱] اورنگ زیب کی تعلیم و تربیت اسی ڈھنگ اور اصول پر ہوئی تھی۔ جس کی تائید مآثر عالمگیری اور سیر المتاخرین سے ہوتی ہے۔ ملا محمد صالح کنبوہ کا "عمل صالح" موسوم بہ "شاہ جہاں نامہ" بھی شاہد ہے۔ بہرکیف ماننا پڑتا ہے کہ خود اکبر اس کے شاہزادوں نیز صاحبزادیوں حتٰی کہ خانہ زادوں کو بھی بھاشا پر پورا عبور حاصل تھا۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے بہتوں کی مادری زبان ہی تھی۔ گھٹی میں پڑی ہوگی۔ محل سراؤں میں بھی یہ بولی گوش زد ہوتی تھی۔

کسی فلسفی بذلہ سنج[۲۱۲] (غالباً فرنگستانی) کا قول ہے کہ "عورت کو ایک آقا کی احتیاج ہے۔ اگر وہ جوان ہے تو اس کا آقا جو کوئی بنے گا وہ اس کا "عاشق" ہوگا۔ اور اگر وہ بڈھی ہے تو اس کا آقا ایک "حامی دین" ہوگا۔" حامیان ادیان متین کی عبائے تقدس اور اتقا کے گوشہ دامان کو بوسہ

---

[۲۱۱] جلد سوم صفحہ ۵۲۔ [۲۱۲] جلد اول صفحات ۳۱ و ۳۲۔ [۲۱۳] ب پر زبر زیر پیش تینوں حرکتیں جائز ہیں۔ یعنی لطیفہ گو، اچھی اچھی باتیں کہنے والا۔ انشاط خاطر پیدا کر دینے والا۔ [۲۱۴] بالائی ہندوستان میں اس کے لئے ایک اچھا، جامع، کثیر المعانی لفظ "خاوند" مخصوص و مستعمل ہے۔ فارسی کے لغت نویس اس کا مقصود صاحب یا خداوند، مالک سے لے کر خداوند کہتے ہیں۔

2911 32943 ۔۔۔19

دینے کا شرف عمر بھر حاصل رہا ہے۔ اس لئے صرف پہلی شِقّ[۲۱۵] کی شہادت اور دعوے کے ثبوت میں اہل دنیا کا تجربہ و مشاہدہ پیش کردینا کافی ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ عاشق و معشوق کے کسی بامراد و کامگار جوڑے میں باہم دگر کوئی تفرقہ و اختلاف باقی نہیں رہتا۔ کھل کر کہنے کی ضرورت نہیں۔ زبان سے زبان مل جانے کے بعد زبانوں کا اتحاد خود بخود پیدا ہو جانا لازمۂ فطرتِ انسانی ہے۔

ذہنی آوارہ گردی اور بڑھی جاتی ہے۔ ایک بہت پرانی بات یاد آئی۔ فرانس کی کسی پیشہ ور عورت نے ایک کنیز کو ان الفاظ میں مخاطب کیا تھا "ہمارے عاشق دراصل ہمارے حُسن کے عاشق ہیں۔ جب ہمارا حسن خزاں کے زیر اثر آجاتا ہے تو اُن کی وارفتگی کسی دوسری طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ لیکن تمہاری حالت بالکل مختلف ہے۔ تمہیں جب کوئی ہم مزاج عاشق مل جاتا ہے تو وہ تمہارا ہو رہتا ہے۔ اور آئندہ کے لئے تمہاری خوشی و خرمی یقینی ہو جاتی ہے"۔ جب یہ سلیقہ و مرتبہ لونڈی باندیوں کا تھا تو عالی خاندان لڑکیوں اور شائستہ شاہزادیوں کی شانِ ایثار و وفا اور اُن کی دائمی گرویدگی اور باہمی فریفتگی کا آسانی سے اندازہ ہو سکتا ہے۔

---

[۲۱۵] بکسر شین و تشدید قاف، کسی چیز کا آدھا یا ٹکڑا۔

یہ امر کہ اس محلاتی اور بیگماتی بھاشا کی نوعیت، ماہیت اور کیفیت کیا تھی؟ اس کے لئے ایک جان فشاں ورق گردانی اور تلاش و جستجو کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ایک جداگانہ مستقل مقالہ یا سلسلہ کی ایسی تحقیق سے فی الحال مجھ دائم المرض کم بضاعت کے بس کی چیز نہیں۔ غیر زبانوں کے متعلق جس کی (میری) آگاہی و معلومات کا سرمایہ صرف چند مزدوری پیشہ و بیکانیریوں یا جانتراؤں کے لئے آنے جانے والی مارواڑیوں کی توجہات کا ممنون ہے۔ جس نے کبھی کبھی سرحدی پٹھانوں اور ہینگ اور میوہ بیچنے والے افغانوں سے پشتو سنی ہے۔ چاقو، چھری دکھانے والی بلوچنوں کی بولی نہ کبھی پہلے سمجھ سکا تھا، نہ اب سمجھتا ہوں۔

بے شبہ تین چار سو برس پہلے کے دوہرے اور ہندی کا کلام جو مشائخ اور درویشوں کے ملفوظات یا خانقاہی روایات و منقولات یا ہندی شعراء کے تذکروں اور کتابوں میں نظر پڑتا ہے۔[۲۶۶] نہایت سلیس لطیف

---

[۲۶۶] پشپان جلی۔ ہندی نورتن۔ کویتا کومدی ہندی۔ سبحۃ المرجان عربی، میر غلام علی بلگرامی، تلسی ادھاولی۔ شیخ فریدالدین گنج شکر، حضرت نظام الدین اولیا، شیخ احمد نہروانی مولانا مسعود سعد سلمان، اور امیر خسرو دہلوی کا کلام۔ سرو آزاد، میر غلام علی صفحات ۳۵۲ لغایتہ ۲۰۵۔ جواہر خسروی مقدمہ جیستان صفحات ۱۵۳ تا ۱۵۶ دیوان قاضی محمود بحری، مدونہ ڈاکٹر محمد حفیظ سید، صفحات ۲۵ و ۱۵۱، مثنویِ سلیمانی، صفحات ۴۲ تا ۴۷۔ فرہنگ آصفیہ (متعلق ہندی)۔

اور جیسا کہ متفقاً کہا جاتا ہے، ہر دل عزیز زبان میں ملتا ہے خواہ نظم میں ہو، خواہ نثر میں۔ گرخنت، ٹھوس اور ٹھس الفاظ کی ان بابرکت جماعتوں میں کہاں گزر تھی! امیر خسرو اسی "ہندوی" کی نسبت فرماتے تھے

ہست خطا،[۲۱۷] و مغل و ترک و عرب

در سخن ہندوی ما دوختہ لب[۲۱۸]

قیاس چاہتا ہے کہ ان سمن اندام نازنینانِ حرم کی بولی اور بھی ستھری، میٹھی اور پیاری ہوتی ہو گی۔ لچک، لوچ اور ترنم ایک ایک بول کو آسمان پر اُڑا لیے جاتے ہوں گے۔ لہجہ کی دلکشی اور طرز تکلم[۲۲۰] کی شائستگی کے تخیل و تصور ہی سے مجھ ایسا بوڑھا لکھنے والا مسرود[۲۱۹] ہوا جاتا ہے۔

اسی سلسلہ میں یہ بھی عرض کر دینا لازم ہے کہ مذہبی بیگانگی اور تمدن و معاشرت کا اختلاف شروع شروع میں ان رانیوں کی طبیعت کو ضرور اُچاٹ اور برداشتہ خاطر سا رکھتا تھا، مگر رفتہ رفتہ تیموری شائستگی و تہذیب، محلوں کی محبوب فضا غالب آجاتی، اُن کو مانوس و خوگر کر لیتی، اپنا بنا لیتی تھی۔ مغلی حرم سراؤں کی روش اور دل لبھانے

---

۲۱۷ ختن۔ بدون ہمزہ۔ شہر و ملک ترکستان اور چین کے مابین ۲۱۸ نقوش سلیمانی، صفحہ ۴۸ ۲۱۹ گانا، سرود۔ دلکش طرز ادا۔ ۲۲۰ بات کرنا۔

والے طور طریقے کا مطالعہ کرتے کرتے یہ راجپوتنیاں بھی زبان و دل دونوں سے شوہروں کی ہم نوا و ہم آہنگ ہو جاتی تھیں۔ اور اپنے اخلاق و آداب و عادات سے خاوندوں کو گرویدہ کر لیتی تھیں۔ شاہ جہاں نے جب مراسم درباری و آداب شاہنشاہی میں رد و بدل تجویز فرمایا۔ اکبر و جہانگیر کی مقرر کی ہوئی رسموں سے عدول[221] مد نظر ہوا۔ عربی و قمری سال و تاریخ کو سرکاری درباری کاغذات میں رواج دیا گیا۔ آتے وقت "سلام علیک" کہنے کا اسلامی طریقہ تازہ جاری کیا گیا۔ سلام و رخصت کے وقت سورۂ فاتحہ پڑھی جانے لگی[222]۔ تو یہ شوہروں کی خدا راجپوت شاہزادیاں بھی اسی اخلاق برتاؤ اور اپنے سلوک کی خوگر ہو گئی تھیں۔

میں (جامع اوراق) مسلمان ہوں مگر مسلمان بادشاہوں کا خواہ مخواہ طرفدار نہیں۔ ان کے بیجا افعال اور ناشایستہ حرکات کے چھپانے کی میں نے کبھی کوشش نہیں کی۔ آرزو ہے کہ آئندہ بھی میرا ناچیز قلم ان کے متعلق توریہ[223] و تاویل کی جرأت نہ کرے۔ یہ دعوی خود ستائی ہے

[221] راہ سے پھر جانا، درگزرنا۔ [222] منتخب اللباب خافی خاں جلد اول صفحہ ۳۹۷

[223] توریہ کسی بات کی حقیقت چھپا کر کچھ اور ظاہر کرنا۔ تاویل کسی چیز سے بازگشت کرنا، حیلہ

شرعی

نہیں کرتا بلکہ "تحدث بالنعمۃ"[۲۲۴] ہے۔ خدا کی دی ہوئی نعمت، راست گوئی و راست جوئی کی قدر اور اس کا شکر ادا کرتا ہوں۔ خلجی شاہنشاہ علاء الدین سکندر ثانی کو کون نہیں جانتا[۲۲۵]۔ تاریخ کا مبتدی طالب علم بھی دلیرانہ کہہ ڈالتا ہے کہ چتوڑ پر اس کی چڑھائی ملک و دولت کی طمع سے نہ تھی[۲۲۶]۔ وہ ڈنکے کی چوٹ اعلان کرتا ہوا گیا تھا کہ ماہ پیکر دھر جمال پدمنی کے شوق دیدار سے بے تاب و بے قرار جا رہا ہوں[۲۲۷]۔ یہ لشکر کشی بیکار تو نہیں گئی۔ چتوڑ فتح ہوا[۲۲۸]۔ مگر بد نصیب علاء الدین محروم لوٹا۔ میواڑ کی کئی ہزار رانیوں، بی بیوں اور لڑکیوں نے قلعہ کے مشہور

---

[۲۲۴] عطائے الٰہی کی بات کہنا۔ شکریہ خداوندی۔ [۲۲۵] فیروز شاہی برنی، صفحہ ۲۶۴۔ تاریخ بدایونی جلد اول، صفحہ ۱۸۰۔ تاریخ دکن، سلسلۂ آصفیہ جلد سوم، صفحہ ۴۰۔ ٹاڈ کا راجستھان انگریزی صفحہ ۲۲۳۔ ترجمہ اردو صفحات ۵۰۵ و ۵۱۱ [۲۲۶] ٹاڈ کا راجستھان، ترجمہ صفحات ۹۹ و ۵۰۵ و ۵۱۱ [۲۲۷] خطبات گارساں دی تاسی، صفحہ ۱۵۲۔ اکبر اور سلطنت مغلیہ کا عروج صفحہ ۱۰۳۔ مسلمان تاجداران ہند جلد اول صفحہ ۱۲۴۔ تاریخ ٹاڈ انگریزی مطبوعہ ۱۹۲۰ء صفحہ ۳۰۷۔ مختصر تاریخ راجپوتانہ صفحہ ۱۵ مطلع انوار برق صفحہ ۶۸۔ ایشری پرشاد کی مختصر تاریخ اسلامیان ہندوستان صفحہ ۱۰۱ و ۱۰۲ [۲۲۸] آئین اکبری جلد دوم صفحہ ۱۲۹۔ بیل کی ڈکشنری صفحہ ۳۴۔ ظفر الوالہ بمظفر وآلہ صفحہ ۸۰۷ مطبوعہ لائیڈن۔۔ قصص ہند حصہ دوم صفحات ۳۵ و ۴۰ [۲۲۹] ملاحظہ ہو فرہنگ وحواشی نوٹ ۳۲

آتش کدہ میں پناہ لی۔ حیات[۲۳۰] کے تختے عدم کے کنارے جا لگے۔
انھیں جلنے مرنے والیوں میں وفا شعار شوہر پرست پدمنی بھی تھی۔[۲۳۱]
بہت سے باکمال اہلِ قلم نے نظم و نثر کا ذخیرہ اس رُومان پر یادگار
چھوڑا ہے۔[۲۳۲]

مجھے اُن مصلحت اندیش و ادا شناس مورخین پر حیرت نہیں جو
اس بارہ میں خاموش ہیں۔ خواجہ ضیاء الدین برنی جو اس بادشاہ
کا قریب العصر، آٹھویں صدی کا مشہور مستند اور بے لاگ لکھنے
والا گزرا ہے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں اس کا قطعاً ذکر نہیں کرتا
علاء الدین کا پدمنی پر عاشق ہونا، چتوڑ پر لشکر کشی، رانی کا آگ میں جل کر
جان دے دینا، ایسے مہتم بالشان واقعات بھی اُس کے نزدیک قابل
ذکر نہ تھے یا شاید وقوع ہی میں نہیں آئے! حالانکہ اہلِ نظر واقف ہیں
کہ وہ کسی حد تک متعصب اور سخت مزاج بھی تھا۔ علاء الدین کے
خلاف جو جو باتیں اُس کے علم میں آئیں، اُن کو قلمبند کر دینے میں

نمبر۲۳۰ آئین اکبری جلد دوم صفحہ ۲۶۹۔ ٹاڈ کا راجستھان ترجمہ صفحات ۱۹۹۔۲۱۰۔ اصل
انگریزی مطبوعہ ۱۹۲۰ء صفحہ ۳۱۱۔ کانج ہسٹری آف انڈیا از وھیلر۔ مختصر تاریخ
راجپوتانہ صفحہ ۱۶۔ حیات جلیل حصہ اول صفحہ ۱۰۶، نوٹ ۸۲۔ ۲۳۱ دیکھئے
فرہنگ و حواشی نوٹ ۴۴۔ ۲۳۲ دیکھئے فرہنگ و حواشی نوٹ ۲۵۔

سے پکارتی تھی[۲۳۹] شاید اب بھی مانتی ہو؟ "مہابلی" بتاتی تھی[۲۴۰]۔ درشن کرتی تھی۔ جس کی نسبت یہ شہرت تھی[۲۴۱] کہ بادشاہ نے آفتاب کو تسخیر کر لیا ہے۔ دشمن اُس کا نام ہی سن کر راہِ فرار اختیار کرتے تھے[۲۴۲]۔ سوامی رام تیرتھ نے جس کو ولی مانا تھا[۲۴۳]۔ "دربار کے خوشامدی ہندو اپنے بزرگوں کی طرف سے پیشین گوئیاں سناتے تھے کہ فلاں زمانے میں ایک گئو رکھشک مہاتما بادشاہ پیدا ہوگا۔ بندۂ زر مسلمان عالموں نے بھی اکبر کو مہدی اند صاحبِ زمان اور امام مجتہد وغیرہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک بزرگ "تاج العارفین" یہاں تک بڑھے کہ اکبر کو انسانِ کامل اور خلیفۃ الزماں ہونے کی حیثیت سے خُدا کا عکس ہی ٹھہرا دیا[۲۴۴]۔ ہاں[۲۴۵] یہ وُہی اکبر ہے جس نے محض بیرم خاں' خانخاناں کی خاطر سے بدنصیب

MILL'S BRITISH INDIA, VOL II. PAGE 152 جلد دوم' صفحہ ۱۵۲

ایشیاٹک' ریسرچز' جلد نہم' صفحہ ۱۵۸ [۲۳۹] ٹاڈ کا راجستھان' ترجمہ صفحہ ۴۰۳' انگریزی' صفحہ ۲۶۷۔ نیز ملاحظہ ہو فرہنگ حواشی نوٹ ۳۴ [۲۴۰] مغل اور اردو صفحہ ۱۰۔ قصص ہند' حصہ دوم' صفحہ ۹۶۔ [۲۴۱] قصص ہند' حصہ دوم' صفحات ۹۸۔۱۰۰۔ [۲۴۲] تاریخ فرشتہ جلد اول' صفحہ ۲۶۱' نول کشوری [۲۴۳] کلیات رام' مضمون "اکبر ولی"۔ [۲۴۵] ماہنامہ الفرقان' شاہ ولی اللہ نمبر' صفحہ ۶۵۔

ہیمو[۲۴۶] کے سر کو تلوار سے چھو کر چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہیمو جو اُس وقت اسیرِ جنگ کی حیثیت سے پا بہ جولاں اور دست بہ زنجیر آنکھ میں زخم عذاب کا طوق گردن میں ڈالے دربار میں کھڑا تھا۔ جس کو بادشاہ نے زندہ چھوڑا تھا مگر خان خاناں اور فتح گدا سے کمبوہ وغیرہ نے انھوں ہاتھ ختم کر ڈالا۔[۲۴۷] یا جیسا کہ احمد یادگار اور ایک ڈچ مصنف کا بیان ہے خود بدولت (اکبر) ہی نے اس شامت زدہ آفت رسیدہ کی گردن ایک تیز خنجر سے اڑا دی تھی۔[۲۴۸] بہر دو صورت ہیمو کا سر کابل بھیجا گیا۔[۲۴۹] باقی جسم دہلی کو۔ اور اس طرح شاہنشاہ کی عظمت و شوکت اور جلال و سطوت کا اعلان و اشتہار فرمایا گیا۔

اس کے سعادتمند بیٹے اور جانشین جہانگیر کی ایک روایت بھی

---

[۲۴۶] دیکھیے فرہنگ آصفیہ نوٹ ۴۵۔ [۲۴۷] منتخب التواریخ ترجمہ W.H. LOWE مطبوعہ کلکتہ ۱۸۸۴ء جلد دوم صفحات ۸۰ و احمد یادگار قلمی، تاریخ داؤدی قلمی، فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۴۶، تزک جہانگیری، در ترجمہ تزک صفحہ ۵۳۱۔ ڈی لیٹ صفحہ ۵۳۰ مطبوعہ ۱۶۳۱ء ایمسٹرڈام۔ [۲۴۸] PRESIDENT VON DEN BROECKE – THE FRAGMENTUM HISTORIAE INDICA. سو ترجمہ لیتھ برج در کلکتہ ریویو ۱۸۷۳ء صفحہ ۱۱۹ نوٹ۔ LETHBRIDGE

[۲۴۹] بایزید بیات کی تاریخ میں اس سر کے کابل بھیجے جانے کا حال مندرج ہے (قلمی)

سن لیجئے۔ اکبر نے خود ذکر کیا تھا۔ میں ایک روز کابل میں تھا۔ خواجہ عبدالصمد شیریں قلم کے روبرو ایک تصویر کی نقل اتار رہا تھا۔ میرے موقلم (برش) سے خود بخود ایک ایسی تصویر بن گئی، جس کا جوڑ جوڑ الگ تھا۔ یعنی جسم کے تمام اجزا ایک دوسرے سے منفصل و منقطع تھے[۲۵۰]۔ اکبر کے اس غیر ارادی فعل کو اُس کے درباری اُمرا اور خوش عقیدت مورخ معجزہ و کرامت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

اکبر کے پیارے مگر پرانے[۲۵۱] تیوہاروں میں نوروز[۲۵۲] "خوش روز[۲۵۳]" کے مبارک نام سے موسوم تھا۔ اُس روز رئیسوں کی عورتیں، امیروں کی بیگمیں شاہی محل میں دکانیں لگاتی تھیں سجتی سجاتی تھیں [بروئے معاہدۂ خاص، چند اور رعایتوں کے علاوہ بوندی کا ہاڈا راجا اور اُس کے جاگیرداروں کی رانیاں اور مستورات اس رسم کی پابندی یا مینا بازار کی حاضری سے مستثنیٰ تھیں[۲۵۴]۔] بادشاہ خود

سنہ ۲۵۰ تزک جہانگیری، ترجمہ بیوریج و راجرس، صفحہ ۴۰۔ اکبر نامہ ابوالفضل، ترجمہ بیوریج جلد دوم صفحات ۶۷ و ۶۸ سنہ ۲۵۱ شبنم شاداب و فرہنگ نایاب، طاہر اسحٰق تفرشی، مطبوعہ ۱۸۵۶ء صفحہ ۱۵۔ ٹاڈ کا راجستھان انگریزی مطبوعہ ۱۸۷۳ء مدراس، صفحات ۷۲ و ۲۷۶ نوٹ د ۱۳۵ و ۲۹۰۔ سنہ ۲۵۲ ملاحظہ ہو فرہنگ و حواشی مقالہ ہٰذا سنہ ۲۵۳ "خوش روز" ٹاڈ کا راجستھان مطبوعہ ۱۹۲۰ء صفحات ۴۰۰ و ۴۰۱۔ سنہ ۲۵۴ ٹاڈ کا راجستھان، ترجمہ، صفحات ۱۱۶، ۱

(باقی صفحہ آئندہ پر)

شمعِ بزم عیش یا آپ کی رنگین اصطلاح میں اس پری پیکر کا اکھاڑے کا راجہ اندر ہونا تھا۔ بقول منشی مہاراج بہادر برق[۲۵۵]

شاہی محل سنا ہی کہ تھے جلوہ زارِ حسن
ہر نازآفریں تھا وہاں تاجدارِ حسن
حورانِ ہند جو کہ تھیں صد رشکِ آفتاب[۲۵۶]
سب ہی تو اُن کے سامنے تھیں شرمسارِ حسن

ہمہ داں و ہمہ دانش شیخ ابوالفضل[۲۵۷] اس تقریب کی تقریب کرتا ہی:۔

آئینِ خوش روز۔ گیتی خداوند بہ پژوہشِ آگہی و شناسائی افزون نگر زکاری روزگار سوی میں روزِ جشن ہر ماہ والا انجمنے آراید۔ سوداگر زبان برفراز گرم بازاری نشیند و کالائے ہر کشور[۲۵۸] بدکان پیدائی درآید۔ پرستارانِ مشکوئے[۲۵۹] اقبال فراہم آیند و پردگیانِ گوناگوں مردم راہ

---

[۲۵۴] انگریزی مطبوعہ ۱۸۹۴ء جلد دوم صفحہ ۴۵۲۔ مسٹر بیوریج مآثر الامرا کے انگریزی ترجمہ میں لکھتے ہیں کہ ہاڈا قبیلہ نے مغلوں سے قرابت کرنا گوارا نہیں کیا تھا، صفحہ ۴۰۹۔ ملاحظہ ہو فرہنگ و حواشی، نوٹ ۲۷ [۲۵۵] ملاحظہ ہو فرہنگ و حواشی نوٹ ۳۶ [۲۵۶] مطلع الانوار صفحہ ۱۷۹۔ [۲۵۷] ملاحظہ ہو فرہنگ و حواشی مقالہ ۳۹۔ [۲۵۸] اسباب رخت متاعِ غیر حیوان۔ [۲۵۹] بت خانہ۔ مجازاً امرا اور بادشاہوں کی حرم سرا

یابند۔ خرید و فروخت را ہنگامہ شود۔ گروہا گروہ کامیاب خواہش گردند۔ شہریار دُور بین نیز برگزیدنِ کالا بر نہادنِ نرخ تازہ بقابے برسازد و بدیں روش شناسائی اندوزد۔ ہنفتگی ملک و جگونگی مردم زاد و بد و نیک ہر کارخانہ دریابد۔ وایں روز را بدیں نام خواند و نُویدِ خوش دلی بخشد۔ سپس بازارِ مردان انتظام یابد۔ بازرگانِ ہر بوم را کام دل برآید۔ خدیوِ عالم داد و ستد را عیار برگیرد و بازیافتگانِ عشرت خریداری نمایند۔ و ہر گروہے بے دُور باش چاوشان[۲۶۰] دردِ دل برخواند و متاعِ آرائی را دستمایۂ گزارشِ حال گرداند۔ نیکاں را روزِ مراد بروَمد و بَداں را بادافراہ[۲۶۱] سامان یابد۔ واز فروغِ دیدہ وری بدیں کارگنجورے[۲۶۲] و مُشرفے[۲۶۳] جداگانہ باشد۔ ہماں زماں بے رنجِ انتظار زر یابند و فراواں سود بردازند[۲۶۴]۔

ترکستان کے بازاروں کا دستور یاد کرکے اسی آئینی ضابطے کے حوالے سے مولانا آزاد دہلوی فرماتے ہیں کہ "ہر مہینے معمولی بازار کے

---

[۲۶۰] ترکی بروزن طاؤس۔ لشکر و قافلہ کا نقیب۔ [۲۶۱] گناہ کی جزا۔ برائی کی مکافات۔ [۲۶۲] گنج ور۔ خزانہ دار۔ [۲۶۳] لکھنے والا جو اور لکھنے والوں کے اوپر ہو۔ جو ان لوگوں کی خیانت سے خبردار رہے۔ [۲۶۴] آئین اکبری جلد اول صفحہ ۲۰۱ مطبوعہ نول کشور ۱۸۹۳۔ نیز ملاحظہ ہو اکبر نامہ جلد سوم صفحات ۲۰۰، ۳۲، ۲۳۶ وغیرہ۔

تیسرے دن قلعہ میں زنانہ بازار لگتا تھا۔ غالباً یہ امر آئین میں داخل ہوگا۔ عمل اس پر کبھی کبھی ہوتا ہوگا ... ... انھیں ایوانوں میں جو درحقیقت ایجاد اور عقل اور شعور کے بازار تھے، زنانہ ہوجاتا۔ وہاں محل کی بیگمات آتی تھیں کہ ذرا ان کی آنکھیں کھلیں اور سلیقے کی آنکھوں میں گھگھراپے کا سرمہ لگائیں۔ امراء و شرفا کی بی بیوں کو بھی اجازت تھی جو چاہے آئے اور تماشا دیکھے۔ دکانوں پہ تمام عورتیں بیٹھ جاتی تھیں۔ سوداگری اور سودا زیادہ تر زنانہ دکھا جاتا تھا۔ خواجہ سرا قلماقنیاں، اردہ بیگنیاں اسلحۂ جنگ سجے انتظام کے گھوڑے دوڑاتی پھرتی تھیں۔ عورتیں ہی پہروں پہ ہوتی تھیں۔ مالیوں کی جگہ مالنیں چمن آرائی کرتی تھیں۔ اسی کا نام خوش روز تھا۔"

"نیک نیت بادشاہ آپ بھی آتا تھا۔ اور اپنی رعیت کی بہو بیٹیوں کو دیکھ کر ایسا خوش ہوتا تھا کہ ماں باپ بھی اتنا ہی خوش ہوتے ہوں گے۔ جہاں مناسب جگہ دیکھتے تھے بیٹھ جاتے تھے۔ بادشاہ بیگم، بہنیں، بیٹیاں پاس بیٹھی تھیں۔ امراء کی بی بیاں سلام کرتیں۔ نذریں دیتیں۔ بچوں کو سامنے حاضر کرتیں۔ ان کی نسبتیں حضور میں قرار پاتی تھیں۔ حقیقت میں یہ بھی آئین سلطنت کا ایک جزو تھا ...[۲۶۵]"

---

[۲۶۵] دربار اکبری، صفحات ۱۵۴ و ۱۵۵ "مینا بازار۔ زنانہ بازار"

اوراقِ تاریخ گواہ ہیں کہ اسی نوروز کے موقع پر جہانگیر کی آنکھ مہرالنسا (نورجہاں) سے لگی تھی۔ اور ناز و نیاز کے مرحلے طے ہوئے تھے۔

یہ کہہ گئیں چھپتے کی نہیں رسمِ محبت
سمجھے نہیں تم خود بھی جو فرما گئیں آنکھیں

عشق و محبت کا روگ تو اسی دوشیزگی میں اپنے سر لے لیا تھا مگر اکبر کی قہرمانی سے کچھ چلی نہیں۔ جب وقت آیا تو دونوں خوب کھل کھیلے۔[۲۶۶]
اسی اکبری نوروز اور اس کے اصلی لین دین کے سلسلہ میں ٹاڈ صاحب فرماتے ہیں سنئے۔ "جہاں پناہ بھی بھیس بدلے وہاں رونق افزا ہوتے تھے! مقصود یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ مالِ تجارت اور ساز و سامان کی قیمت معلوم کرنا، سلطنت کے معاملات و حالات کی نسبت آپس میں لوگ جو کچھ کہتے سنتے ہوں اس کی خبر رکھنا، عہدہ دارانِ سرکار کے اعمال و افعال کی سراغ جوئی۔ آگاہی حاصل کرنا!! دیکھئے ذہانت مآب ابوالفضل نے اس خوش روز کی ناپاک و آلودہ غرض اغراض کو کیسا چھپایا اور کتنا نرم و شائستہ بنا کر دکھایا ہے۔ کیسی دانائی سے بات بنائی ہے!! مگر کیا آئندہ نسلیں اس کو تسلیم کریں گی؟[۲۶۷] بقول اُفُق " اُس کے بیان کو

[۲۶۶] ڈی لیٹ کی تاریخ مغول، صفحہ ۱۸۱، دفعہ ۲۶۔ تاریخ راجستھان از پرمانند صفحات ۳۷۶ و ۳۷۷۔

[۲۶۷] ٹاڈ کا راجستھان، انگریزی، مطبوعہ ۱۹۲۰ء صفحات ۴۰۰ و ۴۰۱

داخل معمولات سمجھیں گی ...... اس کا ثبوت ایک یہی ہے کہ عورات کی زبانوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ حسینانِ راجستھان بھاشا بولتی تھیں، مسلمان نازنینوں کی گفتگو پشتو سے ملتی جلتی ہوتی تھی[۲۶۸]۔

[لیکن موصوف کی کتاب کے مُدوِّن اور مصحح مسٹر ولیم کروک اپنے حاشیہ میں آگاہ فرماتے ہیں کہ مغلوں کی حرم سرا کی خواتین پشتو نہیں بلکہ ترکی بولتی تھیں][۲۶۹] ٹاڈ صاحب لکھتے ہیں کہ "یہ نویں دن کے میلے وہ بازار تھے جس میں راجپوتوں کی عزت کا مبادلہ کیا جاتا یا بٹّہ لگایا جاتا تھا جس کی طرف بہادر پرتھی راج نے اشارہ کیا ہے (ملاحظہ ہو تاریخ انگریزی، صفحہ ۱۸۳۵، نوٹ اول[۲۷۰])۔

کرنیل صاحب کا شیخ کو ملامت کرنا بے صرفہ سا ہے۔ بیشک دونوں کے دونوں اہل فوج و علم، صاحب سیف و قلم تھے۔ مگر شیخ کے راستہ میں کچھ پتھر حائل تھے۔ وہ مجبور بھی تھا، معذور بھی۔ پروردۂ نعمت وابستۂ دامنِ دولت تھا۔ ہاں میں ہاں ملاتا، بات بتانا یا اپنے طور پہ سمجھا دینا[۲۷۱]، اس وقت ہمارے ایشیا میں شیوۂ نمک خواری اور کمالِ

---

[۲۶۸] ٹاڈ کا راجستھان، مترجم، صفحہ ۶۲۳۔ کرنیل صاحب کے اصل متن میں مخلوط بھاکا، کا لفظ پایا جاتا ہے، صفحہ ۴۰۱ جلد اول، مطبوعہ سنہ ۱۹۲۰ء۔ [۲۶۹] صفحہ ۴۰۱ جلد اول نوٹ اول۔

[۲۷۰] صفحہ ۴۰۱، مطبوعہ سنہ ۱۹۲۰ء صفحہ ۳۹۹۔ [۲۷۱] دربار اکبری، صفحات ۵۰۰ و ۶۱۹

فرمانبرداری مانا جاتا تھا۔ انھیں پر موقوف نہیں کسی دفتر دار، احوال نگار کو اس سے چارہ نہ تھا۔ ایسا نہ کرتا، تو پناہ کہاں پاتا۔ بیچارے ملّا عبدالقادر بدایونی کا حشر کیا ہوا۔ راست نویسی اور حق گوئی کا صلہ کیسا اچھا ملا؟

سُن! اے بہادر کرنیل، سُن!! اور انصاف کر۔

وہ مورّخ تھا عہدِ رفتہ کا عصرِ حاضر کا تو فسانہ نگار

یا بقول آزاد دہلوی "سچ یہ ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا راز مورخ کا قلم ہے۔ آج کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی باگ میں کتنی گرہیں ڈال دی گئی تھیں؟"

دوسرا جواب۔ سیماب اکبر آبادی اپنے خطباتِ شاعری میں ظہیر الانشا کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔ عہد جلال الدین محمد اکبر میں جو مردانہ اور زنانہ بازار قلعۂ آگرہ میں لگتا تھا۔ اُسے "اردو" کہتے تھے۔ جہانگیر کے عہد میں بھی یہ بازار آباد رہا۔ وہاں لین دین بدستور اُسی زبان میں ہوتا تھا۔ شاہ جہاں نے اسے اور رونق دی۔[۲۷]

تیسری بات۔ کون نہیں جانتا کہ اپنی اپنی ذاتی یا قومی تقریبات میں اونچے اونچے طبقے اور ادنیٰ ادنیٰ جماعتیں کم و بیش سب ہی خوشیاں، ہر طرح کی خوشیاں منائیں اور عیش و عشرت کی داد دیتی

---

[۲۷] کلیم عجم، صفحہ ۱۲، رفاہ عام پریس۔

تھیں۔ لیکن تاریخ کے صفحات بتاتے ہیں کہ یہ نشاط عام کے سرکاری موقعے، خواص و امرا کے باوقار مجمعے، شہنشاہی جلوس اور جشن عموماً شرافت و متانت، عفت و عصمت کی بازی گاہ بلکہ مقتل ہوتے تھے۔ وہاں نہ کسی قانونِ شرم و حجاب کی پابندی کی جاتی تھی۔ نہ غیرت و عزت کا آئین نافذ رہتا تھا۔[۲۷۳]

اکبر کی خوش اعمالی و پرہیزگاری کا ایک واقعہ اِس وقت صرف ایک ہی ٹاڈ صاحب کے ذریعہ سے اور سُن لیجئے۔ جن کی تاریخ کے مستند و معتبر ہونے کے بڑے بڑے قائل ہیں۔ جس کو کرنیل ٹے لیس پُر بدائع اور سحر کار تالیف بتاتے ہیں۔[۲۷۴] اس کے بعد نفسِ معاملہ یا اس مبحث و تحریر سے اس روایت (منقولہ ذیل) کا تعلق دو لفظوں میں عرض کر دوں گا۔ تاکہ قارئانِ کرام دخلِ بیجا اور نامعقولیت کا الزام میرے سر سے اُٹھا سکیں۔ ٹاڈ صاحب کے سحر نگار مترجم، ایک باکمال کا نسیحہ انشا پرداز تھے۔ ان کے ترجمہ میں روانی، سلاست، سادگی اور اختصار نمایاں ہے۔ بخلاف اس کے اصل انگریزی میں زورِ بیان کے ساتھ ساتھ واقعہ کی نزاکت کا احساس، فریقین کے مراتب کا پاس،

---

[۲۷۳] دربار اکبری، صفحہ ۵۳۷۔ بیل کی ڈکشنری، صفحات ۴۷ و ۱۲۹

[۲۷۴] اکبر اور سلطنت مغلیہ کا عروج صفحہ ۱۸۱

اُن کا تہتیہؔ و عزم، زبان کا لوچ، شگفتگی اور کافی صراحت و بلاغت نظر آتی ہے۔ ایسے موقعوں پر کسی تائید غیبی کا خود بخود ہو جانا، فطرت سے بالاتر کسی ہستی کا ناگہاں وارد ہونا ہماری قدیم داستان سرائی کا خمِ اعظم ہیں۔ کرنیل ٹاڈ نے یہ لکھ کر کہ بہت سی افسانہ نما کرامتیں اس واقعہ کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہیں، کم سے کم۔ ایک روایت کو تو زندہ کر دیا ہے، جو اس سلسلہ میں شہرت پا گئی تھی۔ یعنی میواڑ کی محافظ دیبی "ماتا" اپنے شیر پر سوار ہو کر با ہمہ ہیبت و جبروت اس موقع پر رانی کے بچانے کے لیے تیکا یک پہنچ گئی تھی۔[۲۷۶] مختصر یہ ہے کہ اس نوروز کے میلہ کے سلسلہ میں اکبر کے اطوار و اعمال پر ٹاڈ صاحب نے خوب زہر اگلا ہے۔

جناب افق لکھنوی کی تحریر یہ ہے:۔[۲۷۷]

"رباب ۱۱۔ تواریخ میواڑ۔ عنوان۔ نوروز پر اکبر کے افعال و اعمال۔ پرتھی راج[۲۷۸] کی رانی سکتا کی بیٹی اور میواڑ کی راجکماری تھی۔ ایک خوش روز کے میلے میں اکبر اُس کا حسنِ دل فریب دیکھ کر بے قابو ہو گیا۔ طبیعت

---

[۲۷۵] انگریزی، صفحہ ۲۹۱ و ۳۰۲، مطبوعہ ۱۹۲۰ء [۲۷۶] ٹاڈ کی انگریزی تاریخ صفحات ۲۹۰-۲۹۱۔ [۲۷۷] دیکھئے فرہنگ و حواشی نوٹ ۴۰۔ [۲۷۸] دیکھئے فرہنگ و حواشی نوٹ ۴۱۔

آئی اور بُری طرح آئی حصولِ مقصد و کامیابی کے لئے ہر طرح سے جدّ و جہد کی۔ اکبر کی آغوشِ محبت میں ایک راجپوت خاندان کی لڑکی تھی کہا جاتا ہے کہ اکبر نے اُسکو بھی مدعائے دل حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا تھا۔[۲۷۹]"

"پرتھی راج کی عورت جس وقت میلہ دیکھ کر لوٹی، تو ایک ایسی بھول بھلیاں میں پھنسا دی گئی جہاں سے نکلنا دشوار تھا۔ وہ اِدھر اُدھر ٹاپتی ہی تھی کہ اکبر وہیں موجود ہو گیا۔ رانی صاحب عصمت تھی۔ شرارت پر اُس کو غصہ آیا۔ فوراً میان سے تلوار نکال لی۔ بادشاہ کے سینہ پر رکھ کر بولی "ہاں! کیا کہتے ہو۔ حرکات ناشائستہ سے توبہ کرتے ہو کہ نہیں۔ اکبر نے اُسی وقت معافی مانگی کہ اب کبھی ایسی حرکت نہ ہوگی۔[۲۸۰]" دراز دستی ایں کوتہ آستیناں بیں۔[۲۸۱]

"پرتھی راج کی بی بی اپنی ہمت و جرأت سے صاف بچ نکلی۔ مگر اس کے بڑے بھائی رام سنگھ[۲۸۲] کے ماتھے پر بدنامی نے کلنگ لگا ہی دیا۔ بادشاہ کے ٹکڑوں میں آ کر اُس نے غیرت و عزت کھو دی۔ ریگستان میں گھر تھا۔ وہ جس وقت آئی زیور و جواہرات

---

۲۷۹ ٹاڈ کا راجستھان مترجمہ اشفاق، صفحہ ۶۳۶ - ۲۸۰ ایضاً صفحہ ۶۳۷ -

۲۸۱ دیکھئے فرہنگ حواشی نوٹ ۴۲ - ۲۸۲ دیکھئے فرہنگ حواشی نوٹ ۴۳ -

میں غرق تھی۔ پرتھی راج نے اس معاملہ کا جو ذکر کیا ہے سننے کے قابل ہے۔ وہ اپنے بھائی سے مخاطب ہے کہ "آپ کی ہم خوابہ[۲۸۳] فرشِ راحت زر و جواہر سے لدی ہوئی آئی۔ زیوروں کے گھنگرو چھن چھن کر رہے تھے۔ مگر بھائی صاحب! ذرا آئینہ میں اپنی موچھیں تو دیکھئے۔[۲۸۴] یہ تشریف لے گئیں۔[۲۸۵]"

یہ کرنیل ٹاڈ کی روایت تھی جو ایک ہندو انشا پرداز نے اپنے قلم سے صفحات کاغذ پر مرتسم فرمائی تھی۔[۲۸۶] اسی پورے واقعہ کو تھوڑے سے لفظی اُولٹ پھیر کے ساتھ ایک نامور پنجابی محقق نے اپنی "تاریخ راجستھان" میں نقل کیا ہے۔ "تاریخ نگار ہندو ہے۔ اردو کے قالب میں اس کو ڈھلنے والا بھی ہندو۔ اس سے بڑھ کر کون سی تحریر مستند ہو سکتی ہے۔[۲۸۷]

---

[۲۸۳] ہم خوابہ کی ترکیب صحیح ہے۔ آئینِ اکبری، جلد سوم، صفحہ ۱۵۲۔ نیز فرہنگ شمس نثار دا: صفحہ ۴۱۔ آخر کی ہ زائدہ ہے۔ غیاث اللغات، فصل ہا مع میم۔ در صفحہ ۸۹ سنگ فارسی در مجلہ کابل، نمبر ۲، ۱۰، ماہ سنبلہ ۱۳۱۸ ہجری شمسی۔ [۲۸۴] دیکھئے فرہنگ حواشی نوٹ ۴۴ [۲۸۵] ٹاڈ کا راجستھان، صفحہ ۶۳۷۔ مترجم۔ انگریزی، صفحہ ۲۰۴، طبع ۱۹۲۰ء۔ نیز پرتھی راج کے اشعار جو موزوں کر کے پرتاپ رانا کو بھیجے تھے۔ ٹاڈ صاحب، جلد اول، صفحہ ۳۹۹ [۲۸۶] نقش لیا ہوا۔ [۲۸۷] تاریخ راجستھان، بھائی پرتانند، صفحہ ۲۷۰

"اکبر اپنی تفریح طبع کے لئے ہر ماہ میں ایک بار محلوں میں مینا بازار لگایا کرتا تھا۔ اس بازار میں مردوں کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ صرف بیگمات، شہزادیاں اور درباریوں کی بہو بیٹیاں جایا کرتی تھیں۔ اور وہاں سوداگروں کی بیویاں مُلک مُلک کی اشیاء لاکر بیچا کرتی تھیں۔ اکبر عورتوں کا بھیس بنا کر یہاں جایا کرتا تھا۔ مغل مورخ کہتے ہیں کہ اس سے بادشاہ کی مُراد اپنے معلومات کو وسیع کرنا تھا۔ اور اس سے اُسے اپنے افسروں کی بابت پتا لگتا رہتا تھا۔ مگر راجپوتوں کا خیال اور تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اکبر اس طرح سے خوبصورت عورتوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اسی وجہ سے بُوندی کے راجہ نے رن تھم بور کا قلعہ حوالہ کرتے وقت یہ شرط کرائی تھی کہ بُوندی کی بہو بیٹیوں کو مینا بازار میں جانے سے مستثنیٰ کیا جائے"۔

"رماے سنگھ کی بیوی حسین تھی۔ اکبر کی اُس پر آنکھ پڑی۔ اور نتیجہ خراب نکلا۔ وہ جواہرات سے لدی ہوئی گھر واپس آئی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ایک دن اکبر نے پرتھوی راج کی بیوی کو دیکھ لیا۔ جب وہ سودا وغیرہ خرید کر ایک تنگ راستہ سے اکیلی واپس آ رہی تھی، راستہ جان بوجھ کر پیچ دار بنا یا گیا تھا۔ خاموشی کے عالم میں اُسے اچانک ایک آواز سی سنائی دی۔ ایک آدمی اُس کا راستہ روکے ہوئے

سامنے کھڑا تھا۔

وہ تاڑ گئی۔ یہ کون شخص ہے۔ اور اس کی غرض کیا ہے؟ وہ بیچاری گھبرا گئی۔ مگر اپنے دل میں "دیوی ماتا" کو یاد کیا اور کہا "ماتا! اس وقت میری سہایتا کر اور اس خطرہ سے بھی بچا۔ جو موت سے بھی بُرا ہے۔" اس کی کمر میں خنجر تھا۔ اُسے نکالا اور بادشاہ پر ایسی جھپٹی کہ اُسے نیچے گرا کر خنجر اُس کی گردن پر رکھ دیا۔ "اگر زندگی پیاری ہے تو قسم کھاؤ کہ آج سے کسی راجپوتنی کی طرف بُری نگاہ نہ کرو گے۔" بادشاہ نے قسم کھائی۔ اور شرمندگی سے پھیرا ہوا دوسری جانب نکل گیا۔

پرتھوی راج کو اپنی پیاری بیوی پر کہ راجپوتنی فخر ہوا۔ اگرچہ وہ اس کے بھائی کی بیوی کی طرح زیور و جواہرات سے لدی ہوئی نہ آئی تھی۔ وہ اس کڑے امتحان میں اس آبرو سے نکلی جو سب قسم کے زیبوں سے بالاتر ہے[۲۸۸]۔

یہ پرتھوی راج بڑا شاعر اور اپنی زبان کی نظم و نثر پر بڑا قادر تھا۔ اس نے جو چٹھی پرتاب کو ــــ ــــ لکھی تھی وہ (حسب روایت بھائی پرمانند) ابھی تک میواڑی زبان کی نظم میں زندہ پائی جاتی ہے[۲۸۹] کہ "اللہ اکبر۔ یہ وہی اکبر ہے جس کے قدسی کلمات کو دلاویز گفتارِ شہنشاہی

---

[۲۸۸] تاریخ راجستھان صفحہ ۳۷۱ [۲۸۹] ایضاً صفحہ ۳۷۱

کے عنوان سے شیخ نے مہماتِ سلطنت کے آئین میں نقل کیا ہے۔ اور جو فرماتا تھا "اگر پیش ازیں دانستمے از قلمرو خود کسے را بہ حرم سرا نیاوردمے کہ رعیت پایۂ فرزندی دارد۔"[29] [پہلے سے جانتا ہوتا تو اپنی بادشاہت میں سے کسی کو اپنے محل میں نہ لاتا۔ رعیت کا پایہ اولاد کے برابر ہوتا ہے۔]

سبحہ بر کف، توبہ بر لب، دل پُر از شوقِ گناہ
معصیت را خندہ می آید بر استغفارِ ما

کہیں آپ کی یہ تلخ کامی اور تلخ نوائی کسی ایسی ہی تلخابہ نوشی کی بدولت تو نہ تھی؟ یا اس قسم کی باتیں بنانا ہمیشہ سے آئینِ سلطنت رانی اور راج نیت چلا آتا ہے!

آزاد دہلوی لکھتے ہیں "یہ سن کر کہ خطا اور تبت میں ترکِ دنیا کرنے والے دو دو سو برس زندہ رہتے ہیں، بادشاہ (اکبر) نے بھی محلوں میں جانا چھوڑ دیا تھا۔"[29]

ع۔ اے دریغا دہ شاہِ شاہد باز

پروفیسر رشید صدیقی کا ایک فقرہ مجھے بے اختیار یاد آتا ہے۔ اپنے مخصوص اندازِ بیان کے ساتھ فرماتے ہیں۔ "کون نہیں جانتا۔

29۔ جلد سوم، صفحہ ۱۹۰، شمارہ ۲۰۱ ۔ 29 قصص ہند حصہ دوم صفحہ ۱۰۱

واجد علی شاہ اور اکبر دونوں مصاحبین کے گمراہ کئے ہوئے تھے۔
لیکن ایک "رنگیلے" اور "رسیا" کے نام سے یاد کئے جائیں اور دوسرا
بگڑ کر "خدا" بن گیا۔[۲۹۲]

ان معترض حریفوں کو عالمِ ارواح سے اکبر کا کیا جواب پہنچا ہی ہوگا؟

من تائب و من زاہد لیکن حکیم دل را ۔ با طائفۂ خوباں دزدیدہ سرے دارد
"آپ کے یک طرفہ فیصلے بجا۔ آپ کی پارسا وضعی، پارسا
خیالی، پارسا گفتاری کے بلند پروازانہ خواب، پاکبازی و پاکدامنی
کے شاندار دعوے آپ کو مبارک۔ رسم و رواج، سوسائٹی اور
سماج کے عمل، سچائی اور نکوئی سے دور، نمایش اور دکھاوے میں
بھر لو پر ہمارے سر آنکھوں پر۔ کوہِ زیتون کے مقدس واعظ کا
خطاب برحق۔ پھر بھی منصفانہ خیالات اور حکیمانہ جذبات کا
یک سر ٹھکرا دینا جائز نہیں۔ ایک نکتہ بیں حقیقت شناس کا قول
سُن لیجئے اور خیال رکھئے کہ "یہ عصمت آپ کی ادعائے عصمت،
انسان کی کوئی بڑی ممدوح و مہتم بالشان صفت نہیں ہے۔ عبرت
کی آنکھیں کھولئے اور دیکھئے کہ دنیا اگر آج معصوم ہو جائے تو کائنات
میں خاک اُڑنے لگے گی یا نہیں۔" اور بقول مرزا غالب مجھے تو "ابتدائے

---

۲۹۲ مضامین رشید، مکتبہ جامعہ ملیہ، صفحہ ۱۵۸۔

شباب میں ایک مرشدِ کامل نے نصیحت کی تھی کہ ہم کو زہد[۲۹۳] و ورع[۲۹۴] منظور نہیں۔ ہم مانع فسق و فجور نہیں"۔[۲۹۵] مرحوم سجاد علی انصاری کا "محشرِ خیال" ملاحظہ کیجئے۔ اور "تجلیات" سے سبق لیجئے۔ کہ "مدعیانِ علم و حکمت عقلمندوں کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں اور مدعیانِ زہد و تصوف بیوقوفوں کو۔۔۔۔۔۔ اعمالِ حسنہ کی تلقین صرف وہ بدمذاق کرسکتا ہے جس میں زاہدِ خشک کی بدنصیبیاں اور جوانِ صالح کی بدتوفیقیاں فطرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہوں۔۔۔۔۔۔"

فرنگستان کے متین مفکر رائین ہولڈ نیبو کا نتیجہ خیز ارشاد بھی پیش نظر ہے جو اپنی فلسفیانہ تصنیف MORAL MAN AND IMMORAL SOCIETY میں ان معلمِ اخلاق حضرات کے اس خیال کی تردید فرماتا ہے کہ "عقلیت کی ترقی یا مذہبی ہمدردی کے نشو و نما سے لوگوں کی خودکامی میں روز بہ روز کمی ہوتی جاتی ہے۔ اور انسانی جماعتوں اور گروہوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے بس یہی کافی ہے کہ اسی عملی ترقی کو جاری رکھا جائے"۔[۲۹۶]

---

[۲۹۳] رغبت کے خلاف کرنا۔ لذاتِ دنیا کی خواہش نہ کرنا۔ [۲۹۴] پرہیزگاری۔
[۲۹۵] طنزیات و مضحکات رشید احمد صدیقی، صفحہ ۲۲۵۔ [۲۹۶] پنڈت جواہر لال نہرو کی "میری کہانی" حصہ دوم صفحہ ۴۵۷

منشی دیبی پرشاد (منصف و مصنف) نے جو جودھپور کے صاحبِ تحقیق تاریخ داں اور تاریخ نگار تھے اسی پرتھی راج اور اسکی رانیوں کی نسبت ایک مزہ دار حکایت حوالۂ قلم فرمائی ہے۔ جس کو مناسبِ محل ہونے کے خیال سے خوش ذوق دوستوں کی خاطر اور سلیقہ مند پڑھنے والوں کی ضیافتِ طبع کے لئے یہاں لفظ بہ لفظ نقل کر دینا ناگزیر سمجھتا ہوں۔ اس میں کچھ اشعار بھی ہیں جو ہمارے مطلب کے ہیں اور جو اُس وقت کی ڈنگل بھاشا کا نیز مارواڑ کے اُس شوقین رئیس کی رنگین بیانی کا اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ دیس کے اونچے اونچے لوگوں بلکہ خود رنواس کی بولی ٹھولی کا ان سے مزہ ملتا ہے۔ رس آتا ہے۔ اِن میں جدّت بھی ہے لطافت بھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ٹاڈ صاحب کی روایت بالا کے جھوٹ سچ ہونے پر بھی اس حکایت سے روشنی پڑتی ہے۔ اس کے امکانِ وقوع کے بارہ میں اس سے پردہ دری بھی ہوتی ہے پردہ داری بھی۔ متوالے راجہ کی عاشق مزاجی چمکیلی چنچل رانی کے البیلے پن کی جھلک بھی صاف نظر آتی ہے۔

"بیکانیر کے راجہ رائے سنگھ کے بھائی پرتھی راج بہت خوش

۲۶؎ اصلی سکونت اجمیر تھی۔ شعرائے ہنود کا تذکرہ بھی خوب لکھا ہے (مندرجہ شعرا صفحہ ۳)

مزاج عالی دماغ اور اپنے زمانہ کے شاعرِ غرّا تھے۔ جن کی شاعری میں کرنیل ٹاڈنے دس ہزار گھوڑوں کی طاقت لکھی ہے۔ کیونکہ اُس کو پڑھ کر مہارانا پرتاب سنگھ کی طبیعت میں بہادری کا ایسا جوش پیدا ہو گیا تھا جو دس ہزار سواروں کی جمعیت ساتھ ہونے کی صورت میں ممکن تھا۔

"خوش قسمتی سے ان کو رانی بھی ویسی ہی رنگین خیال شیریں مقال، نکتہ سنج اور یہ بہہ گو ملی تھی۔ جس کا نام چاپنادی تھا اور جو جیسلمیر کے راول راج کی بیٹی تھی۔ مگر چاپنادی کی شادی ہونے سے پہلے پرتھی راج کی رانی پہلی لالاں دئی تھی۔ لیکن وہ عین جوانی میں اس عالمِ فانی سے گزر کر داغِ مفارقت جاودانی دے گئی تھی۔"

"پرتھی راج نے اُس کے نازک جسم اور پاکیزہ استخوانوں کو آگ میں جلتا دیکھ کر فرطِ رنج و غم سے یہ دوہا کہا:۔

تو راندھو نہیں کھاؤں شاں رے باسدیو نسڈّ

तो रांधो नहिं खावशां, रे बासदेव नसड्ड

مو دیکھت تو بالیا لاگر ہندا ہڈّ

मो दीखत तो बालिया, लालर हन्दा हड्ड

"یعنی اے بے باک و ناپاک آگ! اب میں تیرا پکایا ہوا نہیں کھاؤں گا۔ کیونکہ میرے دیکھتے دیکھتے تو نے لالاں کے استخوان کو

جلایا ہے۔ اُس دن سے پرتھی راج نے بیکلا ہوا کھانا چھوڑ دیا۔ صرف دودھ پی پی کر رہتے تھے اور لالاں دئی کو یاد کرکے رویا کرتے تھے۔ اکبر بادشاہ نے یہ ماجرا سنکر بہت افسوس کیا۔ کیونکہ وہ اُن کے جلیسوں میں سے تھے اور سمجھا کر یہ شادی کرادی۔ پرتھی راج اُسوقت ادھیڑ تھے اور چاپا دئی رانی جوان تھی اور ایسی رنگیلی چھبیلی کھلاڑن اور صاحب شعور تھی کہ پرتھی راج اُس کی رنگ رلیوں اور خوش صحبتوں سے لالاں دئی کو بھول گئے اور اُس کے ساتھ بڑی خورمی اور بےغمی سے رہنے لگے۔ اُس کی جدائی دم بھر کے لیے بھی ان کو گوارا نہیں ہوتی تھی۔ جب کبھی اُسکو ذرا بھی نہیں دیکھتے تھے تو بیقرار ہو جاتے تھے اور اُس عالم میں سوزِ فراق اور شوقِ دیدار کے اشعار حسرت آثار کہنے لگتے تھے۔ جو بہت پُر مضمون اور بامزہ بھی ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک یہاں بھی لکھا جاتا ہے۔

چاپا تو ہر راج ری ہنس کر بدن دکھائے

चानपा तू हरराज री, हंस कर बदन दिखाय

مُومَن پات کو پات جیون کبھو تر بیت نا بھائے

[illegible] पात को पात जेयों कबहु [illegible] ना भाय

یعنی "اے رادل ہر راج کی صاحبزادی چاپا دئی رانی! تو ہنس کر

مجکو اپنا منہ دکھا۔ کیونکہ جیسے طامع اور حریص شاعر کبھی قانع و صابر نہیں ہوتا ہو ویسے ہی مجھے بھی تیرے دیدار سے ہرگز سیری نہیں ہوتی ہے۔"

"ایک دن شیریں آپ شیش محل میں بیٹھے ہوئے آئینہ دیکھ رہے تھے۔ اتفاق سے ایک سفید بال داڑھی میں نظر آگیا تو جھٹ بڑی پھرتی سے اکھاڑ ڈالا تاکہ رانی دیکھ نہ پائے۔ اور اپنے دل میں بوڑھا نہ سمجھ لے۔ مگر شوخ و شنگ رانی تو سایہ کی طرح پیچھے ہی کھڑی تھی جس کی ان کو خبر نہ تھی۔ وہ ان کو اس ادا سے بال اکھاڑتے دیکھتے ہی منہ موڑ کر ہنسی اور حیا سے چپ ہو گئی۔ برتھی راج نے جو آئینہ میں اس خوش ادائی کا عکس دیکھا تو شرما کر یہ شعر کہا:۔

پیتھل پلی چمکیاں بوہسلی لاگی کھوڑ

पीथल पली चमकियाँ बहुसली लागी खोड़

پورے جوبن پدمنی ہنسی کرے کھ موڑ

पूरे जोबन पदमनी, हसी करे मुख मोड़

یعنی اسے برتھی راج سفیدی جھلک آنے سے جوانی میں بڑا داغ لگ گیا۔ پدمنی یعنی حسین و نازنین رانی جو جوانی میں دوانی ہو رہی ہی منہ موڑ کر

شہ ۲۰۴ ظریف۔ شوخ۔ زیبا۔ عیّار۔

ہنستی ہے۔"

چنانچہ چمپادے رانی شاعرہ بھی تھی اور سخن سنجی و معنی آفرینی سے اپنے
شاعر شیوا زبان شوہر کی تصنیفات میں مدد بھی دیا کرتی تھی۔ یہ شعر
سن کر اُن کی قائلی اور شرمندگی شکست کے لئے برجستہ کہنے لگی کہ نہیں
صاحب جی یوں نہیں یوں ہے۔ دوہا

پیاری کہے پیتھل سنو دھولاں دس مت جو

प्यारी कहै पीथल सुनो धवलाँ दिस मत जोय

نراں ناہراں ڈگمراں پاکاں ہی رس ہو

नरां नाहरां डिगमरां पाकाँ ही रस होय

یعنی پیاری رانی کہتی ہے "سنو راجہ پرتھی راج۔ سفیدی کی طرف
مت دیکھو اس کا کچھ اندیشہ کرو۔ کیونکہ وہ پختگی عقل و آدمیت
کی دلیل ہے۔ آدمی شیر اور مرتاض[۲۹۹] پختہ عمر ہونے پر ہی کامل ہوتا ہے۔"

کھیڑج پکا دھوریاں پنتھ جو گگہاں پاو

खेड़ज पक्का धोरयाँ पंथ जो गगहाँ पाव

نراں ترنگاں بن پھلاں پکا پکا ساو

नरां तुरंगां बन फलां, पक्का पक्का साव ।

---

[۲۹۹] ریاضت کرنے والا۔ نفس سرکش کو قابو میں لانے والا

یعنی کھیتی کئے بیلوں سے ہوتی ہے۔ رستہ پختہ اونٹوں کے پاؤں سے
ہی کٹتا ہے۔ آدمی گھوڑے اور پھل پک کر ہی پورے پکے ہوتے ہیں[299]۔"
میں نہیں کہہ سکتا کہ ان دونوں میں سے وہ کون سی فتح مند رانی
تھی، جس کے رعبِ حسن، جلالِ جمال اور آبِ شمشیر سے اکبر کا دبدبہ
و جبروت بھی تھرا گیا تھا۔ قیاس قوی یہ ہے کہ چمپا دیوی رہی ہوگی۔
پڑھنے والے عزیزو! اگر آپ کو اس داستانِ پاستان[300] میں کوئی
لطف نہ آیا ہو، مزہ نہ ملا ہو تو بھی بد مذاق لکھنے والے کو یہی سمجھ کر
معاف کر دینا کہ یہ ایک رانی کا ماجرا ہے۔ اور ہر رانی کی ہر ایک کہانی
رنگین ہوتی ہے۔ بھولے بھالے بچوں تک کو محو و مفتون[301] بنا لیتی ہے تھپک
تھپک کر سلا دیتی ہے۔

اس پیاری تصویر کا دوسرا رُخ بھی ملاحظے کے قابل ہے۔ ہندوستان
کے نامور تاریخ نویس پنڈت کلہن کی تاریخ سنسکرت میں ہے[302]۔ تصحیح
و ترتیب جدید کے بعد اس کا ترجمہ شگفتہ انداز سے ٹھاکر اچھر چند
نے کیا اور "مکمل راج ترنگنی" کے نام سے شائع فرمایا ہے[303]۔ معلوم ہوتا
ہے کہ یہ زبردست فلسفی اور حقائق آشنا عورتوں کے متعلق اچھی رائے

نمبر ۲۹۹ رسالہ صلائے عام دہلی ماہ جون ۱۹۱۵ء صفحات ۳۹ تا ۴۱۔ نمبر ۳۰۰ قدیم۔ گرویدہ ہوا۔ کہنہ
نمبر ۳۰۱ شیفتہ، عاشق، نسخہ میں پڑھا ہوا۔ نمبر ۳۰۲ و ۳۰۳ دیکھئے فرہنگ، حواشی نوٹ ۴۵

نہ رکھتا تھا۔ وہ ان (میں سے بعض) کے ستی ہو جانے اور شوہروں پر
جان دیدینے میں بھی خلوص اور سچائی کی جھلک نہیں دیکھتا تھا۔ فرماتا ہے
"کوئی شخص عورتوں کے دلوں کی تہ تک نہیں پہنچ سکتا، جنکی زلفوں
میں خم، آنکھوں میں چنچلپا اور ابھری ہوئی چھاتیوں میں سختی ہوتی ہے۔
باوجود بے وفا[305] ہونے اور اپنے شوہروں کو مار دینے کے وہ بے پروائی
سے آگ میں اتر پڑتی ہیں۔ واقعی عورت کی فطرت کے متعلق کسی
شخص کو یقین نہیں ہو سکتا۔[306]"

مجھے تسلیم ہے کہ ایک فیلسوفِ حقیقت بیں اور ایک دیوانہ نکتہ چیں
میں میں کبھی امتیاز نہ کر سکا۔ لیکن اس بلند نظر حکیم کے نظریہ نے
تو مجھے بالکل مبہوت بنا دیا ہے۔ کلہن پنڈت ہندو تھے۔ اور ہندو
دھرم، ہندو سماج، ہندو رسم و رواج کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ تمام
تر جذب و الفت ہے۔ انس و محبت، پریم اور بھگتی کے سوا سروکار
نہیں رکھتا۔ اس کی پیشانی پہ ایک نگہ افروز[307] قشقہ[308] کی جگہ یہ
کالک کا ٹیکا! اسی بات کو، انھیں روایات کو انہوں کی نہیں پرایوں او

---

۳۰۵ دیکھیے فرہنگ ترجمہ، نوٹ ۶۴ ۳۰۶ جلد دوم، صفحہ ۵۷، سبوگ اسٹیم پریس
لاہور ۱۹۱۲ء ۳۰۷ حیران۔ ۳۰۸ نشانی جو ہندو اپنے ملک میں ہنسے ہوئے
پیشانی پر صندل وغیرہ سے لگا لیتے ہیں۔ ٹیکا۔

پردیسیوں کی زبانی بارہا سن چکا ہوں۔ قسطنطنیہ کا جلیل القدر جہاں گرد
شاعر لوئیس بکسا البری الصابونجی "ستی" پر عربی میں سوگوارانہ نظم لکھ کر
بقائے دوام کی سند لے گیا ہے۔[۳۰۹] نازشِ انگلستان کپتان ڈیوڈ لسٹر
(DAVID LISTER) سے پوچھیے۔ ان کی "ہندوستانی ستی"
کا ایک ہی بند پنڈت جی کی تمام فصاحت و بلاغت کا خاموش مگر
لفظاً بہ لفظاً جواب ہے

SHE MOUNTS WITH DAUNT-LESS MIEN, THE FU-

-NERAL PILE

WHERE LIES HER EARTHLY LORD

OR WANDERS THOUGHT FULLY BY GANGES SHORE

WHILE THE BRORAD SUNN UPON THE SLUMBER-

-ING WAVE

ITS LAST FAINT FLUSH OF GOLDEN RADIANCE

GAVE

AND TINGED WITH TENDEREST HUE SOME RUINS

HOAR.

---

[۳۰۹] دیکھیے فرہنگ و حواشی نوٹ ۱۵۹ [۳۱۰] دیوان شعر الخنسہ مطبوعہ اسکندریہ سنہ ۱۹۰۴ جلد دوم

بخیر ہو اور با برکت تیرا انجام اے ستی! ایرانی شاعر نے تیری نسبت فرمایا
اور صحیح فرمایا ہے۔ تیری قسمت پر موتیوں کے آنسو بہائے ہیں۔

در محبت ہم چو ہندو زن کسے دیوانہ نیست[۳۱۱]
سوختن بر شمعِ مردہ کارِ ہر پروانہ نیست

کتنی معقول اور سچی ستایش ہے۔ میرے بھولے بھالے برہمن!
اب تو اقرار کر کہ ع۔ حسن با مہر و وفا بیگانہ نیست
یاد ہو کہ اس سے بھی پہلے ہمارے ملک کے سحر گو، نابغۂ نازش
سخنور نے اس کی تعریف میں کہا تھا:-

خسروا در عشقبازی کم ز ہندو زن مباش
کز برائے مردہ سوزد زندہ جانِ خویش را[۳۱۲]

اور اس کے بعد تو ایک دوسرے باکمال نے جس کا نام تحقیق نہ ہو سکا، کمال کر دیا ہے۔

مبیں نقصِ زنِ ہند و کمالِ عشق را بنگر
کہ با نقصِ زنی خود را چہ ساں مردانہ می سوزد

چار سو برس پیشتر ظہور نیر جیسے وسیع النظر سیاح نے بھی ان کی دری

---

۳۱۱ در محبت چوں زن ہندی کسے مردانہ نیست
مخزن ادب، صفحہ ۹۳۔ ۳۱۲ خزانہ عامرہ، نول کشوری، صفحہ ۲۰۸۔

اور خوشی سے مرد کے ساتھ مٹی میں زندہ دفن ہو جانے یا آگ میں شوہر کی چتا پر جل جانے کی تحسین و آفرین[۳۱۳] کی تھی۔ البتہ اسی کے ساتھ بادشاہی ممانعت کا بھی تذکرہ کر دیا تھا[۳۱۴]

مسٹر کول بروک (COLEBROOKE)[۳۱۵] نے تو ایک پوری کتاب "ستی" کے متعلق اور اس کے خالی مقبروں (CENOTAPHS) کے بابت "ایک وفادار بیوہ کے فرائض" کے نام سے لکھ ڈالی تھی۔

مسز سروجنی نائیڈو کی شیریں نوائی سنئیے، یہ شاعرہ جس کا وقار مشرق و مغرب سے یکساں خراجِ تحسین وصول کرتا رہتا ہے جس کی دنیا محض دنیائے شعر ہے "ستی" کے بارہ میں اپنے جذبات و خیالات کو بالکل ایشیائی انداز سے پوری خوبی و لطافت کے ساتھ ادا کرچکی ہے۔ ایک فقرہ سن لیجئے اُس وقت کا جب وہ بھی جوان تھی اور اُس کی شاعری بھی۔ اور تبصرہ نگار بھی ایک جوان شاعرہ کی مضمون آفرینی اور نازک تخیل کی داد دینے کے لئے جوان تھا۔

"ہم دونوں حقیقت میں ایک ہی وجود تھے، دو کر دیا۔ کیا جسم

---

۳۱۳ سیاحت نامہ، مطبوعہ آگرہ، صفحہ ۶۰۔ ٹیورنیر کے لئے ملاحظہ ہو نوٹ ۴۸

۳۱۴ صفحہ ۶۱، سلسلۂ آصفیہ جلد اول، مطبوعہ ۱۸۹۶ء، آگرہ۔

۳۱۵ دیکھیے فرہنگ، حواشی۔ نوٹ ۴۹۔

باقی رہے گا جبکہ روح رخصت ہو چکی ہو؟" [۳۱۶]

بارنٹ صاحب (BARNETT) اس رسم ستی کا ہندوستان کی پرانی باتوں کے ذیل میں تذکرہ فرماتے ہیں۔ [۳۱۷]

ٹاڈ صاحب لکھتے ہیں کہ ہندو قانون سازوں نے ستی ہونے کی ترغیب دلائی تھی۔ [۳۱۸] مسٹر پورن چندر ماجو مدار کو اس سے انکار ہے۔ اپنی انگریزی تاریخ "مسندِ مرشد آباد" میں تحریر کرتے ہیں کہ ستی ہونے کی اجازت شاستر سے پائی نہیں جاتی۔ [۳۱۹] بہرصورت (اکبر نے ستی ہونا بند یا کم کرا دیا تھا) جہانگیر نے تحریری احکام امتناعی صادر کیے [۳۲۰] [انگریزوں کی عمل داری میں یہ رسم قطعًا معدوم ہو گئی۔]

میڈیم راگوزین کا خیال یہ ہے کہ ستی کی ظالمانہ رسم کو مذہب سے منسوب کرنے میں برہمنوں نے سخت غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ [۳۲۱] وہ لکھتی ہیں کہ رگ وید کے رو سے ستی جائز نہیں ہے [۳۲۲]

مذکورہ بالا اختلافات کا رفع کرنا اور مذہبی روایات کی جانچ

---

[۳۱۶] تعلیم آگرہ نمبر ۷ جلد چہارم صفحہ ۳۲۳ اکتوبر ۱۹۱۶ء۔

[۳۱۷] BARNETT'S ANTIQUITIES OF INDIA صنادید ہند صفحہ ۱۲۰۔

[۳۱۸] راجستھان انگریزی صفحہ ۶۴۵ نوٹ۔ [۳۱۹] صفحہ ۱۵۷ [۳۲۰] راجستھان صفحہ ۶۴۷ نوٹ۔ [۳۲۱] ویدک ہند مترجمہ جامعہ عثمانیہ ۱۹۲۳ء صفحہ ۱۴۱۔ [۳۲۲] ایضًا صفحات ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳ نوٹ۔

پرتال پڑھے بڑے گن وان ودیا بھوشن پنڈتوں کا کام ہے۔ لیکن جیسا کہ زمانہ حال کا ایک ذہین مصنف لکھتا ہے۔ اب یہ کوئی چھپا ہوا بھید نہیں رہا کہ ہندوؤں کے دینی و دنیوی آئین کے بموجب مورث کی وفات پر مرد تو لاکھوں بلکہ کروڑوں تک کے حقدار ہو جاتے تھے، مگر عورت قطعاً محروم رہتی تھی۔ اس کے حصہ میں پھوٹی کوڑی بھی نہ آتی تھی۔ صرف وہ سامان اور تحائف جو شادی وغیرہ کے موقع پر جہیز کے طور پر عورت کو دیئے جاتے تھے، اُس کی ملکیت سمجھے جاتے۔ اُس کے پاس رہ جاتے اور "استری دھن" کے عظیم الشان اور قابل احترام نام سے پکارے جاتے تھے۔ ہوشیار مردوں نے ان کے بھی ہضم کر لینے کے لئے چال چلی۔ ستی کی ظالمانہ ترکیب یا رسم ایجاد کی۔ خاوند کے مرنے کے بعد بیوہ کو اُس کے ساتھ ہی جلا کر خاک سیاہ کر دینا ٹھہرا۔ پھر کیا تھا، خاوند کے ورثہ عورت کی ذاتی جائداد پر بھی دستِ تصرف دراز فرمانے لگے۔[۲۳]

فلالوجی یا علم الالسنہ کا ایک نکتہ۔ بیوہ کسی ملک یا نسل یا خاندان میں نہیں ہوتی۔ بیوگی کا وجود خاندانوں کے ساتھ زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے۔ آریائی زبانوں میں جو الفاظ اس کے لئے پائے جاتے

---

[۲۳] رسالہ تہذیب لاہور، فروری ۱۹۳۴ء صفحہ ۲۵ از مسٹر کے ایل حمید بار ایٹ لا

ہیں بالکل مماثل[۳۲۴] اور تقریباً متحد الصوت[۳۲۵] ہیں۔

(۱) سنسکرت ودھوا (۲) جرمن وِٹ وِی (۳) روسی وِدُووا
(۴) لاطینی وِیدُوا (۵) اطالی وِیدُووا (۶) ہسپانی وِیُودا
(۷) فرانسیسی وِیُوو } بگڑا ہوا۔ لفظی معنی "بغیر شوہر والی[۳۲۶]"

غیر متعلق سہی مگر اسی سلسلہ میں بتا دینا ضرور ہے کہ "ستی" یا "ستی چونرا[۳۲۷]"
کا رواج مسلمانوں کے کسی طبقہ میں کبھی نہیں ہوا۔ اس کی منفرد ایک
ہی مثال ملتی ہے کہ ۱۷۹۰ء میں ایک مسلمان عورت اپنے شوہر کی
نعش کے ساتھ زندہ دفن ہو گئی تھی۔ اور یہ واقعہ بھی کہیں اور کا کہ
اس کے سوا کوئی اطلاع پرانے اخبارات سرکاری کاغذات[۳۲۸] و دفاتر
میں نہیں پائی جاتی۔

خیال رہے کہ مجموعی مقدار اور خوبی اور اپنی کیفیت و اثر کے اعتبار
سے بہت زیادہ قابل لحاظ اور لائق قدر وہ لٹریچر ہے جو "ستی" ہی کے
عنوان سے اردو کے باکمال ادیبوں اور سحر کار شاعروں نے اوراق
روزگار پر فراہم کر دیا ہے۔ ہندو ہوں یا مسلمان دونوں یکساں آب دیدہ

---

۳۲۴ برابر۔ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ۳۲۵ ایک ہی آواز والے ۳۲۶ ویدک ہند،
جامعہ عثمانیہ صفحہ ۴۱۔ ۳۲۷ ستی ہونے کی جگہ چتا۔ ۳۲۸ مسند مرشد آباد صفحہ
۱۵۷، بحوالہ کلکتہ گزٹ مورخہ ۲۹ جولائی سال مذکور۔

متنافرِ نظر آتے ہیں۔ جو شوہر[329] پہ مرنے والی جماعت کو "بے وفا" و "بے مہر"
کے نام سے یاد کرنا آئینِ شرافت و مردانگی سے بعید ہے۔

میر غلام علی آزاد بلگرامی[330] نے مشہور پرند ققنس کی تحقیق اور عدم وجود
کے سلسلے میں یہ رائے قائم کی ہے کہ "ہمارے ہندوستان کا ققنس یہی
"ستی" ہے۔ یعنی ہندو عورت جو شوہر کے مرنے کے بعد اپنے کو
پُر تکلف لباس اور زیور سے آراستہ کرتی، شوہر کی لاش کو گود میں لیتی،
چتا میں بیٹھ جاتی، اور اپنے ہی ہاتھ سے لکڑیوں میں آگ لگا دیتی ہے۔ مردہ
شوہر کے ساتھ جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ یہ آنکھوں دیکھی باتیں ہیں۔ بارہا
مشاہدہ[331] کر چکا ہوں۔

ع۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ

ققنس اپنے جوڑے کے نہ ہونے سے خود کو جلا لیتا ہے۔ ستی جوڑے کے
فوت ہو جانے سے اپنے کو جلا لیتی ہے۔ کہاں ستی کی ہمت اور کہاں ققنس
کا حوصلہ۔ ققنس کا عمل جبلی و طبعی ہے، ستی کا قطعاً غیر طبعی"۔ امیر خسرو
دہلوی[332] نے اسی مضمون کو ایک ہندی دوہے میں کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

۳۲۹۔ دیکھیے فرہنگ حواشی نوٹ ۵۰۔ ۳۳۰۔ خزانۂ عامرہ، صفحہ ۲۰۸۔
۳۳۱۔ دیکھنا، کسی موقع پر موجود ہونا۔ ۳۳۲۔ باکمال شاعر و مثنوی نگار۔
۲۵ شوال، ستمبر سنہ ۱۳۲۵ء میں وفات پائی۔

خسرو ایسی پیت کر جیسے ہندو جوئے
پت پرائے کارنے جل جل کوئلا ہوئے[۳۲۳]

ان ہی میر صاحب (آزاد) کی روایت، اکبر آباد، آگرہ کی بات ہے۔ اکبر اکبر کا عہد تھا۔ کسی خوش نصیب ہندو نوجوان کے بیاہ کی رات تھی۔ بدنصیب چھتے (مُسَقَّف بازار) سے گزر رہا تھا۔ چھت گری۔ نوجوان ہلاک، خون وخاک ہوا۔ نامراد دلہن نہایت رعنا، کمال خوش سیما تھی۔ برادری کے دستور یا اپنے آئین کے مطابق حسرت و عبرت مجسم دلہا کے ساتھ جلنے مرنے کو تیار ہو گئی۔ بادشاہ نے بلایا۔ سمجھایا۔ روکا۔ وعدے فرمائے۔ ناز و نعمت کی بہت سی امیدیں دلائیں۔ غم نصیب اپنی پامردی سے کب ہٹنے والی تھی۔ دل کی مضبوط تھی۔ ہمت نہ ہاری۔ پروانہ بن کر آگ میں گھس گئی۔ پھنک گئی۔[۳۲۴]
ملا نوعی خبوشانی، ایک دل جلے من چلے شاعر، شاہزادہ دانیال کے

---

۳۲۳ چمنستان شعراء، صفحہ ۱۰۲۔ ۳۲۴ نوعی کا قابل فخر کارنامہ ایک ساقی نامہ ہے جس کے صلہ میں مرزا عبدالرحیم خان خاناں نے اس کو دس ہزار روپئے اور ہاتھی گھوڑے عنایت کئے تھے۔ نوعی کا دیوان بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتاب خانہ میں محفوظ ہے۔ ساقی نامہ پروفیسر محمد شفیع کے درست کردہ مطبوعہ "میخانہ" میں موجود ہے۔ (معارف اکتوبر ۱۹۴۱ء نمبر ۴ جلد ۴۸ صفحہ ۱-۳۰۷) ۳۲۵ دیکھئے فرہنگ جہانگیری، دو صفحہ ۵۱

متوسل تھے۔ اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے۔ اُدھر آغا کا ایما شدید
شوق پہ آگ اور تازیانہ ہوا۔ درد انگیز مثنوی نظم کر دی۔ "سوز و گداز"
نام رکھا۔ ایک شعر آپ بھی سن لیں اور لطفِ تخیل سے سر دھنیں۔

جمالِ ناز را پیرایہ نو کرد   عبادت را تبسم پیشہ ور کرد[۳۴۶]

ہمارے کسی ہم وطن، ادا شناس گوی (شاعر) نے یہ نیاز و ناز،
سوز و ساز کی پوری داستان دو مصرعوں میں کہہ ڈالی ہے۔ وہ بھی
کیسے ہنستے بولتے لفظوں میں۔ حسرت نصیب، جوانی بیزار دلہن
پورے تزک و احتشام کے ساتھ حسن و عشق کا آخری معرکہ سر کرنے
جاتی ہے۔ اپنے بدعہد پیمان شکن کی بے مہری و بے وفائی کا گلہ نہیں
کرتی۔ شاید سمجھتی یا رکھتی ہی نہیں۔ مشک فام مشکبو زلفیں شانوں پہ
بکھری ہیں۔ سوگوارانہ ادائیں اور عجیب قیامت بپا کر رہی ہیں۔
انتقام کا جذبہ دل میں موجزن ہے۔ اور ایک خاموش چیخ لبوں پہ۔

گات بجات پی چلے ہم کو لین

اب گات بجات ہم چلے پی کا بدلہ دین

ہاں۔ کبھی یہ ہی ایک بھولی بالی لڑکی تھی جو میکے سے رخصت
ہوتے وقت اپنے اجنبی اور نادیدہ سرتاج (شوہر) کے ساتھ ساتھ

---

۳۴۶ سرد آزاد، صفحہ ۲۲ مطبوعہ لاہور ۱۹۱۳ء

آنسو بہاتی چلی تھی۔ اکیلی خود ہی نہیں روتی تھی۔ اپنے سے زیادہ اپنے ماں باپ اور نزدیک و دور کے رشتہ داروں کو رُلا رہی تھی جس نے کچھ دیر کے لئے ایک بزمِ طرب اور محفلِ شادی کو طلسمِ غم مرقعِ آلم بنا دیا تھا۔ امیر خسرو نے اپنا ترجیع بند ختم

"بابل! میرا نئی ہر چھیو اجائے ہے"

ٹیپ پر دلوں کو اور بھی تڑپا دیا، دُکھ بھرے منظر کو گہرا دیا تھا اور کہرام مچانے والے سِتار! کیا آج خدا کی بھری خدائی میں ہو اس بے بس و بے کس کا ایک بھی تیرا غمگسار و درد آشنا نہیں؟ شکستہ زبان و خوں چکاں قلم کا تقاضا اور میرے انسانی جذبات کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے کہ اب اس دشت وردِ خانماں برباد کاروانِ ادبیات کو آغوشِ وداع میں پناہ دی جائے۔

ع۔ لذیذ بود حکایت[٣٣] دراز تر گفتم

جو کچھ لکھ چکا کافی سے زیادہ ہے۔ جو کچھ کہنا باقی ہے اس کے لئے وسعتیں تنگ نظر نہیں آتی ہیں۔ اس لئے انگلستان کے نابینا مگر فطرت شناس شاعر جان ملٹن[٣٤] (JOHN MILTON) کی ایک صد گلشن بدامن رباعی پر بس کرنا چاہتا ہوں جس نے صنعت

---

[٣٢] دردناک۔ [٣٣] دیکھئے فرہنگ و حواشی، نوٹ ٥٢۔

نانک کی وفاداری، اطاعت شعاری اور کمالات و صفات اخلاقی
کے چہرہ سے نقاب اُٹھایا ہے۔ اور نسوانی محاسن اور خوبیوں کی دیوی
کے خط و خال[۳۳۹] یوں نمایاں کئے ہیں۔

OH! FAIREST OF CREATION_LAST AND BEST

OF ALL GOD'S WORKS, CREATURE IN WHOM EX-

-CELLED.

WHATEVER CAN TO SIGHT OR THOUGHT BE

FORMED.

HOLY, DIVINE, GOOD AMIABLE OR SWEAT.

بازآمد۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُس سرمستی و خرمستی کے عالم میں اِن
دونوں اجنبی محض، سادہ دل، ہیبت زدہ راجپوتنیوں سے
اکبر جیسے پاسبانِ حقوقِ رعایا اور پاسبانِ زبان و دہان نے بے باکانہ
عرضِ مدعا کس بولی میں کیا ہوگا؟ غالباً بھاشا میں! اِن خاندانی
عظمت اور ذاتی عصمت والی، نیک نہاد، نیک دل رانیوں نے[۳۴۰]
اس تلاطم خیز ناگہانی ہنگامہ میں کمال عزیمت و استقامت سے [illegible]

---

۳۳۹ "خدوخال" نہیں جو قصائیوں کی بول چال ہے۔

۳۴۰ ٹاڈ کا راجستھان، ترجمہ، صفحہ ۲۲۳۔

غیرت قومی و ملی سے کام لے کر کس زبان میں جواب دیا ہوگا؟ یقیناً اشاروں ہی کی زبان میں!! یا شاید معاملت کی دنیا اور نیاز و ناز کی کائنات میں حرفِ مطلب اشاروں ہی کے عنوان سے ادا ہو گیا ہوگا!! کیونکہ بسا اوقات وہاں دراز دستی کرنے والے ہاتھ شل پڑ جاتے ہیں۔ چھیڑ چھاڑ کرنے والی زبان گونگی ہو جاتی ہے۔ بقولِ خانِ آرزو۔

نمی فہمم زبانِ ترکیِ چشمِ سخن گویت
اشارت ہائے ابرو شاید ایں جا ترجماں باشد[۲۴۱]

کرنل ٹاڈ نے اکبر کے اعمال کے متعلق جو کچھ لکھا ہے آگے چل کر اُس کی عذر خواہی بھی فرماتے ہیں۔ ساتھ ہی کسی ممتاز مگر گمنام کبیشر (شاعر) کے حوالے سے ایک دوسری روایت بھی پیش کرتے ہیں۔ یعنی بوندی کی مستند تاریخوں سے واضح ہے کہ اکبر مان سنگھ سے کشیدہ ہو گیا۔ اُس کے خونِ ناحق کی دھن سمائی۔ معجون تیار کرائی۔ ایک خوراک میں زہر کی آمیزش تھی۔ دوسری سمیت سے پاک۔ اتفاق وقت کہ خود مغالطہ کھا گیا۔ زہریلی چیز اکبر کے حلق میں پہنچی۔ مان سنگھ بچ گیا[۲۴۲]

---

[۲۴۱] مجمع النفائس صفحہ ۴۴۔ [۲۴۲] ٹاڈ کا راجستھان ترجمہ صفحات ۷، ۲۴۷، ۲۴۸۔
" " انگریزی مطبوعہ ۱۹۲۰ء صفحہ ۲۹۶۔ جلد اول و صفحہ ۳۸۵ جلد دوم۔ " "
حصہ سوم تحشیہ ولیم کروک صفحہ ۱۴۸۶۔ " " " حصہ اول (ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ)

ایک دوسری تاریخ میں معجون کی جگہ مٹھائی کی ڈلیاں بتائی گئی ہیں[۳۲۳]
لیکن نتیجہ ایک ہی ہے۔

اس پہلے فعل (مذکورہ بالا) کی نسبت تصریحاً دو رائیں ہو سکتی
ہیں۔ ایک اُس کا گناہ کبیرہ یعنی بدترین جرائم اخلاقی و سماجی سے
ہونا۔ مولویوں کا مقولہ بلکہ متفقہ فتوے ہے اَلزِّنَاءُ اَشَدُّ
مِنَ الْقَتْلِ۔ (بدکاری قتل سے بھی بُری ہوتی ہے) جس کو محافظِ اخلاق
شاہنشاہ اور ایک بے کس و بے بس عورت کے سابقہ نے ہماری
نگاہ میں اور بھی شرمناک و ناپاک بنا دیا ہے۔ دوسری صورت
دورِ حاضر کے تمدن[۳۲۴] و ثقافت[۳۲۵] اور اصول عیش پسندی و عشرت
گزینی کا ایسے افعال کی اہمیت کے ماننے سے انکار کر دینا، قابلِ
توجہ قرار نہ دینا، چشم پوشی و درگزر کو سزاوار رکھنا۔ اس کے لئے اس
بیسویں صدی میں مثالیں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ آئے دن ہوتا ہی

(بقیہ صفحہ گزشتہ) صفحہ ۸۰۔ منوچی کی تاریخ مغول، حصہ اول، صفحہ ۱۵۰۔ " " حصہ چہارم
صفحہ ۲۰۴۔ ایروِن کا نوٹ۔ تاریخ اکبر۔ از ونسنٹ اسمتھ۔ صفحات ۳۲۵، ۳۲۶

۳۲۳ ٹاڈ کا راجستھان، ترجمہ صفحہ ۱۴۳۰۔ تاریخ جہانگیر از ڈاکٹر بینی پرشاد، صفحہ
۷۵ نوٹ نمبر ۴۔ ۳۲۴ شہر میں بود و باش رکھنا۔ شہر کا انتظام کرنا۔
اہل حرفہ کا جمع ہونا۔ ۳۲۵ زیرک ہونا۔ استوار ہونا۔ چست ہونا۔

رہتا ہے۔ خصوصاً علی اور فرماں روا طبقوں میں]۔ لیکن دوسرا جرم یعنی
دغا و بے وفائی کا الزام اور ان سگوں جیسے نادر الوجود رفیق یا عزیز کی
جان لینے کا اقدام و اہتمام تو قطعاً قبیح اور بے انتہا سنگین ہے۔

ایک دوسری حکایت مآثر الامرا کے حوالہ سے نقل کرتا ہوں۔ مرزا
غازی بیگ ترخان[۳۴۶] پسر مرزا جانی، والی سندھ و ٹھٹھہ کے مرنے پر
شبہ کیا گیا تھا کہ لطیف اللہ شیبانی خان اس کے رفیق و وکیل نے
اسکو زہر دے دیا تھا۔ مگر ڈی لیٹ صاحب نے جن کی تاریخیں ابتداءً
۱۶۳۱ء میں شائع ہوئیں[۳۴۷]۔ ایک اور ہی قصہ تیار کیا ہے کہ اکبر مرزا غازی
کو زہر دلانا چاہتا تھا۔ لیکن غلطی سے زہر آلود گولی خود کھا گیا۔ موصوف[۳۴۸]

---

[۳۴۶] دیکھئے فرہنگ و حواشی، نوٹ ۵۲۔ [۳۴۷] FRAGMENTUM

HISTORIAE INDICA (LATIN) BY JOANNES DE LAET

1631 - DE IMPERIO MAGNI MOGOLIS, SIVE INDIA

VERA; BY DE LAET, 1631 (DUTCH)

[۳۴۸] ڈی لیٹ ترجمہ لیتھ برج صفحہ ۲۰۰ - تائید مزید - ٹیری صفحہ ۴۰۰، ہربرٹ
صفحہ ۷۶، پیٹر منڈی کا دوم صفحہ ۱۰۲- ٹاملارز و مصطر کی تاریخ ہند جلد چہارم صفحات
۱۸۴ و ۱۸۸- نیز ایکرویڈ صاحب کا نوٹ منڈی میں جلد چہارم صفحہ ۴۰۲- ڈی لیٹ
کی امپائر آف دی گریٹ مغل ترجمہ ہوئی لینڈ صفحہ ۱۷۵۔

نے اس حادثہ کو اکبر کے واقعۂ مرگ اور مرض الموت کے سلسلہ میں کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے[۳۴۹]۔ اور بعض خفیف تغیرات و تفصیلات کے ساتھ پرانے انگریز سیاحوں اور مورخین یعنی پادری ٹیری ہربوٹ پیٹر منڈی اور حال کے لکھنے والوں میں سے لیتھ برج اور ٹالبائز و ھیلر نے بھی نقل کیا ہے۔ مسٹر بیورج (BEVERIDGE) (مآثر کے مترجم) اس کو صحیح نہیں مانتے، غلط جاننے میں ذرا بھی شک نہیں فرماتے[۳۵۰]۔ تمام معاصرین یا قریب العہد مورخین کی زبانوں پر ایسی ایسی روایتوں کا متواتر آنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ اکبر کا دربار ایسے معاملات میں زہر خورانی کے شبہات سے پاک نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بشری بدسگالی و زشت خصالی مرزا غازی بیگ اور راجہ مان سنگھ میں کوئی فرق نہیں کرتی۔ اس کے نزدیک دونوں برابر تھے۔

(ع) ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

ایک اور واقعہ بھی سن لیجئے۔ اس کا راوی مسلمان بادشاہوں کا نمک خوار و پروردہ مگر ناحقیقتہ بد اندیش و بدگو نکولا منوچی ہے۔

---

[۳۴۹] باب ۳۳۔ اکبر کا مرنا، جہانگیر کی تخت نشینی۔ تاریخ ڈی لیٹ۔ صفحہ ۱۰۷۔ [۳۵۰] ترجمہ مآثر صفحہ ۵۰۲، نوٹ اول، جلد اول، مطبوعہ کلکتہ، سنہ ۱۹۱۱ء۔ [۳۵۱] بالکل۔ پورا۔

مسٹر ملک راج شرما نے اس کی روایت کو ان الفاظ میں تحریر فرمایا ہے۔
"جنگلات مانڈو کے بادشاہ باز بہادر کو شکست دے کر اکبر نے بڑے ظالمانہ طریق سے اس کا سر کٹوانے کے بعد اسکی بیوہ کے ساتھ شادی کی تجویز کی۔ مصیبت زدہ بیگم نہایت خوبصورت تھی۔ اسے اپنے خاوند سے بہت محبت تھی۔ اس لئے اس نے اکبر کے تمام وعدے وعید پرلات مار کر اس کی تجویز کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ لیکن جب بادشاہ کی طرف سے بہت اصرار ہوا، تو بالآخر اس نے یہ کہلا بھیجا کہ "اگر بادشاہ میرے لئے ایک رنگ محل تیار کرا دے اور ساتھ ہی مجھے ایک سال کی مہلت دے تاکہ میں اپنے پیارے خاوند کا ماتم اور اس کی یادگار میں ضروری رسوم ادا کر سکوں تو اس قدر عرصہ گزر جانے کے بعد مجھے تعمیل ارشاد میں عذر نہ ہوگا۔"

بادشاہ نے جو عشق کے ہاتھوں اندھا ہو رہا تھا۔ اس کی اس تجویز کو بخوشی منظور کر لیا اور ایک سال گزر جانے کے بعد اطلاع دی کہ "اب تمہارے وعدے کے ایفا کا وقت آ پہنچا" اس پر اس خاتون نے ایک زرق برق پوشاک پہنی۔ قیمتی سے قیمتی زیورات زیب تن کئے اور بادشاہ کی ملاقات کو آئی۔ بادشاہ نے

بمشکل سال کے ۳۶۵ روز گن گن کر کاٹتے تھے۔ دیکھتے ہی بادشاہ خبطی ہو گیا۔ اُٹھ کر تعظیم کے لئے بڑھا اور اُسے پہلو میں بٹھلا کر میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا۔ اسی حالت میں بیگم نے جیب سے ایک پان کی گلوری نکالی۔ جس میں ایک ہلاہل زہر لگا تھا کہ منہ میں ڈالتے ہی کام کر گیا۔ اس طرح پر اپنے مرحوم خاوند بہادر کا نام جپتی ہوئی یہ بیگم اپنے عاشق کی بغل میں ہی چلتی بنی۔[۱۵۳]

مسلمان مورخ درکنار فرنگستانی سیاح بھی یہی کہتے ہیں کہ:—

"اکبر کی بے راہ روی میں اس کی غیر مسلم بی بیوں کا بھی دخل تھا۔ انھوں نے اس کے "ہندوانے" میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ حرم میں ہندو عورتوں کی موجودگی ہی ہندوانہ ماحول بنانے کے لئے کافی تھی۔ قصرِ شاہی میں عبادت خانے بنائے گئے اور بتوں کی پوجا کا انتظام ہوا۔ ہندو تہواروں کے موقع پر قصرِ شاہی میں عام عید منائی جاتی۔ گاؤ کشی جرم قرار دی گئی۔ شام کو جب چراغ جلتے تو اکبر تعظیم کے لئے کھڑا ہوتا۔ درباری لباس بالکل ہندوانہ ہو گیا۔ داڑھی بھی چہروں سے غائب ہونے لگی۔ مختصر یہ کہ سارا ماحول یکسر ہندوانہ ہو گیا۔ اور قصرِ شاہی کے آداب

---

[۱۵۳] ترجمہ اسٹوریا ڈو موگر، مؤلفہ منوچی جلد چہارم صفحہ ۱۸۰۔

واطوار بالکل ہندوانہ رنگ میں رنگ گئے۔ اس دور کے لباس،
تعمیر[۳۵۳] مصوری ہر چیز سے "ہندویت" ظاہر ہوتی ہے۔ فتح پور
سیکری کی مسجد ہو یا شیخ سلیم کا مقبرہ، ہندو اثر بالکل نمایاں
ہے۔ شیخ سلیم چشتی کے مقبرے کے بارے میں ونسنٹ اسمتھ اظہار
رائے کرتا ہوا لکھتا ہے "اتنے بڑے پرجوش مسلمان فقیر کے مقبرہ میں
ہندو اثرات دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ عمارت کی پوری ساخت ہندو
جذبہ کو ظاہر کرتی ہے۔[۳۵۴] اسی طرح حویلی (HAVELI) کی لاٹ میں
"فتح پور سیکری کی مسجد[۳۵۵] مسجد سے زیادہ وشنو مندر معلوم ہوتی ہے۔"
یہ سب کچھ تھا، ہوا اور ہوتا رہا لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کیا
یہ رانیاں اپنے فرمان، پروانے دیا کے فرمان اور شوہر کی بول چال کو
اپنی ہم زبان بنا سکی تھیں؟

غیر متعلق سہی، تاہم ایک اور ایسا ہی (مگر حقیقتہً برعکس) تاریخی
واقعہ نقل کر دینا ضروری ہے۔ ممکن ہے کہ قارئین معظم بھی اس سے
وہی نتیجہ نکالیں۔ جو ایشیائی تہذیب و تمدن کا ہر شیدائی اور پرستار

---

۳۵۳ دیکھیے فرہنگ و حواشی، نوٹ ۳۰۔
۳۵۴ AKBAR. THE GREAT MUGHAL, P.P. 442, 445.
۳۵۵ A HANDBOOK OF INDIAN ART. P. 65

جواں مردی کا ہر مرتبہ شناس نکالتا ہے۔ بادشاہ کی نیک نیتی اور نیک روی تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ رحمت و الطاف خداوندی اور رہنموئی[۳۵۶] الٰہی کا شکر بجا لاتا ہے۔ اس حکایت کی سند منتخب التواریخ ہے۔ "سلطان شمس الدین التمش[۳۵۷] کے باب میں مشہور ہے کہ وہ ہیز مخنث تھا۔ اور اصل اس کی یہ ہے کہ اس نے ایک دفعہ کسی خوبصورت صاحب جمال لونڈی سے صحبت کرنی چاہی۔ کچھ نہ ہو سکا۔ چند دفعہ ایسا ارادہ کیا مگر خالی گیا۔ ایک دن وہی لونڈی اس کے سر میں تیل مل رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ کئی بوندیں سر پہ ٹپکی ہیں بادشاہ نے سر اٹھا کر دیکھا اور رونے کا سبب پوچھا۔ بڑے اصرار سے بتایا کہ مجھے یاد ہے۔ بچپن میں میرا ایک بھائی تھا۔ اور آپ کی طرح اس کے بھی سر کے بال اڑے ہوتے تھے۔ اسے یاد کر کے میرے آنسو نکل پڑے۔ جب تحقیق کیا کہ یہ تباہی زدہ کیونکر آئی تھی۔ اور کہاں سے آئی تھی تو معلوم ہوا کہ بادشاہ کی حقیقی بہن تھی۔ خدا نے اس نیک نیت بادشاہ کو اس طرح گناہ سے بچا یا تھا۔[۳۵۸] مولانا عبدالقادر بدایونی

---

[۳۵۶] ہدایت، راہ نمائی۔ [۳۵۷] دیکھئے فرہنگ و حواشی نوٹ ۵۵۔ [۳۵۸] گلستان ہند دفتر دوم صفحہ ۵۶ میں بھی یہ واقعہ درج ہے۔ اس بادشاہ کے مفصل حالات خواجہ نظام الدین بخشی کی طبقات اکبری میں ملیں گے۔ صفحات ۲۰ لغایۃ ۴۰ نول کشوری۔

لکھتے ہیں کہ اکبر نے معمولی بات چیت کے سلسلہ میں شب کی خلوتوں[۳۵۹] میں مجھ سے دو بار کہا تھا کہ یہ نقش سلطان غیاث الدین بلبن کے متعلق ہے۔ یوں ہی سہی۔[۳۶۰]

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی[۳۶۱] ہندوستان کے مشہور اور برگزیدہ ولی کا جنازہ جب تیار ہوا تو یہی التمش جنازے کے ہمراہ تھا۔ نماز کے وقت عقیدتمند خاص اور خلیفۂ رشید خواجہ ابو سعید نے اعلان کیا کہ حضرت خواجہ کی وصیت یہ ہے کہ میرے جنازہ کی نماز وہ شخص پڑھائے جس کا ازار بند کبھی حرام پر نہ کھلا ہو نیز عصر کی سنتیں اور نماز ہائے پنجگانہ کی تکبیر اُولیٰ اس سے فوت نہ ہوئی ہو۔ سلطان یہ اعلان سنکر دیر تک خاموش اور منتظر رہا۔ ہر طرف نگاہ ڈالتا تھا مگر کوئی شخص آگے نہ بڑھا۔ ناچار سلطان نے خود امامت کے لئے قدم بڑھایا۔ اور کہنے لگا۔ میں نے ہر چند چاہا کہ میرے حالات پر کسی کو اطلاع نہ ہو۔ لیکن جب حضرت خواجہ

---

[۳۵۹] خزانہ عامرہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ خواب گاہ خاص میں اکثر تخت کے قریب بلاکر بادشاہ گفتگو کیا کرتا، حکم دیا کرتا تھا۔ صفحہ ۲۲۳۔ [۳۶۰] دربار اکبری صفحہ ۱۱۴۔ گر صاحب طبقات اکبری جو اس سلطان کے حالات نہایت تفصیل کے ساتھ لکھتا ہے اس واقعہ کا ذکر نہیں کرتا صفحات ۴۷ لغایتہ ۵۰۔ [۳۶۱] اوش ماوراء النہر میں ایک قصبہ ہے

کا یہ حکم ہے تو چارہ کار بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ سلطان نے نماز پڑھائی اور نماز کے بعد چار پائی کا ایک پایہ خود التمش نے اٹھایا۔ باقی پائے اور بڑے بڑے اولیاء و علما نے پکڑے [۲۶۲]

سیر سے قدر افزا عنایت فرماتے ہیں۔ "مقبول!
دنیا نے فسانوں کو بخشی افسردہ حقائق کی تلخی
اور ہم نے حقائق کے نقشے میں رنگ بھرا افسانوں کا"

مگر میری پیشانی پر انفعال کا عرق جھلک رہا ہے۔ اندیشہ ہے کہ میرے بےادب قلم سے دو ایک باتیں ایسی نکل گئی ہیں جن کو زمانہ کی زبان "شوخی و عریاں" سے تعبیر کرے گی۔ معذرت۔ میں نے ان صفحات میں جو کچھ لکھا ہے۔ سب اوروں کا بتایا ہوا ہے۔ ضرورت و موقع کے اعتبار سے میں انہیں لفظوں یا سطروں کے نقل کر دینے پر مجبور تھا۔ ان باکمالوں نے یہ لفظ لکھے ہیں نگینے جڑے ہیں۔ جن کو ہٹا کر ان کی جگہ دوسرے جڑ دینا میری قوت نشا سے باہر تھا۔ ان صاحبوں کا رنگ زمانہ کا رنگ ہے۔ منشی دوارکا پرشاد

---

[۲۶۲] سیر الاقطاب صفحہ ۱۲۰، از شیخ الہ دیا چشتی صابری۔ خزینۃ الاصفیا صفحہ ۲۶۱ از مفتی غلام سرور لاہوری۔ ماہنامہ الفرقان صفحہ ۱۶۴ جلد ہشتم از مولوی نور الحق علوی۔

اثر لکھنوی بڑے ممتاز انشا پرداز اور جادو نگار مصنف تھے۔ ان
کے نام کے ساتھ "ملک الشعراء" لکھا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ
خطاب نظام عالی مقام (دکن) کی بارگاہ سے عطا ہوا تھا۔ نظم
و نثر فارسی و اردو پر بڑی قدرت رکھتے تھے۔ کئی ہزار دلوں کا غیر
کی تکمیل[۲۶۲] منشی دیبی پرشاد کا اہتمام تحقیق مسلم ہے۔ اُن کی تالیفات
کی شہرت احتیاج تعارف سے بے نیاز ہے۔ اُن کی زبان دانی اور
خوش بیانی بڑے بڑوں سے خراج تحسین لیتی رہی ہے۔ ٹھاکر اچھر شید
کے بے پناہ زور تحریر کی کون داد نہ دیگا۔ تو یہ نہیں فرماتے سیکھتے
ہیں۔ آخری (حکایت کی) عبارت بھی میری نہیں۔ یوں تو جادو بیانی
کے لالہ زار اور نظم و نثر کی ہری بھری کیاریوں میں ہر سو گلہائے رنگا
رنگ و بستہ دگر است۔ مگر حقیقت واضح یہ ہے کہ اردو میں صنف ادب
و انشا کے آسمان پر شمس العلماء آزاد دہلوی سے بڑھکر کوئی سعد برج
آسمان تک نہیں چمکا۔ جس کی شعاعوں کی تابش نے اُس کے قلمرو کا
گوشہ گوشہ جگمگا رکھا ہے ع جس کے ہزاروں احسان ہیں زبان پر ہیں۔
جس کو مولانا شبلی بھی ہندوستان کا سب سے بڑا انشا پرداز سمجھتے
ہیں[۲۶۳]

---

۲۶۲ دیکھیے فرہنگ حواشی نوٹ ۵۶۔ ۲۶۳ مقالات شبلی۔ جہانگیر صفحہ ۱۶۲

جہاندیدہ مورخ و جغرافی، نکتہ رس فیلسوف، متبحر مصنف
و ماہر ریاضیات، حکیم ابوریحان محمد ابن احمد خوارزمی بیرونی کا
قول ہے: "آنچہ لائق امروز است دراں حاضر است و آنچہ ازے
فردا ست بہ فردا آمادہ است۔" ہیچ مداں مقبول بھی یہی سبق لیکر
اپنے ناچیز و بے ربط سلسلۂ مضامین کے پہلے حصے کو ارباب
ذوق اور صاحب نظر بزرگوں کی بارگاہ میں پیش کرتا ہے۔

آئندہ اسکے حصوں کے مختلف عنوان ہوں گے۔ ان کی تجویز و
تشخیص ہنوز زیر غور ہے۔ ترتیب و تحریر کے لئے قدم اٹھانا اس کے
بعد کا کام ہوگا۔ عَرَفْتُ رَبِّی بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ[*] کی
نوبت نہ پہنچی تو سر دست ارادہ یہ ہے کہ دوسرا حصہ ان ہی راجپوت
خواتین کے لباس و پوشاک اور پہناوے کے متعلق ہو۔ سوئمبر
یعنی انتخاب شوہر کے زمانہ کے رنگ ڈھنگ سے لیکر اس

---

[*] میں نے اپنے پروردگار کو ارادوں کے پلٹا دینے سے پہچانا۔

وضع و قطع کا فرق بتا دیا جائے جو شاہی محلات میں جلوہ افروز ہوتے وقت ان رانیوں کی ہوتی تھی۔ حتی الوسع کپڑوں کی مجوب رنگتیں، تراش خراش، زیور گہنے وغیرہ کی کیفیت و صورت بھی دکھائی جائے یہ مضمون بظاہر جس قدر دلکش اور مجھ نا شاعر و بے شعور کی تخیل میں پر لطف نظر آتا ہے، ویسی ہی دشواریاں اس کی تکمیل میں پیش آ رہی ہیں۔ شیخ ابوالفضل علامی نے "سنگار" کی بعض جزئیات کے "آئین" پر ضرور ناقدانہ نظر اور کافی روشنی ڈالی ہے۔[۳۶۶] لیکن فارسی کے اور مورخ قطعاً خاموش ہیں۔ کرنیل ٹاڈ نے بھی سہاگنوں کی ایک آدھ آرائش کا نام لیا اور ذکر کیا ہے، مگر نہایت مختصر اور نازک طور پر۔ جیسے چوڑیاں، وہ بھی ہاتھی دانت کی چوڑیاں۔ جن کو نازنینانِ ہندوستان اور ہندی نژاد تاتاری (INDO SCYTHIC) حسینوں کا دل پسند زیور بتایا ہے۔[۳۶۷] یا ناک کے زیور۔[۳۶۸] اس سے کم نصیب

---

۳۶۶ آئین اکبری، جلد سوم، صفحات ۳۱۴ تا ۳۱۶۔ رنگوں کی تیاری، جلد اول، صفحہ ۹۳۔ زنانہ مردانہ، سنہرے روپہلے پشمینہ، ریشمی کپڑے، جلد اول، صفحات ۹۴ لغایت ۹۷۔ ۳۶۷ تاریخ راجستھان، جلد دوم، صفحہ ۶۷۲، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۴ء۔ و صفحہ ۵۹۲۔ ۳۶۸ ایضاً، جلد اول، صفحہ ۵۰۲، نوٹ، مطبوعہ آکسفورڈ، ۱۹۲۰ء۔

لکھنے والے کو ان مضامین اور ان کے تذکروں کی تلاش و جستجو میں بہت سے کتاب خانوں، تصویر خانوں اور بت خانوں کا طواف کرنا ہوگا۔ جا بجا گھوم پھر کر پرانی چیزوں اور مورتیوں کو دیکھنا ہوگا۔ نوادر و عجائب کے ذخیروں کی آستان بوسی لابد ہوگی۔ تصویروں اور شبیہوں کی دستیابی کے بعد ان پر نظر و نقد اور انتخاب۔ آخرکار بلاک فوٹو وغیرہ تیار کرانا! اشاعت و قسمت!! بہت شکن مصارف!!! اس ہفت خواں کا طے کرنا منازل حیات کے مجبور لیے ہوئے مسافر کے لیے اجل کے پیام آور کو لبیک کہنا ہے۔ ایک اصولی یا موٹی سی بات گوش گزار کر دینا چاہتا ہوں جو سر جوشوا رینالڈس (SIR JOSHUA REYNOLDS) نے بتائی تھی۔ جیسا کہ تمام ملکوں اور قوموں میں مدت ہائے دراز سے ہوتا چلا آیا ہے۔ ہمیشہ سے یہاں بھی پوشاک و سراپا کی ہیئت و جامعیت کم و بیش ایک سی رہی ہے۔ زمانہ کا ہاتھ اسی لباس و پوشش یا وضع و قطع میں بقدر ضرورت وسعت و رسائی[۱] نظر تغیر و تبدیل کرتا رہا ہے کبھی گنجائش و پہنائی دیکھی تو کسی جزو کو بڑھا کر ڈھیلا اور فراخ کر دیا کہیں کاٹ چھانٹ کر تنگی و چسپی پیدا کر دی۔ ظاہر ہے کہ ایسی تراش

---

[۱] فراخی، عرض، لمبائی، چوڑائی۔

تراش یا خفیف ترمیمات سے لباس کے عام طرز بود و نمود میں
چنداں فرق نہ آتا تھا۔ ذہن کی تیزی، خیال کی نزاکت، آرایش و
زیبایش کا ذوق، جلوہ و نمایش کا شوق، خوش پوشی و خوش ادائی
کا ولولہ اس مختصر پردازی یا جامہ پیرائی کے دائرۂ اثر یا حدِ عمل سے
کب باہر جانے پاتا تھا۔ یا ایجاد و اختراع و اہتمام کا کوئی تکلف
کیسے کارگر و نمایاں ہو سکتا تھا۔ البتہ یہ عمل بھی "اصلاح و تہذیب"
کے بھاری بھرکم خطاب سے پکارا جاتا تھا۔ اس وقت تک جو سرمایہ
معلومات فراہم ہوا ہے، وہ دامن، چولی اور انگیا کے متعلق ہے۔ اور
کثیر ہے۔ اور متفقاً یہ چیزیں زنانہ لباس کے پرانے سے پرانے
اور اہم اجزا میں شمار ہوتی ہیں۔ آخر کی دونوں میں جو کچھ فرق یا
مابہ الامتیاز ہے، خفیف ہے۔ مناسب موقع پر ان کا ذکر تفصیل کے
ساتھ آئے گا۔ چولی دامن کے ساتھ کی تشریح بھی کی جائے گی۔ [نوٹ ۲۷]
انگیا کا نام مسلمانوں کے دورِ تہذیب میں "محرم" [نوٹ ۲۸] قرار پایا تھا۔ اس

نوٹ ۲۷ انگیا، ناسخ، بہارستانِ سخن، صفحہ ۲۰۸، مطبوعہ ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء مختلف
اساتذہ، سراپا سخن، صفحات ۲۹، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، جان صاحب۔ امیر،
صنم خانۂ عشق۔ نوٹ ۲۸ محرم، آباد، بہارستان، صفحہ ۲۱۷، سراپا سخن، صفحات ۲۳۷
۲۳۸۔ افادات مہدی، صفحات ۱۶۴، ۱۹۹، ۲۰۰۔ نوٹ ۱۔ کوثر
خیرآبادی، مکاتیب امیر مینائی، صفحہ ۴۶۔ ریاضِ رضوان۔

دورِ آخر یا حقیقتہً اردو کے تمام شعرا نے اس کو "محرم" ہی کے نام سے یاد کیا ہے۔ لیکن عہد اکبری میں اصلی لفظ نہ مخش و ابتذال میں داخل تھا نہ متروکاتِ زبان میں۔ نہ لفظاً یا معنیً اس لفظ میں کوئی "قابلِ اعتراض بات ہے۔ سنسکرت میں "انگ" جسم یا حقیقتہً جسم کو کہتے ہیں۔ مگر کسی خاص یا چھپانے کے لائق حصۂ جسم کا نام نہیں۔ رحیم خان خاناں (متوفی ۱۰۳۶ھ ۱۶۲۷ء) جس کے وجود پر تلوار اور قلم اور ترکی، فارسی، ہندی سب ہی کو یکساں ناز ہے۔ اپنی خوبیٔ تخئیل اور حسنِ بیان کی کس کس طرح داد دیتا ہے۔ اُس کا ایک شعر بھانتا کا سن لیجئے۔ عجیب و نفیس و لطیف۔ ایک دوشیزہ رفنادرزی سے دکھڑی جھگڑتی ہے جس نے اس کی محرم تنگ بنائی ہے۔ جس کو ہمیشہ نئی محرم تیار کرانے کی ضرورت محسوس ہوا کرتی ہے۔

بار بار درجن گھر جھگرت ٹھاڑھ
جیوں جیوں انگیا سیونت سو سو کاڑھ[۳۷]

اسی چیز کا نام دوسرے طبقوں یعنی خود عورتوں کی خود دار جماعت اور مردوں کے متین و بلند خیال گروہ میں "سینہ بند" اور "پستان پوش" تھا۔ یہ شائستہ مگر سیدھا سپاٹ نام وہ شہرت و قبولیت

---

[۳۷] مضامین رشید، مکتبہ جامعہ، صفحہ ۱۶۶۔

عام حاصل نہ کرسکا جو محرم کے حصہ میں آئی تھی۔ اس میں نزاکت
تھی، لوچ تھا، لطافت تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ رازداری کی
استعداد تھی۔ بندش کی رعایت، چستی اور جسم میں چپکے رہنے
کی گنجائش و مناسبت یا تراش خراش کی نفاست و لطافت
سے "سینہ بند" کی قسمیں مختلف ہوتی ہیں۔ تقسیمی، غیر تقسیمی وغیرہ۔

قاضی غلام امیر "نقاد" بدایونی نے اس کے متعلق ایک اچھی
لطیف بحث پیش کی ہے جس کا جواب موقع مناسب پر گزارش
کروں گا۔ فرماتے ہیں کہ "محرم، زنانہ کپڑا۔ پستان پوش۔ عربی لفظ۔
آب رواں، فارسی"۔ یعنی "محرم" اس زنانہ کپڑے کا اصطلاحی
نام ہے جو پستان پوشش ہوتا ہے۔ یہ اصطلاحی نام اپنے اصلی
معنی سے کچھ بعید نہیں ہے بلکہ لغوی معنی کو لئے ہوئے ہے۔ جو کپڑا ہر وقت
عورت کے سینے سے متصل رہتا ہو، اس پر محرم کا اطلاق نہایت
موزوں ہے۔ آب رواں، ایک قسم کی باریک اور کلف دار ململ کا
نام ہے، اس سے محرم تیار کرتے ہیں۔ سینہ پوشی بھی ہے اور سینہ
افروزی بھی"۔

قاضی صاحب کی تحریر کا یہ حصہ قابل غور اور تحقیق طلب ہے کہ مسلمانوں
کی آمد سے قبل ہندی عورات اس چھوٹے کپڑے کا استعمال

ہی نہ کرتی ہوں گی، بلکہ اب تک یہ کپڑا ان کے لباس ضروری میں شامل نہیں ہے۔ خصوصیت کے ساتھ یہ مسلمان شرفا عورات کا لباس ہے۔ ایرانی تمدن اسے ہندوستان اپنے ساتھ لایا ہے۔ اور یہ لطیف نام اُسی کا عطیہ ہے۔

(آتش) کسی کی محرمِ آبِ رواں وہ یاد آئی[۳۷۵]

میں نے انگیا، چولی اور محرم پر تین صدی گزشتہ کا مواد و مصالح اکٹھا کیا ہے اور بہ تعداد کثیر پرانی کہاوتیں، اقوال اور اشعار جمع کیے ہیں۔ میرے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ سینہ بند کی حیثیت سے محرم کا استعمال ایران سے آیا۔ ایسا ہونا بعید از قیاس تو نہیں مگر کیا واجد علی شاہ کے عہدِ رنگین اور اودھ کی نزاکت آفریں تکلفات سے پڑھا ہوا، بادشاہی کے زمانہ سے پہلے اس چیز کا

---

[۳۷۵] علی گڑھ میگزین نمبر ۲، جلد ۱۲، ماہ نومبر ۱۹۳۴ء، صفحہ ۱۳۰۔ دوسرا مصرع یہ ہے

حباب کے جو برابر کوئی حباب آیا

(ہماری شاعری، صفحہ ۶، مطبوعہ نظامی ۱۹۲۹ء)

مَحَرَم (م اور ر دونوں پر فتحہ۔ وہ شخص جو حرم میں جا سکتا ہو اور جس کے ساتھ نکاح حرام ہو۔ مجازاً بمعنی واقف کار۔ ایک صوفی کہتا ہے:۔

کوئی ہو محرمِ شوخی ترا تو میں پوچھوں   کہ بزمِ عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی؟

(ہماری شاعری، صفحہ ۴۴)

رواج نہ تھا اور بہ کثرت نہ تھا۔؟

محرم کے حروف، بالخصوص حاے حطی کی موجودگی سے جو کچھ آپ چاہیں استنباط فرمالیں مگر عربی فارسی کی لغات قاضی صاحب کے فیصلے اور اس لفظ کے فارسی ہونے پر دلالت نہیں کرتیں۔ سید مرتضیٰ اعظم پوری گستاخ تخلص نے جب شیخ ناسخ کی تائید پر قلم اٹھایا اور حضرت ناسخ اور اُن کے دیوان "دفتر بے مثال" وغیرہ پر بہت سے اعتراضات محاورہ و زبان کے کئے تھے تو ایک اعتراض اسی "محرم آبِ رواں" کے متعلق تھا۔ ناسخ نے کہا تھا:۔

پستان سرخ محرمِ آبِ رواں میں ہے
ٹکڑا شفق کا جلوہ نما ہر حباب میں

وسیع النظر اعرو ہوی محقق فرماتا ہے کہ "شفق کے ٹکڑے کو پستان سے تشبیہ دینا نئی اور مبتذل ترکیب ہے۔ محرم انگیا کے معنے میں عربی نہیں، فارسی نہیں، اس کی اضافت کیونکر جائز ہوگی۔ اور شاید ایک چھاتی والے معشوق کی تعریف منظور تھی جو ضمائر مفردہ لائے ہیں[1]۔"

ان دونوں متضاد و متخالف تحقیقوں کے متعلق جو کچھ میری

---

[1] صفحہ ۴۳ گستاخی معاف، مطبوعہ شعلۂ طور کانپور ۱۲۹۶ھ۔

سمجھ میں آیا ہی محل مناسب پر گزارش کروں گا۔[۲۴]

خواجہ حالی اپنے "مقدمہ شعر و شاعری" میں لکھتے ہیں کہ سینے یا چھاتی یا محرم وغیرہ کا صراحتہً نام نہیں لیا جاتا۔[۲۵]

گزشتہ صدی کے شعرائے شاہ جہان آباد میں دو ایک صاحب ایسے ملتے ہیں جنہوں نے انگیا کا استعمال معیوب نہیں سمجھا یعنی بخش خانِ معروف، عارف خاں کے بیٹے، قاسم خاں کے بھتیجے، مرزا غالب نوشہ کے خسر اور شاہ نصیر کے شاگرد تھے، فرماتے ہیں

کیا چھپی اوس کی تمامی کی وہ انگیا ہاتھ سے

ہاتھ ملتا ہوں گئی سونے کی چڑیا ہاتھ سے[۲۶]

کچھ اور شاعر بھی ایسے نظر آتے ہیں جو معروف کے ہم نوا و ہم آہنگ ہیں مگر اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ وہ باکمال لکھنؤ اور اودھ کے زیر اثر تھے۔ جیسے میر صادق علی، صادق تخلص جو نوجدار خاں[۲۷] فیل بان

---

۲۴ دیکھیے فرہنگ و مقالات، استدراکات۔

۲۵ ص ۳ صفحہ ۲۸۵ مطبوعہ رام نرائن لال ۱۹۳۱۔ ۲۶ مجموعہ نغز، جلد دوم صفحہ ۲۰۱

۲۷ سید رفیق نام، نوجدار خاں اور رفیق جنگ خطاب تھا۔ شاہ عالم ثانی کے فیل بان اور منصب دار تھے۔ جس زمانہ میں بادشاہ کا قیام شہر الہ آباد میں تھا تو ۱۱۸۲ھ و ۱۷۶۹ء میں قدم رسول کے قریب موضع رسول پور میں مسجد تعمیر کرائی تھی۔ موجود ہے۔ (مفتاح التواریخ صفحہ ۳۷۷ مطبوعہ ۱۸۶۹ء آگرہ۔)

فیل خاصہ شاہی کے بیٹے تھے۔ خود مرشد زادہ شوکت پناہ مرزا سلیمان شکوہ کے فیلِ سواری کی خدمت فیل بانی پہ سرفراز تھے۔ میر انشا سے اصلاحِ سخن لیتے تھے۔

تھی ایک تو کرتی ہی لاہی کی غضب تس پہ[۲۴۴]
پھر آفتِ جاں کافر انگیا کی یہ سنگھرائی[۲۴۵]

اور "ساری" تو وہ سرتاپا رعنائی و برنائی لباس ہے جس کی یگانہ و بیگانہ اہلِ قلم اور صاحبانِ نظر نے یکساں تحسین کی ہے۔ پُرلطف، جذبات انگیز، عشق آفریں، ضبط آزما لٹریچر مختلف زبانوں میں اس پہ موجود ہے۔ اس وقت ایک ہی قطعہ سید علی معصوم دستکی شیرازی[۲۴۶] کا سُن لیجئے۔ جس نے اس عالمِ وجود میں مدینہ (حجاز) کی پاک سرزمین پہ قدم رکھا تھا اور حیدرآباد دکن میں پیوند خاک ہوا۔ اس ملک میں آتے ہی پہلی ہی نگاہ میں یہ زاہد خشک

---

۲۴۴ مجموعہ نغز صفحہ ۲۵۸ - لاہی ایک قسم کا عمدہ ریشمی کپڑا۔ ۲۴۵ اہل لغت مرد جوان کو برنا لکھتے ہیں مجھے تحقیق نہیں ہے کہ آیا اس کی ترکیب اور اس کا استعمال زنانہ پہناوے کے ساتھ کہاں تک جائز ہے۔ ۲۴۶ ولادت ۱۰۵۲ھ = ۱۶۴۲ء وفات ۱۱۱۷ھ = ۱۷۰۵ء اکثر نظم و نثر میں بہت سی تصنیفات یادگار چھوڑیں۔ سرو آزاد، صفحات ۲۸۶ تا ۲۸۹۔

عربی نژاد مصنف، ادیب و شاعر اس چہرہ پر فریفتہ و مفتون ہو گیا تھا۔ فرماتا ہے :-

وغادۃ من بنات الھند قد ظہرت
فی زیہا بین استجاف واستار
فقلت لما سرت فی اللاذ مائسۃ
یا حبذا السیر بل یا حبذا الساری[۳۸]

[اور ہندوستان کی لڑکیوں میں سے ایک نرم و نازک اندام اپنے لباس میں نظر آئی۔ پردوں اور پشتوں میں ڈھنکی ہوئی تھی۔ تو جب وہ چینی ابریشم کے گلنار جامہ میں خراماں سامنے آئی تو میری زبان سے نکلا "کیا خوب ہے یہ سیر، نہیں نہیں کیسی اچھی ہے یہ ساری" (سیر کرنے والی نیز ساڑی)۔]

تیسرا حصہ، "پردہ" پر ہو گا۔

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

اس کی پہلی ہی منزل میں حوصلہ فرسا مشکلات سے سابقہ پڑ رہا ہے۔

۳۸۔ سبحۃ المرجان، لمؤلفہ میر غلام علی آزاد بلگرامی۔ غصن البان، تالیف نواب صدیق حسن خان، مطبوعہ مصر، صفحہ ۱۷۔

مجھ کو تاہ بیں کو اب تک تصویر کا صرف ایک ہی رخ نظر آیا ہے۔ تاریخ کی شہادت اسی قدر ملتی ہے کہ یہ راجکماریاں اپنے ماں باپ کے گھر سے پردہ کی خوگر ہو کر آتی تھیں۔ اتنے ہی پردہ کی پابندی یہاں بھی کرتی تھیں۔ اس میں قید و بند یا سختی کو اصلا دخل نہ تھا۔[۳۸۱] نامحرم کا پیش نگاہ آجانا۔ البتہ برا سمجھا جاتا تھا۔ بے باکی میں شمار ہوتا تھا۔[۳۸۲]

آنس ہی خانۂ صیاد سے گلشن کیسا

نازپروردِ قفس ہوں میں نشیمن کیسا

دنیا کی نادیخوں قصہ کہانیوں میں پردے یا بے پردگی کی رپورٹیں اور ذکر مذکور جو پرانے سے پرانے ملتے ہیں وہ ایک تورانی القتل شاخ النسانی سیتھیا (اسقوطی)[۳۸۳] SCYTHAC[۳۸۴] نام کے

---

[۳۸۱] ترجمہ راجستھان ٹاڈ، صفحہ ۱۰۰۔ [۳۸۲] مطلع الوالد برق، صفحہ ۹۱۔ [۳۸۳] نقوش سلیمانی، صفحہ ۵۔ [۳۸۴] سا یتھیا دہی قوم ہے جس کی عورتوں کو کئی کئی خاوند کرنا جائز تھا۔ شوہر کے جیتے جی بھی غیروں سے ہم صحبت ہونا معیوب نہ تھا۔ ترجمہ ٹاڈ، صفحہ ۱۰۰۵۔ تاریخ متقدمین، غلام مصطفیٰ، صفحہ ۲۸، مطبوعہ ۱۹۶۹ء۔ کرنیل ٹاڈ اس پر اضافہ کرتے ہیں کہ ڈیوڑھی میں جوتا اتار دینا کافی ہے۔ کثرت اولاد کثرت ازدواج ہی سے ہو سکتی ہے۔ (صفحہ ۱۰۰۵)۔ راجستھان ترجمہ افق، صفحہ ۳۵، نوٹ انگریزی جلد اول۔

ساتھ وابستہ ہیں۔ اسٹرابو STRABO [286] نے اس کی تعریف یہ کی تھی کہ بحیرہ خزر (کاسپین) کے پورب میں رہنے والے تمام قبائل سائیتھک (SCYTHIC) یا سائیتھین (SCYTHIAN) کہلاتے تھے۔[287] محققین بالخصوص فضلائے فرنگ فرماتے ہیں کہ قدیم زمانہ میں ایشیا میں شمال و مغرب کی جانب دریائے جیحوں[288] کے کنارے کنارے، سرد سبزہ زاروں اور مرغزاروں میں جو قوم آباد تھی، اس کا ایک گروہ جدا ہو کر یورپ پہنچا۔ اس کے بعد دوسرا ایران آیا۔[289] انھیں میں سے ایک گروہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ یہی لوگ "آریا" کہلاتے ہیں۔ فارس، یونان، اطالیہ، ہسپانیہ، فرانس، جرمنی، انگلستان وغیرہ ممالک کے باشندے اور تمام ہندو بالخصوص برہمن اور راجپوت ایک ہی نسل کے لوگ ہیں۔[290] عربوں کی نئی زبان یا اصطلاح میں ان کو اسم الاورال الالتائیکیہ کہتے ہیں۔

---

۲۸۶ اسٹرابو۔ یونان کا مشہور حکیم گزرا ہے۔ حضرت عیسیٰ سے ترسٹھ سال پہلے پیدا ہوا تھا۔ علوم و فنون خصوصاً تاریخ و جغرافیہ پر قابل قدر یادگاریں چھوڑ گیا ہے۔ (از انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا)۔ ۲۸۷ کتاب ۱۱ صفحہ ۲۵۴ - STRABO LIB XI. ۲۸۸ جیحوں دیکھیے فرہنگ حواشی نوٹ ۵۷۔ ۲۸۹ ایران۔ فرہنگ حواشی نوٹ ۵۸۔ ۲۹۰ تذکرہ دبستانِ مذاہب از مولوی عبدالرحمان خان صفحہ ۵

یہ قومیں قدیم زمانے میں تاتار[۲۹۱] یا یوتان[۲۹۲] جاتی اور کہلاتی تھیں۔ ان سے مراد ترک[۲۹۳]، ترکمن (ترکمان لوگ)[۲۹۴] مجیر (MAGYAR)، اور قرغیز (KHIRGIS)[۲۹۵] ہیں۔ سمرقند ازبک تاتاریوں کا منبع و معدن تھا۔[۲۹۶] ۔۔۔ ۔۔۔

THE MARACANDA OF QUINT-CURTIUS جس کا ابن حوقل و اوسلی نے تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہی زبان سمرقند کے پایہ تک پہنچی ہوئی ہے جہاں تک کہ ہمارے ملک کا تعلق ہے، راجپوت، گوجر، جٹ وغیرہ شدھ آریائی تو نہیں انہیں ساتھین لوگوں کی اخلاف و اولاد بتائی جاتی ہیں[۲۹۷]۔ قدیم مورخین کا ارشاد ہے کہ چغتائی یا سکتائی چرواہوں کے سکندر وہ ہیں[۲۹۸]

۲۹۱۔ دیکھیے فرہنگ، حواشی نوٹ ۵۹۔ ۲۹۲۔ دیکھیے فرہنگ، حواشی مقالہ ۶۰

۲۹۳۔ ״ ״ ״ ״ ״ ۶۱۔ ۲۹۴۔ ״ ״ نوٹ ۶۲

۲۹۵۔ ״ ״ ״ ״ ۶۳۔ ۲۹۶۔ ماہنامہ التقیس صفحہ ۲۵

ج ۲، جلد ۲، صفحہ ۹۔ یوراں یا یائک ندی۔ ویدک ہند ترجمہ اردو صفحہ ۴۴ اب عربی میں بھی ادرال ہی لکھا جاتا ہے۔ ۲۹۷۔ ٹاڈ کا راجستھان، جلد اول صفحہ ۳۱، مطبوعہ ۱۹۲۳ء آکسفورڈ۔ ۲۹۸۔ چغتائی مغلوں کے لئے ملاحظہ ہو الیاس راس (ELIAS ROSS) کی "وسط ایشیا کے مغلوں کی تاریخ"۔ تعارف صفحہ ۲۸۔ نیز ٹاڈ کا راجستھان جلد دوم صفحہ ۲۱۸ نوٹ مطبوعہ ۱۸۹۴ء کلکتہ۔

یہی لوگ تھے جن کو یونانیوں نے بگاڑ کر "ستھیا" بنالیا ہے۔ سیتھیا کے بعض رسم و رواج سورج کی پرستش وغیرہ کا ذکر ہیرودوطس HERODO-TUS نے بھی کیا ہے۔[۲۹۹] بقول کرنیل ٹاڈ ان کے اخلاف و نسب آیندگان میں یہ باتیں ان کے زمانہ (تالیف کتاب ۱۸۲۲ء) تک پائی جاتی تھیں۔ عورت کے دروازے پر جوتا اتار دینا وہ بولتی ہوئی نشانی تھی جس کو تمام ایماق نسل (EIMAUK) شوہر خوب سمجھتے تھے۔[۳۰۰] مشہور سیاح فرانسیسی سیاح ٹیورنیر اپنے سیاحت نامہ میں ایک ایک عورت کے کئی کئی خاوند ہونے اور بیاہ شادیوں میں آزادی کا ذکر کرتا ہے۔[۳۰۱] وہ بھی ان کے ایسے ہی پردہ کا حال دیتا ہے مگر وہاں بھی دروازے پر یا ڈیوڑھی میں چھڑی یا تلوار رکھ دی جاتی تھی۔[۳۰۲]

---

[۲۹۹] راجستھان جلد اول صفحہ ۸۶ مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۲۰ء۔ دیکھیے فرہنگ دحواشی، نوٹ نمبر ۶ [۳۰۰] تبصیہ و تبادہ۔ ترکی۔ [۳۰۱] الفنسٹن صاحب "سلطنت کابل کا احوال" جلد دوم صفحہ ۲۵۱ ELPHINSTONE'S CAUBUL - راجستھان جلد اول صفحہ ۸۵ نوٹ مطبوعہ ۱۸۷۳ء مدراس۔ [۳۰۱] سلسلہ آصفیہ جلد اول صفحہ ۶۴ مطبوعہ ۱۸۹۶ء۔ ترجمہ راجستھان اردو صفحہ ۱۰۰۵۔ [۳۰۲] سلسلہ آصفیہ جلد اول صفحہ ۶۵ ۱۸۹۶ء

TRAVELS IN INDIA. BY J.B TAVERNIER. ED.V. BALL. 2 VOLS LONDON. 1889.

ٹاڈ صاحب فرماتے ہیں۔ طبقۂ نسواں کی نزاکت، عفت و عصمت کے بارے میں کوئی خیال یا بد گمانی اسا ہتھک لگوں کی وحشت و بربریت کی یادگار سمجھنا چاہیے۔ جس کو وہ اپنے ساتھ دریائے جیحون (JAXORTES) کے ساحل یا جٹ (JIT OR YUTIC GETE) قوم کی سرزمین سے لائے تھے[۴۰۴]۔ کہا جاتا ہے کہ اہل فرنگ بھی اسی دولت سے متمتع ہوئے ہیں[۴۰۵]۔

میری رسائی سے دور ہے تو، مگر اتنی تجھ کو یاد ہو گا\
کہ میں نے ایمن کی وادیوں میں الٹ دیا تھا نقاب تیرا

بقول موصوف طھوریش TOMYRIS[۴۰۶] کے زمانہ میں جو کچھ ہوتا تھا اب بھی زندہ و باقی ہے یعنی دروازہ پر "پاپوش" چھوڑ دینا کافی ہے۔ اسی کو سنگِ آستان کہیے یا سدِ راہ۔ تاتاری شوہر اس روک کی قوت سے اچھی طرح آگاہ و آشنا تھا۔ ایسے ہی معمولات اور رواجوں میں سے ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ میراث چھوٹا بیٹا پاتا تھا۔

---

[۴۰۴] ترجمۂ راجستھان، صفحات ۱۸۶ و ۲۵۷ و ۲۵۹۔ انگریزی جلد اول، صفحہ ۲۹۰ نوٹ ۲۔ مطبوعہ ۱۸۷۳ء مدراس، یہ جٹ لوگ وسطی ایشیا سے آئے تھے۔ پنجاب میں سلطنتیں قائم کی تھیں۔ صفحہ ۲ نوٹ ذیلی جلد دوم، کلکتہ ۱۸۹۴ء۔

[۴۰۵] ایضاً جلد اول، صفحہ ۲۹۰، نوٹ ۲۔

[۴۰۶] دیکھیے فرہنگ و حواشی، نوٹ ۱۵۰۔

سنتا ہوں کہ اس "چیز" کا اثر بھی فرنگستان پہنچا تھا۔[۲۰۶] تعلقوں اور ایوانوں
میں امراء و روساء کو کچھ ایسے حقوق، ایسی سہولتیں اور رعایتیں حاصل
ہوگئی تھیں، اور وہ ایسی رنگ رلیوں میں گزارتے تھے جس سے یہ بعد
شبہ سا رہتا تھا کہ پہلوٹھی اولاد وارث فطری و حقیقی ہے بھی یا نہیں؟
اسی لئے سب سے چھوٹا وارث قرار پاتا تھا۔[۲۰۷] آج ہماری ایک خیراندیش
اصلاح دوست جماعت ایک "چیز" کو مشرق کی تمام برائیوں کا ذمہ دار
اخلاقی ہوں یا جسمانی، سب کا منبع اور سدا اشادلب ذریعہ بتاتی ہے۔
عہد جہالت و "نادانی کی باقیات میں شمار کرتی ہے!"[۲۰۸] یعنی "تعدد زوجات"[۲۰۹]
کو۔ وقت مناسب پر ان ذکی الحس[۲۱۰] مصلح مزاج حضرات سے کچھ
گزارش کروں گا۔

بے شبہ یورپ کی بہت سی اقوام و ممالک جو شائستگی و تہذیب
کامل کی مدعی ہیں، روشنی اور جہان آرا تمدن کے مقدمۃ الجیش
مانے جاتے ہیں آج پردہ کو جاہلانہ خصلت اور عہد ظلمت و تاریکی کی

۲۰۶۔ راجستھان انگریزی جلد اول صفحہ ۲۹۰، نوٹ ۲ مطبوعہ ۱۸۷۳ء، مدراس۔
۲۰۷۔ ایضاً جلد اول صفحات ۴۰۰ و ۴۰۱، مطبوعہ ۱۹۲۰ء آکسفورڈ۔ صفحہ ۲۹۰ نوٹ ۲
۱۸۷۳ء۔ ۲۰۸۔ ایضاً جلد اول صفحہ ۲۵، ۱۸۷۳ء و ۳۵۰، ۱۹۲۰ء۔ ۲۰۹۔ تحریر المرأة،
صفحہ ۱۳۳، مصر ۱۸۹۹ء۔ ۲۱۰۔ تیز احساس والے

بے معنی یادگار قرار دیتے ہیں[۲۱۱]۔ اپنی صنفِ لطیف یا صنفِ نازک سے ان کا خطاب ہوتا ہے :-

چشمِ نامحرم کو برقِ حُسن کردیتی ہے بند
دامنِ عصمت ترا آلودگی سے پاک ہے

ایک صدی پہلے انھیں اصلاح کوشوں کے بزرگ، پیشرو اور پیشوا اسی پردے کے عادی تھے۔ مُعترِف[۲۱۲] و مدّاح تھے۔ اس کے وجود و بقا پر فخر و مباہات فرماتے تھے۔ فرنگیوں کی وہ کون سی قوم یا شاخ تھی جو اُس وقت عورتوں کی پردہ نشینی کو مستحسن نہیں سمجھتی، اچھائی کی نگاہ سے نہیں دیکھتی تھی۔ فرانس کے فارسیین (فریسیین)[۲۱۳] (FARISIANS)، اطالیہ کے لنگوبارڈے[۲۱۴] LANGOB-ARDI۔ ہسپانیہ کے وزی گوتھ (VIS-GOTHS)[۲۱۵] سب اسی لباس میں ملفوف و ملحوف اور اسی رنگ میں شرابور تھے۔ اس کو وسط ایشیا سے لائے تھے۔ جو کاکا کی قدیم نسل اور تاتاریوں

---

[۲۱۱] تحریر المراۃ، از قاسم بک امین، مطبوعہ قاہرہ، ۱۳۱۶ھ صفحات ۴، ۵، ۶

[۲۱۲] تحریر المراۃ صفحہ ۵۶۔ [۲۱۳] دیکھیے فرہنگ وحواشی، نوٹ ۶۶۔

[۲۱۴] دیکھیے فرہنگ وحواشی نوٹ ۶۷۔ [۲۱۵] و [۲۱۶] دیکھیے فرہنگ وحواشی، نوٹ ۶۸۔

کا گہوارہ تھا۔[۲۱۴]

اسی پرانے رسم و رواج اور طریق عمل کی بنیاد پر ایک وحی حکیم ہم سے کل تک کہا کرتا تھا حَرِّرُوا اَنْفُسَکُمْ قَبْلَ تَحْرِیْرِ نِسَائِکُمْ اپنی عورتوں کو آزاد کرنے سے پہلے اپنے آپ کو آزاد کر لو۔ ایک دوسرا دانش مند سبق دیتا تھا "مرد کو چاہئے کہ عورت کو مطلق العنان نہ چھوڑے بلکہ اسے گھر کی چار دیواری میں رکھے۔ کیونکہ گھر بھی اس کی حریت کے لئے ایک وسیع دائرہ ہے"

بدھ مت پہلی صدی عیسوی میں ہندوستان سے چین کو گیا اور ہندوستانی عورتوں کی ساری پابندیاں بھی اپنے ساتھ لیتا گیا تھا۔[۲۱۵] چین کے مورخ تسلیم کرتے اور صاف طور پر لکھتے ہیں کہ عورتوں کے حقوق کو پامال کرنے کا ذرہ برابر خیال شروع شروع میں ہم اہل چین کے دل میں نہ تھا۔ لیکن کیا کرتے کہ "ہندوستانی فلسفہ کے ساتھ ساتھ یہ چیز بھی ہمارے ملک

---

[۲۱۴] ترجمہ راجستھان صفحہ ۱۳۴، انگریزی جلد اول صفحہ ۴۹، ۱۸۷۳ء۔

[۲۱۵] جنوبی افریقہ کے شورہ زار رہنے والوں کو بھی آجکل ایسی ہی شکایت ہے کہ یہ سفید فام اقوام (یورپین) سوشیل قاعدوں کی پیچیدہ کتابیں اور ان سے بھی زیادہ پیچیدہ طریقے (سسٹم) قوانین کے اپنے ساتھ لاتے اور ہماری گردن توڑتے ہیں۔

میں پہنچی اور رفتہ رفتہ جڑ پکڑ گئی۔[۲۱۹] پھر تو چین میں بھی وہی سب چیزیں ہو گئی تھیں جو ہندوستان میں تھیں۔ یعنی طلاق، بیوہ کی شادی کی ممانعت، عورت کو ترکہ نہ دیا جانا، پردہ اور گھر کی قید وغیرہ[۲۲۰]

میرے اہل وطن مجھے معاف فرمائیں۔ بہت سی بیجا سختیاں، جابرانہ سلوک اور ظلم تھے جو ہندوستان میں عورتوں پہ کیے جاتے تھے۔ محترم و بزرگ واضع آئین، منوجی[۲۲۱] کے حکم کے مطابق عورت کے لئے ضروری تھا کہ دن رات گھر کے مردوں کی خدمت میں مصروف رہے۔ وہ عدالت میں شہادت دینے کے حق سے محروم تھی۔ شوہر اُس کی آنکھوں کے سامنے قتل کر دیا جائے تو بھی اُس مظلوم کو اجازت نہ تھی کہ قاتل کا نام لے کر اُس پہ الزام لگا سکے۔

مگر ان ہی بزرگوں کا ایک قول ٹاڈ صاحب نے نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں "عورت ناخوش ہو تو گھر میں جگ ہوَن، پوجا پاٹ سے کچھ پھل نہیں ملتا۔ عورت کی بددعا سے خاندان تباہ ہو جاتا ہے[۲۲۲]"

---

۲۱۹ بلیٹن شائع کردہ کونسل نان کنگ BULLETIN BY COUNCIL OF INTERNATIONAL AFFAIRS NANKING.

۲۲۰ صحیفۂ چین مترجمہ اسد علی انوری، جامعہ ملیہ، صفحہ ۱۳۶ - بحوالہ چین کی نشاۃ ثانیہ از ڈاکٹر ہوشی۔ ۲۲۱ دیکھئے فرہنگ حواشی نوٹ نمبر ۶۹۔ ۲۲۲ راجستھان ترجمہ انیق بار پنجم، صفحہ ۱۰۷۔

شعروں میں وعظ و نصیحت کے دفتر کھولنے والے بھگت تلسی داس نے جن کے تقدس کے ہمارے ابنائے وطن اور جن کی سچائی اور یکتائی فن کے ہم بھی قائل ہیں رامائن میں ہم کو یہ سبق دیا ہے :-

ڈھول، گنوار، شودر، پشو، ناری

یہ سب ہیں تاڑن کے ادھکاری

اس اشلوک کے معنی یہ ہیں کہ ڈھول، دیہاتی گنوار، چھوٹی ذات کے آدمی، جانور اور عورتیں، یہ پانچوں زدوکوب ہی کے مستحق ہیں، سزا ہی سے ٹھیک رہتے ہیں۔ آج کل (اکتوبر ۱۹۴۲ء میں) یہ چوپائی لوگوں کی زبان پر بہت چڑھی ہوئی ہے۔ ایک زنانہ اسکول کی لڑکیوں نے ایسے سبق سے تنفر و گریز کا اظہار کیا ہے۔ اخبارات و جرائد اسکے مخالف و موافق مضامین اور تحریریں شائع کر رہے ہیں۔

عورت کی نسبت اب بھی دعوے سے کہا جاتا ہے :-

تریا میں گن تین ہیں روگن ہیں لاکھ چار

یعنی عورت کی جنس میں صرف تین خوبیاں ہیں مگر عیب چار لاکھ ہیں۔ ایک دوسری ضرب المثل ہے :-

مکھی، مچھلی، استری، تینوں ذات کجات۔[۴۲۳]

---

[۴۲۳] از مسٹر حمید، رسالہ شاہکار لاہور، فروری ۱۹۴۳ء، صفحہ ۲۵۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ مکھی، مچھلی اور عورت تینوں فطرۃً ذلیل ہیں کہا جاتا ہے کہ کسی قوم یا ملک کی اصلی حالت اور خیالات کو دیکھنا ہو تو اُس کے مقولوں، مثلوں اور استعاروں پر نظر ڈالی جائے۔ یہ اگر صحیح ہے تو ہندی میں ایسی کہاوتیں بے شمار ہیں جن سے عورت کے حقیر و ذلیل ہونے کا ثبوت ملتا ہے ؎

اُس کو بھی حسن آفریں رسوا کرے
اے حسیں! جس نے تجھے رسوا کیا

منشی مہاراج بہادر برق نے میراں بائی کی خدا شناسی، وجدان و عرفان کی کیفیت ایک سخنورانہ تاریخی نظم میں یہ دکھائی ہے[۴۲]۔ اکبر اور تان سین اُس کی محویت و استغراق کو دیکھنے اور میراں کے دریائے نغمات و ترنم کی لہروں سے کھیلنے کے لئے خود پہنچتے ہیں مست الست رانی کسی اور ہی عالم میں ہے۔ جب آنکھیں کھولتی ہے۔ دونوں پرنام کرتے اور رانی کے قدموں پر سر جھکا دیتے ہیں عقیدت کی نذر ہیروں کی بیش قیمت مالا پیش کی جاتی ہے۔ جس کو میراں

---

[۴۲] صفحات ۸۹ تا ۹۳، مطبع انوار دہلی ۱۹۲۹ء۔ میرا بائی کے حالات مسٹر ولیم کروک نے نوٹ نمبر ۳ صفحہ ۳۳، تاریخ ٹاڈ جلد اول، مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۲۰ء میں تحریر کئے ہیں۔

مورتی کے گلے میں ڈال دیتی ہے۔ پھر بھی۔

جب رانا نے یہ حال سُنا — تو فرطِ غضب سے آگ ہوا
ننگ و رسوائی کا باعث — میراں کا تیا پانچا تیاگ ہوا
دل میں یہ خیالِ خام آیا — میواڑ کی عزت خاک ہوئی
کیوں پیشِ نگاہِ نامحرم — میراں اتنی بے باک ہوئی

زہر ہلاہل کا ایک پیالہ رانا اس میں بھیجا جاتا ہے۔ میراں بے تکلف و بے وسواس بھگوان کا نام لے کر پی جاتی ہے۔ زہر بے اثر ثابت ہوتا ہے۔ رانا کی بازی مات کھا جاتی ہے۔ تو میراں کو دیس نکالا دیا جاتا ہے۔ بروگن، جو گنوں کا لباس پہنکر شاہی محل سے نکلتی ہے۔ بندرابن کی راہ لیتی ہے۔

یہ حسن و عشق کی داستان نہایت دلاویز و لطیف ہے۔ سننے سنانے کے قابل۔ مگر دراز۔ لکھنے والا اس چھوٹی سی کتاب کی تنگ دامانی سے مجبور ہے۔ اس لئے مرحوم اصغر گونڈوی کے اس تبصرہ پر ختم کرتا ہے۔

"میراں بائی کی نظم میں یہ کیفیت اور زیادہ متلاطم ہو کر سوز و درد، جوش و خروش، بھگتی اور نیازمندی کا آتش کدہ بن گئی ہے"[۲۵]

---

[۲۵] نمبر صفحہ ۵۵، ایضاً۔ (مطلع انوار)

آخر یہ سب کچھ اسی بے پردگی کی سزا تھی یا رانا کے رشک و غیرتمندی کا تقاضا تھا۔ میراں کی، ایک بے اختیار جھلک، زیادہ سے زیادہ ایک غلط انداز نظر ایک شخصِ غیر یا نامحرم نے دیکھ لی تھی!۔

اس کو ایک عجمی پیر مرد کی بزرگانہ پند و نصیحت کہوں یا اپنی آنکھوں کے دیکھے، فرشتہ سیرت، ملائک صورت، سخن سنج کی شاعرانہ تخئیل سمجھوں، یا دونوں کی مشترک مفید تعلیم پر محمول کروں۔ مگر اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ زندۂ جاوید حالی[۴۲۶] نے اس معاملت پر گہری نگاہ ڈالی ہے۔ آج سے بیسیوں صدی پہلے کی حالت، انسانی فطرت اور رنگ ڈھنگ سے آگاہی دی ہے بے حجابی اور نظر بازی کے نیکے اور اس کے اثر و نتائج سے پردہ اٹھایا ہے۔

زال کی پہلی ہی یہ رستم سے نصیحت تھی
زد میں تیر صفِ مژگاں کے نہ جانا ہرگز
عشق بھی تاک میں رہتا ہے نظر بازوں کے
دیکھنا شیر ہی آنکھیں نہ لڑانا ہرگز

مغلوں کے دورِ ترقی اور عروجِ اقبال میں بیگمات اور امیر زادیوں کے پردے کے متعلق جو تکلف اور اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس کی جھلک

---

[۴۲۶] ۳۴ ۱۳۳۳ھ ۔ جنوری ۱۹۱۵ء میں وفات پائی۔

اُس وقت کے شعرا کے کلام میں اب بھی نظر آ جاتی ہے۔ مثلاً ایک ہی شاہزادی کی قدر شناسی و فیاضی کو لیجئے۔ (۱) طہران کا رہنے والا میر صیدی شاعر گھومتا پھرتا دہلی پہنچتا ہے۔ شاہ جہاں کے خوانِ نعمت سے زلّہ ربائی کرتا ہے۔ اتفاقاً ایک روز ایک باغ[۴۲۷] کے کسی گوشہ میں ٹہلتا ہوتا ہے کہ سلطنت کے لعلِ شب چراغ جہان آرا بیگم[۴۲۸] کی آمد آمد کا غلغلہ سنتا ہے۔ بیگم ہودج میں ہے۔ برقع اوڑھے ہوئے ہاتھی پر سوار ہے۔ چاند سے چہرے پر نقاب پڑا ہے۔ ہاتھی اُسی طرف آ رہا ہے جدھر شاعر کھڑا ہے۔ جلوس قریب پہنچتا ہے تو فاقہ مست صیدی صدا دیتا ہے:-

بُرقع بَرُخ افگندہ برد ناز بہ باغش
تا نکہتِ گل بیختہ آید بہ دماغش

[چہرہ پر برقع ڈال کر باغ میں ناز سے اس لئے جاتی ہے کہ پھول کی خوشبو چھن چھن کر دماغ میں آئے۔]

دوشیزہ خاتون برا مان جاتی ہے۔ ہاتھی اُلٹے پاؤں واپس کیا جاتا ہے۔

---

[۴۲۷] جو بیگم نے وسط شاہ جہان آباد میں خود آباد کیا تھا۔ [۴۲۸] شاہ جہاں بادشاہ کی بیٹی۔ ممتاز محل کے بطن سے۔ بقول مسٹر بیل "دنیا کی کوئی بھی ایسی خوبی نہ تھی جو اس حسین و عفیفہ لڑکی، اس فیاض و عالی حوصلہ شہزادی" (باقی صفحہ آئندہ پر)

گزارد شاعر حضوری میں کشاں کشاں طلب ہوتا ہے۔ اپنے لطیف و بے ساختہ شعر کا انعام پانچ ہزار روپیہ پاتا ہے۔ ساتھ ہی یہ حکم کہ شہر سے باہر چلے جاؤ۔ رخصت ہے[۴۲۹]

(۲) ایک اور سخن ور شیخ محمد علی ماہر اسی حوصلہ مند شاہزادی کی شان میں مثنوی لکھ کر بھیجتا ہے۔ پہلے ہی شعر

بذاتِ او صفاتِ کردگار است
کہ خود پنہاں و فیضش آشکار است

کو پڑھ کر بیگم محظوظ ہو جاتی ہے۔ پان سو روپیہ صلہ عطا ہوتا ہے[۴۳۰]

عالی مرتبت خاتونوں کے پردے اور حجاب کے بارے میں

(بقیہ صفحہ گزشتہ) اس باکمال و دلیر بیگم کے حصہ میں نہ آئی ہو۔ اوراق تاریخ اس کی نظیر بتانے سے قاصر ہیں۔ ڈکشنری صفحہ ۱۲۷۔ منتخبات اللغون، امین الدین خاں ہروی (نسخہ قلمی) ورق ۲۳۰ میں جہاں آرا کے حالات، کپڑوں میں آگ لگ جانا۔ حکیم داؤد کا علاج تفصیلاً مرقوم ہے۔ [۴۲۹] دستہ گل، ادبی، از رستم مسانی، مطبوعہ طہران ۱۳۱۲ھ، صفحہ ۱۹۔ خزانہ عامرہ، صفحہ ۳۹۳، بحوالہ مجمع النفائس از خان آرزو۔ بہ تغیر خفیف سرو آزاد کی بھی یہی روایت ہے۔ صفحہ ۱۱۱۔ نتائج الافکار، صفحہ ۳۶۰ مطبوعہ مدراس ۱۲۸۳ھ، شمع انجمن از نواب صدیق حسن خان، صفحہ ۴۰۵۔ تذکرہ حسینی صفحہ ۱۹۳
[۴۳۰] خزانہ عامرہ، صفحہ ۴۱۵۔ بحوالہ کلمات الشعرا از سرخوش، سرو آزاد، صفحہ ۱۱۳۔

اس سے بڑھ کر نازک خیالی اور خیال آرائی کی کیا مثال ہو سکتی ہے! ابھی بے پردگی اور بے اعتدالی کی بدولت جب یورپ کی سوسائٹی کی حالت ناگفتہ بن گئی تھی۔ آپ کی یاد، اور ہمارے لیے کل کی بات ہے۔ مس ماڈ (MAUDE) سی شایستہ وذی روح لیڈیاں تہذیب و وقار و تمکین سے ترقی فرما کر جب برہنہ و عریاں ناچنے پر کمر بستہ ہو گئی تھیں تو آسکر براؤننگ (OSCAR BROWNING) سا راست گو، حق شناس بھی شرما گیا تھا۔ اُس نے آپ کے ملک و وطن کی رسم پردہ داری کی علانیہ داد دی تھی۔

اصفہان کا فلسفی شاعر، مرزا صائب[۱۴۳] جو عہد جہانگیر میں ہندوستان آیا تھا اور چھ سات سال سیر و سیاحت کر کے ایران واپس گیا، اپنے عقیدتمندوں کو یہ سبق دیتا تھا۔

حسن چوں بے پردہ شد زنہار گردِ او مگرد
بوئے خوں می آید از تیغے کہ عریاں می شود

---

۱۴۳ وفات ۱۰۸۱ھ (۱۶۶۹ء) سرو آزاد صفحات ۹۸ تا ۱۰۳۔ صائب تمثیل و تشبیہ کا مانا ہوا بادشاہ ہے۔ فارسی گو شعرا میں کوئی اس کا حریف مقابل نہیں۔ وہ واردات قلبیہ اور جذباتِ عشق کو بھی تشبیہات کے رنگ اور وعظ و نصائح کے پیرایہ میں پیش کرتا اور عبرت و دانش کے سبق سے مالا مال کر دیتا ہے۔ مشاہیر اہل سخن سے ملا غنی کشمیری اور مرزا جاناں مظہر اسکے بہترین متبع اور تمثیلات و تشبیہات کے قادر الکلام استاد گزرے ہیں۔

کرنیل ٹاڈ نے اپنی تاریخ کے باب ۲۲ میں میواڑ کے تہوار و ل اور رسموں کے تحت میں اُس ادب و لحاظ پر توجہ دلائی ہے۔ جو راجستھان میں پایا جاتا، عورتوں کے ساتھ برتا جاتا تھا۔[۲۴۳] فرماتے ہیں کہ ان کا پردہ میں رہنا ان کے درجے کی کمی یا کسی تحقیر کے مرادف نہ تھا۔[۲۴۴] موصوف ایک دوسرے موقع پر "پس پردہ خواتین" کے عنوان سے تحریر کرتے ہیں کہ راجپوت اپنے اخلاق اور میل جول میں بڑا متواضع اور خوش خلق ہوتا ہے... بایں ہمہ باحجاب رہنے والے، خلوت نشین، عزلت گزین طبقہ کی نسبت ذراسی شوخی و آزادی روا نہیں رکھتا۔ اُسکو رشک و حسد یا رقابت کی آنکھ سے دیکھتا ہے، حُسن دوست جوان سال کرنیل کی زبان پر ان رقیبانہ نگہداشت والی بیویوں (یا اُن کی زبان میں "زنانہ") کا ذکر حسرت کے ساتھ بار بار آیا ہے۔[۲۴۵] شاید کسی خیالی یا حقیقی معشوق کو سنا رہی ہیں۔

ادھر مرا دل تڑپ رہا ہے، تری جوانی کی جستجو میں
اُدھر ترے دل کی آرزو میں مچل رہا ہے شباب تیرا

میں نے اس بارہ میں بھی غور کیا ہے اور اس کے موقع پر تفصیل سے

---

[۲۴۳] دیکھیے آغاز کتاب میں راجپوت پر میرا مقالہ نمبر ۱۵۔ [۲۴۴] ہم معنی، سنہ ۲۴۲ جلد اول صفحہ ۵۶۳، سنہ ۱۹۲۰ء آکسفورڈ۔ [۲۴۵] جلد اول صفحہ ۳۰۹، سنہ ۱۹۲۰ء آکسفورڈ جلد دوم صفحہ ۷۴۲، سنہ ۱۹۲۰ء کلکتہ۔

ساتھ لکھوں گا کہ شاہی محلات کی زندگی ایک بڑی حد تک اِنھیں رانیوں
ہی کے لئے نہیں (بلکہ اِن کی مسلمان سوتنوں کے لئے بھی) ایک خاموش،
بے لطف اور تنہائی و عُزلت کی اجیرن زندگی ہوتی ہوگی۔ جسے
ہمارے زعم و گمان کے مطابق یا فلسفیانہ اصطلاح میں "بے روح"
کہنا روا ہے۔ تمام رانیاں، ساری بیگمات ایک دوسرے سے الگ تھلگ
رہتی تھیں یا رکھی جاتی تھیں۔ یکجائی و اجتماع کے موقعے بہت کم نصیب
ہوتے تھے۔ اُنس و اختلاط، لطفِ صحبت، سُرور و نشاط معدوم
تھا۔ تاہم یہ امر بجائے خود برقرار و قائم رہتا ہے کہ ان کا پردہ سب
کا پردہ کسی طرح تکلیف دہ نہیں ہوتا تھا۔ برائے نام بھی کوئی
بندش نہ تھی۔ جو کچھ تھی، یہی ادب گاہِ محبت تھی اور نگاہِ ناز کا تازیانہ۔
کہا جاتا ہے کہ ہرودطس بھی اسی حقیقت کا شاہد یا اسی خیال کا مؤید
تھا[۴۲۶]۔ بالفاظ دیگر انھیں حضرات کا ہم آہنگ و ہم نوا بھی۔

پردے کے ساتھ ساتھ اپنے اعزہ و اقربا سے ان رانیوں کے
تعلقات، میل جول پر نظر ڈالنی ہوگی، جو ازدواجی زندگی کے روح
رواں یا زبردست عُنصر مانے جاتے ہیں۔ مورخین کا اتفاق ہے کہ

---

۴۲۶ ہرودوٹس مرتبہ جی راولنسن مطبوعہ لندن ۱۸۵۸ء ترجمہ راجستھان جلد اول،
صفحہ ۱۰۷۔ مسلمانانِ ہند کا رسم و رواج (انگریزی) مطبوعہ ۱۸۶۳ء مدراس۔

مغلوں کے شاہی محلّات کی تمام رسمت رسوم کا سرانجام، حرم سرا کی نگرانی، وہاں کا کُل کارخانہ، کُل کاروبار انھیں چھتری بچوں، وفادار و سرفروش و سرباز ہند و سرداروں کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ جزو و کل کا انحصار انھیں پر تھا۔ بیگمات و مستورات حتیٰ کہ مہدِ علیا، سترِ معلّٰی، شہنشاہ کی والدہ مریم مکانی کی سواری ہوتی تو راجہ بھگوان داس[۴۲۷]، ورنہ کوئی نہ کوئی اور راجہ ہمرکاب جاتا تھا۔ ان منقربانِ بارگاہِ سلطانی اور عزیزانِ حرمِ خسروانی کی بے پیکر روحوں سے یہ تو پوچھیئے کبھی کسی شاہزادی یا بادشاہ بیگم کی پرچھائیں چلمن کی آڑ یا جالیوں کی اوٹ سے دیکھ پائی تھی؟ کوئی آواز کبھی سنی تھی؟ یا کسی رانی کے ہیبت و عظمت والے گھونگھٹ کی طرف آنکھ اٹھانے کی بھی جرأت ہوئی تھی۔[۴۲۸]

جہانگیر نے بھی اپنی "تزک" میں ایسے ہی بعض اپنی دانست میں اہم واقعات کو جگہ دی ہے۔ مخدراتِ عظمیٰ کے سفر، اہتمام و انصرام اور جلوس کے تزک و احتشام کا کچھ تذکرہ تاریخ الہ آباد میں بھی کر چکا ہوں۔[۴۲۹] وقت مناسب پر ان باتوں کو اور پھیلا کر اور بڑھا کر لکھنا ہوگا۔

---

۴۲۷ دربار اکبری صفحہ ۴۶۴۔ ۴۲۸ دیکھئے فرہنگ و حواشی نوٹ ۷۰۔

۴۲۹ جلد اول صفحہ ۹۹، نوٹ ۴۔ نیز ترجمہ ٹاڈ، صفحہ ۳۰۴

اس بارہ میں ایک پرانی روایت بھی سن لیجئے۔ شمس سراج عفیف فرماتے ہیں "تاتارخان اعظم نے عورتوں کی پردہ دار سواری کے لئے ..... گردون ہا راست کنایندہ بود کہ آں را بزبان ہندی "بہر کہ" گویند۔" یہ رتھ اپنے سونے چاندی کے خولوں اور لال لال بانات پردوں کے ساتھ آج بھی موجود ہیں۔ اُن کی ساخت، ان کے دروازوں، ان کے گنبدوں میں ہندوستانی گھروں کی اچھی خاصی صورت کشی نظر آتی ہے۔

چشم بد دُور ہمارے ملک میں زنانہ سواریوں کی کم و بیش وہی شکل و صورت چلی آتی ہے۔ ویسی ہی ڈھنکی مُوندی گاڑیاں، کھٹولے، پالکیاں، وہی ارغوانی مخملی چادریں اور غلاف، ویسے ہی ہاتھی کے ہودے (حوضے) پردہ دار عماریاں سب کی سب موجود و برقرار ہیں۔

بعض پردہ دار رتھ کئی درجے کے ہوتے ہیں۔ جن میں وزن کی مناسبت عظمت و شان کے لحاظ سے ہاتھی جوتے جاتے ہیں۔ راجپوتوں کے اکثر معزز قبائل خصوصاً بندیلے دیوانو دبند چھر

صفحہ ۲۹۳۔ نقد سخن سلیمانی صفحہ ۶۴۔ ۱۲۴ خزانہ عامرہ۔ صفحہ ۳۲۹۔

سلسلہ آصفیہ جلد اول صفحہ ۵۰۔ ٹیورنیر فرانسیسی تاجر کی سیاحت مطبوعہ ۱۹۶ء

میں اب تک پردہ کا بڑا رواج ہے۔ راجاؤں اور سرداروں کی منکوحہ و محبوبہ غیر جنس کی عورتیں تھی جو "خواص" کہلاتی ہیں اس رواج کی پابند ہوتی ہیں۔[۲۴۲]

نواب قائم خاں (مسند نشین فرخ آباد) کی بڑی یعنی پہلی بی بی شاہ بیگم تھی۔ شاہ بیگم جب اپنی خوشدامن سے ملنے اپنی قیامگاہ موضع امیٹھی سے شہر فرخ آباد کو آتی تھی تو بازار بند ہو جاتے تھے۔ دوکاندار اس کو "ہاٹ بازار" یا "ہڑتال" کہتے تھے۔ مصلحت یہ تھی کہ بیگم کے کان میں کوئی بے ہودہ بات پڑنے نہ پائے۔ بیگم ایک جو بیسی بیل گاڑی میں سوار ہوتی تھی جو اوپر سے نیچے تک بانات کی پردہ سے ڈھنکی رہتی تھی۔ بیگم کی نشست وسط میں ہوتی تھی۔ گرداگرد کنارے کنارے کنیزیں بیٹھتی تھیں۔ پردے ریشم کی ڈوریوں سے بندھے ہوتے تھے۔ گاڑی ہر طرف سے بند ہوتی تھی۔ ایک بوڑھی عورت آگے بیٹھتی تھی۔ ایک بوڑھا گاڑی بان ہانکتا تھا۔ بیگم صاحبہ راستہ بھر خاموش رہتی تھیں۔ خواجہ سرا گھوڑوں پر سوار ہو کر کچھ فاصلہ پر پیچھے چلتے تھے۔[۲۴۳] مسٹر آرون (IRVINE) لکھتے ہیں کہ ایک

---

۲۴۲ تاریخ آئینہ بندیل کھنڈ وغیرہ صفحہ ۱۰۳ ۔ ۲۴۳ تاریخ نوابان بنگش فرخ آباد ترجمہ صفحہ ۱۹۵ مطبع حسنی فتح گڈھ ۔

معمولی یا دستور یہ بھی تھا کہ نواب کی مستورات و محلّات کا زیور سلمانوں کے سوا کوئی چھونے نہیں پاتا تھا نہ ان کے کپڑے کوئی مرد سینے پاتا تھا۔ ان عورتوں کی نبض دیکھنے کی اجازت بھی طبیبوں کو نہ تھی ۲۴۴

ہمارے مختلف ہم وطن ایشیا نژاد قبائل سے قطع نظر کیجئے جن میں پردے کی نسبت بہت کم اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن آپ کے سامنے تو یہ اطلاع بھی موجود ہے کہ جب دلّی کے بعض شاہزادوں اور شاہزادیوں کی شادی و مواصلت نامور انگریز خاندانوں میں ہونے لگی ہے تو ان یورپین کنبوں یا شاخوں میں پردے کا ضبط و پابندی اس کے پیشتر ہی سے قائم ہو جاتی تھی۔ یکجائی بود و باش، باہمی اتحاد و اختلاط نے دونوں مختلف المعاشرت، مختلف المزاج، مختلف النسل جماعتوں کو اس بارۂ خاص میں ایک کر دیا تھا۔ آخر مارچ ۱۸۳۵ء میں کرنیل گارڈنر والی مشہور انگریزوں اور مغلوں کی قرابت ہوئی ہے ۲۴۵ غیر ملکی سیاح اور اہل قلم بالاتفاق لکھتے ہیں کہ یہ (صاحب) لوگ

---

۲۴۴ ایضاً صفحہ ۱۹۵ - ۲۴۵ جیمس گارڈنر کی شادی ملکہ زمانی بیگم اکبر شاہ ثانی کی بھتیجی سے - ڈیڑھ سو برس پہلے - سوسن گارڈنر (SUSANNE GARDNER) کا بیاہ مرزا انجم شکوہ پسر سلیمان شکوہ - بہادر شاہ کے چچیرے بھائی سے -

پردے کے اس قدر پابند ہیں کہ سوائے قریبی رشتہ داروں کے اور کوئی رشتہ دار محل سرا میں نہیں جا سکتا ہے۔ صرف باپ اور دادا کے لئے کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ چچا، تاؤ اور بھائی خاص خاص موقعوں پر باریاب ہو سکتے ہیں۔[۲۴۶]

شیخ محمد علی حزیں اصفہانی (مدفون بنارس ۱۱۸۰ھ) نامور مصنف و شاعر فرماتے ہیں:۔

ہست نقاب دلبراں شرم و حجاب و خال و خط
تیغ برہنہ گفتہ ام حسن برہنہ روے را[۲۴۷]

یہ تو تصویر کا ایک ہی رُخ ہے۔ بعض اہل الرائے اور صاحبان بصیرت ان باتوں کو میری قدامت پسندی، کوتاہ نظری اور تاریک خیالی پر محمول فرمائیں گے۔ اپنی خامیوں اور مجبوریوں کا مجھے احساس ہے۔ ناکامیوں اور حسرت نوازیوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کہ اس تصویر کا کوئی اور روشن پہلو بہ آسانی سامنے آجانے کے توقعات میرے لئے معدوم کم سے کم فی الحال میری نگاہ و دسترس سے دور ہیں۔ پھر بھی مایوس نہیں۔ حقیقت شناس فلسفی "عورت" ہی کا نام "حسن" بتاتا ہے۔ میرے حسن پرست، رنگین منش، توفیق

---

۲۴۶ مخزن، نمبر اول، جلد اول، صفحہ ۱۹، اپریل ۱۹۰۱ء۔ ۲۴۷ کلیاتِ حزیں، صفحہ ۷۷۔

مزاجِ دوست مطمئن رہیں کہ میری کوششیں عنقریب بار آور ہوں گی اور ان کی خواہشیں اور امیدیں کامیابی کا تاج پہنیں گی۔ منتقد بنے گا۔ خوش نصیب دیکھنے والے اور لکھنے والے کو محاسن و لطافت نسوانی پر نظرِ غائر ڈالنے کا موقع ملے گا۔ بنی نوع آدم کی نصفِ نفیس و صنفِ نازک سے اس کا روئے خطاب ہوگا۔

جلوۂ حسن ترا پردہ سے مانوس نہیں
تو ہے وہ شمع جسے حاجتِ فانوس نہیں

فرہنگ و حواشی

اس کتاب [راجپوت اور مغل زن و شو کی معاشرت] کے متعلق بعض ۱۔ اشخاص و اقوام کے تذکرے اور تاریخیں ۲۔ ممالک کی تعریفات اور حدود ۳۔ شہروں کی خصوصیات ، واولیات و امتیازات ۴۔ مراسم اور رواجوں کے ذکر مذکور ، ۵۔ چند اصطلاحات کی تشریحیں ۶۔ متفرق علمی باتیں اور ضروری مباحث ۔

صفحہ ۵ ۔ پہلا مقالہ ۔ راجپوت

ہندو اہل قلم لکھتے ہیں کہ یہ لفظ مسلمانوں کی ایجاد ہے ۔ کم ازکم ان کی بدولت زبان زد عوام ہوا ہے ۔ سنسکرت کے "راج پتر" سے بگڑ کر بنا ہے جو قدیم زمانہ میں راجاؤں کے بیٹوں ، کماروں اور خاندان والوں کے لئے مخصوص تھا ۔ مسلمانوں کا دور دورہ ہوا تو وہ شاہی خاندانوں کے چھتریوں کو بالعموم یہ کہنے لگے ۔ خود راجپوتوں کا دعوےٰ ہے کہ وہ عہد عتیق ۱ کے چھتریوں کی اولاد ہیں ۔ یہ کھتی راج راسو" کا حوالہ دے کر اپنے کو " اگنی بنش "

---

۱ دیرینہ کہنہ گرامی و برگزیدہ ۔ ۲ راجپوت بھی کھشتری کہلاتے تھے ۔ ویدک ہند صفحہ ۔

بتاتے ہیں۔ کرنل ٹاڈ وغیرہ یورپین مورخ ان کو "سی تھین"[۳] (SCYTHIAN) یا سکولات) نسل سے لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر ونسنٹ اسمتھ بھی ان کے ہم خیال ہیں۔ فرماتے ہیں کہ باہر کے حملہ آوروں میں سے جو سردار اور امرا تھے ان کو برہمنوں نے چھتریوں اور راجپوتوں میں داخل کر لیا تھا۔ ادنیٰ طبقہ والے "گورجر" (گوجر) اور "جاٹ" رکھے گئے۔ ہندو تاریخ نویسوں کی تحقیقات سے یہ لوگ خالص آریہ اور چھتری نسل کے ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے ذیلی فرقے بہت ہیں۔ سورج بنسی، چندر بنسی، سوم بنسی، چوہان، سولنکی، پرہیار، پوار، کچھواہہ، ہاڈا، راٹھور، بھدوریہ، بھیرتا، چندراوت، وغیرہ۔

منوچی لکھتا ہے کہ یہ لوگ مختلف بتوں اور جانوروں کے نام کے ساتھ سنگھ کا لفظ لگا لیتے ہیں۔ بہ ہیئت مجموعی یہ لوگ پاک طینت، دھارمک اور اپنے قول کے پکے اور پورے ہوتے ہیں۔[۴]

نمک حلالی و وفا شعاری کے جوہر میں راجپوتوں نے بڑا حصہ پایا تھا۔ بات کے پکے اور تلوار کے سچے تھے۔ اپنے آقا و مالک پر فدا، نثار و

۳۔ سیتھیا کے رہنے والے سی تھیا (SCYTHIA) نہایت پرانا نام ہے۔ اس وسیع قطعۂ زمین کو دیا گیا تھا جو بحیرۂ اسود، بحیرہ خزر اور بحر ارال کے شمال اور مشرق میں واقع ہے۔

۴۔ منوچی، حصہ سوم صفحہ ۱۱۴۔

قربان ہو جاتے۔ راجا مہاراجہ ان کی قوت و امداد اور راست بازی وجاں نثاری پر اعتماد کرتے۔ یہ بھی وقت پر خوب کام آتے۔ صلے میں بڑی عزت اور جاگیریں پاتے تھے۔ اتفاق و اتحاد و محبت ان کی قومی خصوصیات میں داخل تھا۔

ایک پرانا سیاح و مورخ برنیر لکھتا ہے کہ لفظ راجپوت کے معنے ہیں "راجہ کا بیٹا"۔ یہ لوگ پشتہا پشت سے سپاہی پیشہ ہیں اور ابتدا عمر سے یہی تعلیم پاتے ہیں اور ان کے راجا معاش کے لئے اس شرط پہ ان کو جاگیریں دیا کرتے ہیں کہ جنگی ضرورت کے وقت اپنے آقا کی خدمت کے لئے حاضر ہو جائیں۔ لارڈ وغیرہ موروثی اُمرائے فرنگستان کی طرح ان راجپوت ٹھاکروں کو بھی اُس ملک کا خاندانی سردار کہا جاسکتا ہے بشرطیکہ اُن کی جاگیریں ناقابلِ ضبطی اور موروثی ہوں۔ یہ لوگ ابتدائے عمر سے افیون کھانے کے عادی ہوتے ہیں[۵]۔ چنانچہ ان کو افیون کے بڑے بڑے انٹے کھاتے دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ اور لڑائی کے دن تو یہ معمول سے دوگنی افیون کھاکر ایسے مدہوش سے ہو جاتے ہیں کہ بے فکر و اندیشہ اپنے آپ کو ہر ایک جان جوکھوں

---

[۵] تاریخ راجستھان سے پایا جاتا ہے کہ یہ لوگ پانی میں گھلی ہوئی افیون کو "عمل" کہتے ہیں اور افیون کھانے والے کو عملدار۔

میں ڈال دیتے ہیں۔ اگر کوئی راجہ خود بھی بہادر ہو تو اُس کے دل میں کبھی یہ خیال بھی نہیں گزرتا کہ میرے راجپوت کبھی کسی مشکل میں میرا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ لڑائی کے وقت یہ لوگ شاید اتنی بات کے تو محتاج ہیں کہ کوئی ان کا پیش پیش چلنے والا اور لڑانے والا ہو۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ اپنے رئیس کے سامنے جان دیدینا اپنا فخر سمجھتے ہیں اور اسکو دشمن کے ہاتھ میں کبھی نہیں چھوڑ دیتے۔ میدانِ جنگ میں جانے سے پہلے جب یہ افیون کے نشہ میں جھومتے ہوئے مرنے کے یقین سے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر رخصت ہوا کرتے ہیں تو یہ تماشا عجیب دلچسپ اور قابلِ دید ہوتا ہے اور اس صورت میں محلِ تعجب نہیں ہے کہ یہ مغل بادشاہ اگرچہ مسلمان اور بُت پرستوں کے مخالفِ مذہب ہیں لیکن بہت سے راجاؤں کو ہمیشہ اپنی ملازمت میں اور اکثر اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ ایسے ہی سلوک کرتے ہیں جیسے کہ اپنے مسلمان امیروں اور سرداروں کے ساتھ۔ اور مسلمان امیروں کے مانند اِن کو بھی فوج کی حکومتوں اور سرداریوں پر مقرر اور مامور کرتے ہیں۔[۶]

میر عبد اللطیف خاں شوستری جو منوچہر بن سام بن نریمان کے عہد اور کیقباد کے زمانہ میں رستم دستان کے ہندوستان آنے کے قائل و

۶۔ سیاحت نامہ برنیر جلد اول صفحات ۴۷ تا ۴۸۔

ناقل ہیں کہ اپنے دلچسپ سوانحِ حیات و سیاحت نامہ (مرتبہ ۱۲۱۷ھ = ۱۸۰۲ء) میں ہم جیسے نوآموزوں کے سمجھنے سمجھانے کے لئے "راجپوت" کو "شاہ توت" کے وزن پر اور بمعنی "اولادِ راجہ" لکھتے ہیں[۸]۔ مثال کے طور پر راجہ راج پوتان جے نگر والے کو بتلاتے ہیں[۹]۔ ایک دوسری ترکیب یا تفہیم "رایانِ راجپوت" بھی موصوف ہی کی ایجاد ہے[۱۰]۔

اس سلطنت میں اور رؤسا بھی ہیں جنھیں "زمیندار" کہتے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک ایسے طاقت ور ہیں کہ میدان میں کم و بیش چالیس ہزار سپاہی بندوقچی، تیر انداز اور بھالا بردار لا سکتے ہیں۔ یہ لوگ سوار نہیں رکھتے اور ان میں سے بہت سے جنگلوں کے اندر رہتے ہیں۔ اور عموماً مالیہ وغیرہ بھی ادا نہیں کرتے جب تک کہ زبردستی ان سے نہ لیا جائے۔ آج کل ساری سلطنت مغلیہ میں ان چھوٹے بڑے راجاؤں اور زمینداروں کی تعداد ملا کر پانچ ہزار سے زیادہ ہے[۱۱]۔

ملا طغرا مشہدی جو اپنے رنگین اشعار میں ہندی ترکیبات اور الفاظ[۱۲] کا استعمال بہت پسند کرتا تھا، فرماتا ہے:۔

---

[۸] کتاب تحفۃ العالم در سالہ ذیل التحفہ، مطبوعہ مطبع اسلامی بمبئی ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء صفحہ ۵۰۸ [۹] صفحہ ۵۴۷ [۹] صفحہ ۵۶۱ [۱۰] صفحہ ۵۴۷ - [۱۱] ہندوستان عہدِ مغلیہ میں، حصہ سوم، صفحہ ۱۲۰ -

شوخ سوسن را بگو دل می رباید تشقہ اَت
ذاتِ رجپوت ست ترسم دست بر حمبدھر کند

اس سے اس من چلے اور دل جلے طبقہ کی زود رنجی اور نازک مزاجی کا خوف عیاں ہوتا ہے۔

مرزا محمد کاظم منشی نے عالمگیر نامہ میں ان کی شجاعت و مردانگی کی داد ان الفاظ میں دی ہے۔

زبس راجپوتاں بہ پیکار و جنگ
گزشتند از جان بہ ناموس و ننگ
فتاد آں قدر کشتہ در کار زار
کہ شد بستہ راہِ گریزِ سوار
ز تیغ جہاد آتشے بر فروخت
کز و ہندوے جنگ جو زندہ سوخت

کرنیل ٹاڈ نے راجپوت امیروں کا مقابلہ مغربی تاریخوں سے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جہالت کا پردہ یورپ سے گیارہویں صدی میں اٹھا۔ (۲) راجپوت میں سرداری کی ساری خوبیاں پچھمی امیر کی موجود ہوتی تھیں۔ اور دماغی کمالات میں تو وہ کہیں بلکہ حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ تاریخ میں کوئی زمانہ ایسا نہیں ملتا کہ جب ہندو

شاہزادے دستخط نہ کرسکتے یا اپنا نام فرامین پر لکھنا نہ جانتے ہوں۔ بہت سے تو ایسے تھے جو خود ہی تیار کردیتے تھے۔ اور اگر ضرورت ہوتی تھی تو نظم ہی میں مرتب کردیتے تھے۔ یورپ کی اُس وقت (MIDDLE AGES) کی جفاکاری و ستم شعاری سے کیا مقابلہ کیا جائے۔[11]

کرنیل صاحب پھر بھی دونوں کا مقابلہ کرنے میں تامل نہیں فرماتے اور لکھتے ہیں کہ "رانائے اودے پور قلم و قلم کا فرمانروا اور خطوط نویسی و انشا پردازی میں کامل تھا۔ اور چارلیس دوم کی نسبت تو یہ مقولہ مشہور ہی ہے کہ HE NEVER WROTE A FOOLISH THING, AND SELDOM DID A WISE ONE. کہ اُس نے کبھی کوئی احمقانہ بات نہیں لکھی۔ اور شاذ و نادر ہی کوئی عاقلانہ کام کیا ہو۔[12]"

کچھ ایسا ہی تجربہ اور فیصلہ ہمارے زندہ و تابندہ معاصر جارج برنارڈ شا GEORGE BERNARD SHAW کا بھی ہے۔ فرماتے ہیں کہ انگلش مین (انگریز) کبھی غلط روی نہیں کرتا۔ وہ اصول جمہوریت نوازی کے لحاظ سے اپنے بادشاہ کا سر اوڑا دیتا ہے اور بادشاہ پسندی کے اصول پر "بادشاہم سلامت باد" کے نعرے لگاتا ہے۔

---

[11] صفحہ ۱۱۵، تاریخ راجستھان مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۹۴ء۔ [12] صفحہ ۵۵۸ راجستھان جلد اول مطبوعہ مدراس، ۱۸۷۳ء۔

معاصر یورپین سیاحوں اور مصنفین میں سے ایک ڈی لیسٹ ہے وہ لکھتا ہے[۱] کہ راجپوت بہت سی صدیوں سے اس سرحد پر جو بین ہندوستان اور اس کے متصلہ قطعاتِ ملک کے واقع ہے رہتے آئے ہیں۔ دین کے لحاظ سے بت پرست ہیں۔ یہ نہایت جنگ جو، بہادر اور لڑائی میں بخوبی تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ ان کے اسلحہ برچھی، تلوار اور ایک چھوٹی سی ڈھال ہوتی ہے۔ جو شہد کی مکھیوں کے چھتّے کی وضع پر بنائی جاتی ہے۔ تاکہ اس میں اپنے اونٹوں کے لئے پانی اور گھوڑوں کے لئے غلّہ (دانہ) بھی لے جا سکیں، جو نہایت درجہ مضبوط اور چالاک ہوتے ہیں۔ ان کے نعل کبھی نہیں باندھے جاتے۔ راجپوت ان پر نہایت چھوٹی عمر سے سوار ہونا سیکھ لیتے ہیں

منوچی (MANUCCI) اپنی تاریخ مغول میں رقم طراز ہے۔ یہ راجہ (راجپوت) بہادر اور طاقتور ہیں۔ اپنے بزرگوں کے رواجات کے بڑے پابند ہیں۔ جو ان کے بزرگوں کے دوست تھے ان کے دوست اور جو ان کے دشمن تھے ان کے دشمن ہیں۔ اور خواہ تنگ بھی ہوں مگر اپنے آباؤ اجداد کے قواعد کی پابندی پر بڑے کاربند رہتے ہیں۔ مغل بادشاہ ان لوگوں کے ان قاعدوں سے فائدہ اٹھاتا ہے اور جب ضرورت

---

[۱] سیاحت نامہ، صفحہ ۸۷۔

ہوتی ہے تو انھیں مدد دے کر ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے کام میں لگا دیتا ہے۔ ان کے یہاں پانچ پانسو برس تک دشمنی خاندانوں اور ریاستوں میں چلی آتی ہے[۱۵] یہ سب کے سب افیون کھاتے ہیں اور جنگ کے روز دگنی مقدار استعمال میں لاتے ہیں بلکہ اپنے گھوڑوں کو بھی کھلا دیتے ہیں تاکہ وہ تکان برداشت کر سکیں[۱۶]

راجپوت عورت کی بڑی عزت کرتے تھے[۱۷] یہ میڈیم راگوزن کی تحریر ہے۔ مہا مہو پادھیا گوری شنکر اوجھا فرماتے ہیں کہ عورتوں کا احترام زمانہ سلف بعید میں تو بہت کچھ کیا جاتا تھا۔ بڑا درجہ دیا جاتا تھا۔ ان کو اردھانگی یعنی "مردوں کے جسم کا نصف" نام دیا گیا تھا۔ راجپوتوں میں عورتوں کو تعلیم دینا خطرناک نہ سمجھا جاتا تھا[۱۸]

ان راجپوتوں، چھتریوں کے ساتھ ان کے نظام سلطنت نے کچھ رعایتیں بھی لگا رکھی تھیں۔ برہمنوں کی طرح خون کے جرم میں بھی ان کو قتل کی سزا نہیں دی جاتی تھی۔[۱۹] سنگین جرائم کی پاداش میں ان کی جائداد ضبط ہو سکتی تھی۔ ہو جاتی تھی اور جلا وطن کر دئے جاتے تھے۔ چوری کا جرم ثابت ہو جانے پر برہمن کو اندھا کر کے اس کا بایاں

---

۱۵ منوچی حصہ سوم، صفحہ ۱۱۷۔ ۱۶ ایضاً صفحہ ۱۱۴۔ ۱۷ ویدک ہند صفحہ ۱۲۶

۱۸ قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب مترجمہ پریم چند صفحہ ۷۵ ۱۹ کسی بُرے کام کے بدلے

ہاتھ اور داہنا پیر کاٹ لیا جاتا تھا۔ چھتری اندھا نہیں کیا جاتا تھا بنیے چھتریوں کا سماج میں بھی اونچا درجہ تھا۔[۲۱]

بھائی پرمانند سمنت ناخوش ہیں کہ "بھگوان داس نے دہلی میں اپنے رسوخ کو بڑھایا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں اس شخص نے اپنی لڑکی شاہزادہ سلیم کو شادی میں دے کر راجپوتی شان اور عزت مٹی میں ملادی تھی۔ باپ بیٹوں (راجہ بھارا مل[۲۲] اور راجہ بھگوان داس[۲۳]) نے مل کر کلہاڑے کا دستہ بن کر راجپوت قوم کے درخت کو کاٹنے میں کوئی کسر نہ رکھی۔ دہلی کے بادشاہوں کو کسی راجپوت کا اپنی لڑکی دیدینا ایک ایسا قومی گناہ تھا جس کی تلافی کبھی نہ ہوگی[۲۴]

---

۲۰ قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب، صفحہ ۱۹۵

۲۱ ایضاً، صفحہ ۵۲ - تاریخ فرشتہ - سیر المتاخرین - طبقات اکبری - طبقات اکبر شاہی - تاریخ نظامی - مختصر تاریخ راجپوتانہ - اکبر نامہ جلد سوم - مرآت واردات - تزک جہانگیری - مفتاح التواریخ صفحہ ۲۲۵ - خلاصۃ التواریخ - منتخب التواریخ بدایونی - مرقع اکبرآباد - مآثر الامرا شاہ نواز خاں - منتخب اللباب خافی خاں - مغل ایمپائر، مصنفہ کین (KEENE) دربار اکبری مولانا آزاد -

۲۲ بہارا مل "بہاری مل" دونوں صحیح ہیں - راجستھان، صفحات ۳۲۶ و ۳۲۷ - ۱۳

۲۳ خلاصۃ التواریخ صفحہ ۳۶۲ - بیل کی ڈکشنری صفحہ ۶۳ [۲۴] تاریخ راجستھان صفحات ۳۵۳ - ۴۵۴ - ۴۵۴ -

اس سے پیشتر وہ لکھ چکے تھے کہ "اُودا' رانا ئے میواڑ سے ہندو مورخ بہت ناراض ہیں۔ اُس کو ہتھیارا رانا لکھتے ہیں۔ اس نے بعض مصالح ملکی اور ہمسایہ حریف ریاستوں کی مخالفت وعناد سے صرف یہی نہیں کیا کہ وہ بہلول لودھی کے پاس دہلی جا پہنچا۔ میواڑ کو دہلی کا خراج گزار بنانے پر تیار ہو گیا بلکہ اپنی لڑکی بھی پیش کر دی۔ یہ ۱۴۷۴ء کا واقعہ ہے۔[۲۵] میں کہوں گا کہ رانا اودے سنگھ اور بہلول پر حصر وحد ٹھیک نہیں۔

اس گنا ہیست کہ در شہر شما نیز کنند۔ معمولی درباریوں اور امیروں سے قطع نظر کیجیے تو بھی ایسے بہت سے تاجداروں کے نام ملتے ہیں، جن کی محل سراؤں میں ایسی بی بیاں تھیں جو پہلے نا مسلمان تھیں مگر شوہروں کی محبت واتحاد اور جذباتِ عشق والفت نے اُن کو مسلمان بنا دیا تھا۔[۲۶] چند کا نام سن لیجیے۔ معز الدین سام اور راجہ اُچھہ کی بیٹی[۲۷] غیاث الدین خلجی اور رانی خورشید، راجہ بگلانا کی لڑکی۔[۲۸] ناصر الدین خلجی اور راجہ چھون داس کی بیٹی یعنی رانی جسے پوری[۲۹] نیز بھوانی دا[س]

۲۵؎ تاریخ راجستھان، صفحہ ۲۹۸۔ ۲۶؎ تاریخ الہ آباد، پہلی جلد، صفحہ ۱۰۵۔

۲۷؎ تاریخ فرشتہ، مقالہ دوم، صفحہ ۵۶۔ ۲۸؎ تاریخ فرشتہ، مقالہ پنجم، صفحہ ۲۵۷۔

تاریخ ظفر الوالہ بمظفر وآلہ، از حاجی دبیر، جزو دوم، صفحہ ۲۰۹۔ ۲۹؎ تاریخ فرشتہ

مقالہ پنجم، صفحہ ۲۶۲۔

پسر شودا س کی بیٹی، رانی چتوڑ[نمبر ۳۰]، وغیرہ

ہمارے جوشیلے مورخ کے غم و غصے کا جذبہ ابھی فرو نہیں ہوا ہے، وہ لکھتا ہے کہ "اکبر اور رانا پرتاب میواڑ کو چھوڑ کر دوسری راجپوت ریاستیں تقریباً تمام کی تمام امبیر، مارواڑ، اجمیر، بیکانیر، بوندی دہلی کی غلامی قبول کر چکی تھیں۔ اُن میں سے کتنوں نے اپنی لڑکیاں ترکوں کو بیاہ دی تھیں[۳۱]۔ پرتاب کے لئے یہ خیال بھی ناقابل برداشت تھا۔ وہ کبھی یہ سن ہی نہیں سکتا تھا کہ میواڑ ترک کو اپنی لڑکی دے سکتا ہے۔ یا ترک کے آگے اطاعت کر کے صلح کر سکتا ہے"[۳۲]

بھائی پرمانند تاریخ راجستھان میں رقم طراز ہیں کہ مارواڑ کے راجہ مال دیو نے اپنا بیٹا اودے سنگھ اکبر کے پاس سلام کے لئے بھیجا۔ وہ ناگور میں ملا۔ اکبر نے اُس کا خطاب راؤ سے راجہ کر دیا۔ اور جودھا بائی کو شادی میں دینے پر مارواڑ کا علاقہ دگنا کر دیا گیا۔ جس سے دو لاکھ پونڈ سالانہ آمدنی بڑھ گئی[۳۳]

دوسرے موقع پر لکھتے ہیں "موٹا راجہ نے اکبر کی نیتی (پھانسنے کی ڈول) کا شکار ہو کر جودھا بائی کی شادی بادشاہ کے ساتھ کی۔ اکبر نے مارواڑ

نمبر ۳۰ طبقات اکبری صفحہ ۵۰۳۔ ۳۱ تاریخ راجستھان، صفحہ ۲۵۵۔

۳۲ ایضاً، صفحہ ۲۵۸ ۳۳ صفحہ ۲۶۰

کے ساتھ اتنا علاقہ اور بڑھایا کہ اسکی آمدنی آگے سے دو چند ہوگئی[۳۴]

کرنیل مے لیسن بجا لکھتے کرنیل ٹاڈ تحریر کرتے ہیں کہ اکبر نے رشوت دیکر اس (لڑکی) کو حاصل کیا تھا۔ یعنی چار صوبے مرحمت فرمائے تھے جس سے مارواڑ (جودھ پور) کے محاصل دو چند ہوگئے تھے[۳۵]

مسٹر نانا لال مہتا نے ایک مقالہ موسومہ "ہندوستانی تمدن میں اسلام کا حصہ" تحقیق و تدبّر کے ساتھ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہندو کے نقطہ نظر سے یہ باہمی ازدواج دوستی و محبت کے گہوارہ جنبان نہ تھے۔ بلکہ یہ اُن کی تذلیل اور خود اپنے لوگوں کو اپنے جماعتی مدارج کی حرص و ہوا کے اندر رکھنے کی ناقابلیت ظاہر کرنے کی محض ایک صورت یا تدبیر تھی۔ اس لئے ان مخلوط شادیوں سے جو شاہی نسلیں یا اولاد ہوتی تھیں وہ اگر کوئی شئے بھی نہ ہوں تاہم بت پرست ہندوؤں کے لئے خالص خون والے مسلمانوں سے کہیں زیادہ مخالف و متعصب ہوتی تھیں۔ اس کے متعلق مجھے صرف فیروز تغلق اور شاہجہاں کا نام لے دینا کافی ہے[۳۶]

---

۳۴ صفحہ ۲۴۲۔ ۳۵ تاریخ اکبر صفحہ ۱۸ نیز ۱۲۰۔ ۳۶ کسی کام کو کرنے وقت اس کو سوچ سمجھ لینا۔ غور کر لینا۔ ۳۶ اخبار لیڈر صفحہ ۸ مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۲۵ء نیز تاریخ راجستھان صفحہ ۳۸۷ پر ملاحظہ۔

فیروز تغلق اس خاندان تیموریہ سے تعلق نہیں رکھتا ہے اس لئے اُسکے بارے میں بحث کرنا اور صفائی پیش کرنا ضروری نہیں۔ شاہجہاں کی نسبت یہ چند اقوال مختصراً نقل کر دینا کافی ہیں۔ ٹیورنیر صاحب کا بیان ہے کہ شاہجہاں کی حکومت ایسی عمدہ اور مشفقانہ تھی جیسی کہ باپ کی خاندان پر ہوتی ہے[۳۸] مسٹر اسٹینلے لین پول فرماتے ہیں کہ ہندو لکھنے والے شاہجہاں کے انصاف اور رواداری وغیرہ کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔[۳۹]

تیسری سند پروفیسر نجیب اشرف ندوی کی ہے۔ لکھتے ہیں:-

" راجپوتوں نے مسلمانوں کے ساتھ رشتہ قائم کر کے حصول حکومت و مقصد کا ایک اور راستہ پیدا کر لیا تھا۔ چنانچہ جہانگیر پہلا شخص ہے جسکے زمانہ میں بت خانہ بنانے کی بیر سنگھ دیو نے اجازت مانگی۔ اس سے پہلے اکبر جیسا بادشاہ تھا۔ لیکن تاریخ اس کی ایک مثال بھی نہیں پیش کر سکتی کہ اس کے زمانہ میں ایک بھی نئی عمارت بنی ہو۔ جہانگیر کے زمانہ میں خیر بہ اجازت ایک بت خانہ بنا' اور وہ بھی اس دولت سے جو ابوالفضل کو قتل کر کے حاصل کی گئی تھی[۴۰]۔ لیکن شاہجہاں کے عہد حکومت

---

[۳۸] اورنگ زیب اور زوال سلطنت مغلیہ مسٹر ولیم ولسن ہنٹر صفحہ ۱۵۔ [۳۹] تاریخ راجستھان صفحہ ۳۴۸۔ [۳۹] ایضاً صفحہ ۱۵۔ ترجمہ صفحہ ۱۴۔ [۴۰] یہ مقدمہ الکمندہ ہے (باقی صفحہ آئندہ پر)

ہی میں ہندوؤں نے صرف بنارس میں چھتر[۷۶] نئے بت خانے بنا ڈالے[۱] ... پھر جب دارا شکوہ جیسا ولی عہد ان کو مل گیا، اور اس کی ذات میں وہ ہندو مذہب و حکومت کا خواب دیکھنے لگے، تو انھوں نے ایک قدم اور بڑھایا اور مسجدوں کو توڑ کر بت خانے بنا ڈالے۔"[۱۴]

یہاں پہنچ کر خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان سلاطین اور بادشاہوں کے ساتھ ان راجپوتوں کا برتاؤ کیسا رہا؟ ان کے سلوک اور حسنِ عمل کی کیفیت کیا تھی؟ پروفیسر نجیب اشرف ندوی فرماتے ہیں "بابر[۴۲] کے ساتھ راجپوتوں کی بے وفائی اور کجروی خود ان کی شکست کا باعث ہوئی۔ رانا سانگا فتح پور سیکری میں مغلوب ہوا... ... بابر و ہمایوں کی تاریخ کا ایک ورق بھی ہم کو یہ نہیں بتاتا کہ ایک راجپوت

(بقیہ صفحۂ گزشتہ) جو بیر سنگھ دیو نے ۳۳ لاکھ کے صرف سے عالیشان اور منقوش تیار کروایا تھا۔ امرائے ہنود، صفحہ ۳۵۰۔ [۱۴] مقدمۂ رقعاتِ عالمگیر، صفحات ۳۳۵ تا ۳۴۶۔ بادشاہ نامہ عبد الحمید، جلد اول حصہ اول، صفحہ ۴۵۲۔ ہندو مذہب اور تصوف کی طرف دارا شکوہ کا میلان ہونے کے لئے ملاحظہ ہو سید صباح الدین عبد الرحمن کا مقالہ مندرجہ رسالہ "معارف" نمبر ۵ جلد ۸۰، صفحات ۳۴۸ تا ۳۵۶ و ۳۶۰، ۳۶۶۔ و مجمع البحرین (مترجمہ دارا شکوہ تصنیف)۔ مقالاتِ شبلی جلد ششم صفحہ ۱۰۱۔ [۴۲] ٹاڈ صاحب کی تاریخ مرتبہ و صحیحہ کروک کا صفحہ ۱۰۳، متعلق بابر۔

BADUR

نے بھی کسی وقت اُن کا ساتھ دیا ہو۔ ہمایوں کی شکست اور شیر شاہ کی فتح کا سب سے بڑا سبب یہی تھا[۱۴۳] لیکن جب مسلمانوں نے ان سے تعلقات قائم کیے، قرابتیں پیدا کیں تو ان کے جذبات وفاداری و جاں بازی کی کیفیت کچھ اور ہی تھی۔ اورنگ زیب، بدنام، ہندو کُش اورنگ زیب اور اُس کی پالیسی پر یہی غیور و باحمیت راجپوت فدا تھے۔ اسٹینلے لین پول STANLEY LANE-POOLE مشہور مصنف، مورخ و مُستشرق (ولادت ۱۸۵۴ء) کا بیان ہے کہ اسی مُلک کے بعض بعض راجا بیس بیس ہزار کا لشکر لے کر اورنگ زیب کی رفاقت میں لڑنے کو جاتے تھے اور ایسے راجاؤں کا شمار سَو سے متجاوز تھا[۱۴۴]

دہلی میں عموماً قلعہ میں پچاس ہزار سوار رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں اتنی ہی تعداد اور ہے جو ہر روز آتی جاتی رہتی ہے۔ بیس ہزار پیادہ فوج جو سب کے سب راجپوت ہیں یہاں موجود رہتی ہے۔ جن میں بارہ ہزار توپ خانہ کا چارج سنبھالے ہے اور باقی شاہی محل کی رکھوالی اور سنتری وغیرہ کے

---

[۱۴۳] مقدمہ رقعاتِ عالمگیر، مطبوعہ دار المصنفین، صفحات ۲۴۳ و ۲۴۵۔

[۱۴۴] سوانح اورنگ زیب، ترجمہ از مشاہیر فرمانروایانِ ہندوستان، صفحہ ۱۶۰۔ ٹاڈ صاحب کی تاریخ مرتبہ کروک، صفحات ۲۲۶ و ۱۷۹، ۳۴۹۔

فرائض انجام دیتی ہے۔[۴۵]

[مسٹر کروک لکھتے ہیں کہ "بائیس" ایک اصطلاح تھی جس کا اطلاق مغلوں کی فوج پر ہوتا تھا۔ غالباً یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ اس میں بائیس لاکھ آدمی تھے۔ "بائیسی" بھی کہلاتی تھی۔[۴۶]]

مہاراجہ جسونت سنگھ راٹھور[۴۷] والی جودھ پور کو راؤ بھاؤ سنگھ ہاڈا کی بہن بیاہی تھی۔ جسونت سنگھ نے جب اورنگ زیب سے بغاوت کرنا چاہی تو اس رانی کو بلا کر اس سے بھائی پر بہت دباؤ ڈلوایا کہ وہ بھی بادشاہ کے خلاف بغاوت میں اس کا ساتھ دے۔ لیکن راؤ بھاؤ سنگھ نے خاندانی تعلقات پر حق نمک کو مقدم سمجھا اور صاف انکار کر کے کہہ دیا کہ میں بادشاہ کا نمک حلال جاں نثار ہوں۔ نمک حرامی کا داغ لے کر دنیا سے ہٹ جانا چاہتا ہے۔[۴۸]

سید نجیب اشرف لکھتے ہیں کہ جسونت سنگھ کے ساتھ جو احسان اورنگ زیب نے کیا تھا اس کے بدلے میں اس نے بیوفائی کی ۔۔۔ اورنگ زیب نے اس غداری کے وقت کمال سکون سے کام کیا۔

۴۵؎ منوچی حصہ سوم، صفحہ ۱۰۰۔ ۴۶؎ تاریخ ٹاڈ، جلد سوم مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۲۰ء، صفحہ ۱۳۵۱۔ ۴۷؎ حیات جلیل، حصہ دوم، صفحہ ۶۳۔
۴۸؎ امرائے ہنود، صفحہ ۱۷۔

کسی قسم کی باز پرس نہیں کی۔ اس کے متعلق اگر کسی کو کچھ لکھا تو صرف اتنا کہ یہ ایک غیر راجپوتی فعل تھا۔ چنانچہ مرزا راجہ جے سنگھ کو لکھتا ہے" آنچہ جسونت سنگھ با خود کرد ہیچ دشمن نکند .. .. .. ما در عنایت و مرحمت نسبت باو باوجود تقصیرات و بے اخلاصی ہا کمی نکردہ ایم' آنچہ او کرد شاید ہیچ کم ذاتے یا سپاہیے نکند چہ جائے راجپوت از خانوادہ کلاں"[۴۹]

جسونت سنگھ اورنگ زیب و شجاع کی برادرانہ جنگ سے جب بھاگا تو امیر الامرا شائستہ خاں صوبہ دار اکبر آباد کو اورنگ زیب نے لکھا تھا کہ "جسونت سنگھ مرداتہ از جنگ و پشت کہ ترد غنیم آمدہ منزل کردیم گریختہ"[۵۰]

لیکن شاہزادہ اکبر کو اورنگ زیب نے جب جسونت سنگھ کے طریق عمل کی نسبت طعن کیا، دارا کا ساتھی بتایا۔ ایسے لوگوں پر اعتماد نہ کرنا، راجپوتوں پر۔ تو شاہزادہ نے باپ کو جواب دیا تھا کہ شاہنشاہ شاہ جہاں اِن کا رشتہ دار ہونے کی وجہ سے اِن کا عاشق زار تھا، اور انھیں کی شمشیر آبدار سے وہ شاہنشاہِ ہندوستان بن گیا تھا۔

---

[۴۹] مقدمۂ رقعاتِ عالمگیر، صفحات ۴۷۶ و ۴۷۷ قصص ہند حصہ دوم صفحہ ۱۳۱۔ [۵۰] رقعاتِ عالمگیری صفحہ ۲۹ - نول کشوری سنہ ۱۹۱۰ء

انھیں بہادروں کی مدد سے مشہور و معروف جرنیل مہابت خاں نے جہانگیر کو قید کرکے اپنے دشمن کو شکست دی تھی۔ اسی راجپوت نسل کے لوگوں نے حضور کی نظروں کے سامنے ہی کارہائے نمایاں انجام دئے تھے۔ راجپوت اپنی وفاداری کی وجہ سے تعریف کے مستحق ہیں۔[۵۱]

"ایک بات"۔ بعض دعویداران اتحاد و نصفت اپنی شعلہ آفرین و آتش افشاں تاریخ نگاری سے یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ بدنیت و بد اندیش عالمگیر نے جسونت سنگھ کے بچوں کو زبردستی مسلمان کر لینا چاہا تھا، جس سے راجپوتوں اور مسلمانوں کے باہم عداوت و عناد کی آگ بھڑک اُٹھی تھی۔ کشت و خون ہوا تھا۔ شاید یہ ناحق کوش اس طرف نظر نہیں رکھتے کہ اورنگ زیب کا بیٹا سلطان اکبر جب ایران کو بھاگا تھا تو اپنی دو بیگموں کو جسونت سنگھ کی (راسی)، بیوہ رانی کی پناہ میں چھوڑ گیا تھا۔[۵۲] خدا کی دین کہ دونوں کے ہاں اولاد نرینہ پیدا ہوئی۔ رانی کچھ زمانہ تک ان نومولود فرزندوں کو اورنگ زیب کے پاس بھیجنے میں تامل بلکہ حیلے حوالے کرتی رہی۔ اس کو بھروسا تھا کہ

---

[۵۱] منوچی، حصہ پنجم، صفحہ ۲۲۔ [۵۲] راجستھان، صفحات ۴۵۱ و ۱۰۰۰۔
شاہزادہ اکبر راجپوت خاتون کے بطن سے تھا۔ صفحہ ۱۷۹۔

اکبر ہندوستان کو واپس آئے گا۔ تاج و تخت سنبھالے گا تو مجھے اور میری جماعت کو اس حسنِ خدمت اور بچوں کی پرورش و محبت کا شایانِ شان صلہ دے گا۔ مگر مشیت الٰہی کا قلم اس کے خلاف چل چکا تھا جب یہ امید پوری ہوتی نظر نہ آئی تورانی نے دونوں بچوں کو بادشاہ کے حضور میں بھیج دیا۔ یہ بڑا تماشا تھا کہ جب یہ خورد سال بچے اپنے سال خوردہ (بوڑھے) دادا کے پاس پہنچے ہیں۔ تو سوائے ایک راجپوتی زبان کے کسی اور زبان کا ایک حرف بھی نہ جانتے تھے نہ سمجھ سکتے تھے۔ اور وہ زبان بقول منوچی درباری زبانوں سے بالکل مختلف ہے۔ اورنگ زیب نے ان کے لئے نوکر چاکر رکھے۔ اتالیق و استاد مقرر کیے۔ بڑی محبت و شفقت سے ان کی تعلیم و تربیت کرائی گئی[۵۲]

راجپوتانہ کی یہ جواں بخت جواں سال خوش نصیب شاہزادیاں ہر قسم کے زیورِ حسن و جمال سے آراستہ، شائستگی و تربیت سے پیراستہ ہوتی تھیں۔ فارسی تاریخوں کو تو اس بارہ میں خاموش پاتا ہوں۔ البتہ سوا سو برس ہوئے کرنل ٹاڈ نے انکی دلربائی و دلداری، ایثار و وفا شعاری کی یہ سند پیش کی تھی۔

راجپوت عورتیں نکوکار، محبت کرنے والی، وفا کیش، گھر بار کے معاملات

---

۵۲ اسٹوریا ڈو موگر، دوسرا حصہ، صفحات ۳۰۶، ۳۰۸ STORIA DO MAGOR

میں سرگرم حصہ لینے والی اپنے شوہروں کے ساتھ لڑائی کے خطرات میں نیز شکار میں شرکت کرنے والی بزدل کو نفرت و حقارت سے دیکھنے والی، اور امور عامہ اور خانہ داری میں بے مثل اثر و رسوخ رکھنے والی لکھی جاتی ہیں"۔ ان کے لئے ہر قسم کی عیش و عشرت اور تفریح و خوشدلی کا سامان ان کے ذوق کے مناسب مہیا و فراہم رہتا تھا۔

اور جیسا کہ کرنیل صاحب ناقل ہیں "کوئی راجپوت اپنی بی بی کا نام نہیں لیتا ہے"۔ کیا یہ انتہائے احتیاط و احترام و اہتمام پردہ داری نہیں ہے؟

اس پردہ بزم مجاز کو اولٹ دینے والے طبقہ کی کیفیت اب کیا ہے؟ اسکو ہماری زبان کے ایک ممتاز جادو نگار انشا پرداز کے قلم سے پوچھیے۔ جس نے ایک نجی تحریر میں کسی دوست کو بتایا تھا۔

"پھر ایک بات اور ہے جو صرف کان میں کہنے اور بتانے کی تھی۔ مگر مجبوراً کہنا پڑتی ہے۔ کہ جس کو بنارس میں ہر "برہمن بچہ" "لچھمن و رام نظر آیا تھا" یہاں قدم قدم پر "سیتا و رادھا" کا سامنا ہے اور اس

---

۵۲ صفحہ ۳۸ تاریخ راجستھان۔ از کرنیل ٹاڈ، مرتبہ ولیم کروک، جلد اول آکسفورڈ، سنہ ۱۹۲۰ء۔ ۵۳ صفحہ ۳۴۳ نوٹ۔ تاریخ ٹاڈ انگریزی، جلد اول، مطبوعہ سنہ ۱۸۷۳ء۔

اہتمام کے ساتھ کہ بے پردگی دیوانہ طرحِ نقاب افگندنش۔ راجپوتوں کی لڑکیاں ہیں۔ بلند بالا صحیح و توانا، تیوریاں چڑھی ہوئی گردنیں تنی ہوئی، آنکھوں میں تیر، مانگوں میں عبیر، ابروؤں میں خنجر، بالوں میں عنبر، ہاتھوں میں مہندی، ماتھے پر بندی۔ اب آپ سے کیا کہوں کیا چیز ہیں۔ قامتِ رعنا کی وہ ادا کہ لچک دار نیزہ بھی شرما جائے کمر میں وہ لوچ کہ بید کو بھی عار آئے۔"[56]

مرحوم آغا شاعر قزلباش دہلوی نے بھی کچھ ایسے ہی جذبات ایک قصیدہ میں ظاہر کئے ہیں، جو بظاہر لعبتانِ فرنگ اور آتشیں پیکرانِ شوخ و شنگ کی شان میں ہیں۔ مگر حسبِ حال اور حسبِ موقع سمجھ کر چند شعر نقل کرتا ہوں۔ آپ ان کو نا طور رنگان راجپوتانہ کے متعلق شوخات تصور فرمائیں۔

وہ حسینوں کے پرے آئینہ برق جمال — گون پہنے ہوئے ہر سمت بتانِ دلبر
وہ ستم گار تبسم وہ جفاگر چتون — بجلیاں اس سے گریں اُس سے رواں ہوں خنجر
فتنہ پرداز نگاہیں کہ جگر میں ٹھہریں — اتنی بیتاب ادائیں کہ ادائیں ششدر
ایک سے ایک زیادہ تماشا نے کے تئے — ہر طرف خوبی استاد ازل کے مظہر[59]

[56] مکتوبات نیاز، صفحہ ۱۴۴۔ [57] محبوبہ۔ معشوقہ۔ [58] تحفہ۔ ہدیہ۔
[59] صفحہ ۱۱۲، دربار اعظم۔

صفحہ ۵۔ دوسرا مقالہ مُغُل

راجپوت پر پچھلا مقالہ بے ارادہ اتنا طویل ہوگیا کہ "مغل" کے زیر عنوان زیادہ لکھنا طولِ اَمل نہیں، تو طولِ عمل ضرور سمجھتا ہوں۔
چغتائی مغلوں کے لئے ایلیاس راس (ELLIAS ROSS) کی "وسط ایشیا کے مغلوں کی تاریخ" قابل مطالعہ ہے[۶۰]۔
"مغل" کا لفظ ہمارے زمانہ اور ہماری زبان میں میم پر پیش مگر غین پر زبر سے کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ لفظ ترکی ہے اور ترکی لغات میں "مُغُول" (بضمتین و واوِ معدولہ و سکونِ لام) تحریر ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ مغل ایک جانی بوجھی معروف قوم کا نام ہے۔ اور جیساکہ اکثر کلمات کی کیفیت ہے، "مغل" کے بھی متضاد یعنی اچھے بُرے دونوں طرح کے معنی ہیں۔ یعنی ایک۔ ترکوں کے فرقہ کا مرد اور سادہ دل۔ دوسرا شریر۔ جیساکہ بعض فرہنگوں میں مندرج ہے۔ حقیقت جو کچھ ہو صحیح یا غلط، یہاں مغل سے مراد ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے آخری خاندان سے ہے جو دہلی میں میرے محسن و مخدوم سر رچارڈ برن (SIR RICHARD BURN) کے حساب سے سنہ ۹۳۲ (۱۵۲۶ء)

---

[۶۰] تعارف، صفحہ ۲۸۔

سے ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷ء) تک ۳۳۲ برس کے قریب حکمراں رہا تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب چنگیز خاں اور امیر تیمور سے ملتا ہے۔ یہ لوگ نسلاً ترک تھے اور ترکوں کی ایک مخلوط شاخ سے یہ جماعت بڑھی چڑھی تھی۔ لیکن اُس مسعود و مبارک زمانہ میں باہر سے آنے والے حملہ آور عموماً مغل ہی ہوتے تھے اور سب کے سب مغل کہلاتے تھے۔ اس لئے بلا لحاظ اصل و نسل یہ بھی مغل کہلانے لگے۔ اپنے شہرت یافتہ اور فاتح اعظم مورث اور جدِّ امجد کے انتساب سے یہ خاندان تیموری بھی کہلاتا ہے۔ تیمور۔ ہندوستان میں بھی آیا تھا مگر ٹھہرا نہیں۔ نہ ملک داری کی۔ دہلی کا خاندانِ شاہی ظہیر الدین محمد بابر سے چلا۔ بابر تیمور کی چھٹی پشت میں تھا۔ بابر کا باپ عمر شیخ مرزا، اندجان (فرغانہ) اور ترکستان کا فرمانروا تھا۔ مادرِ بابر قتلغ نگار خانم، یونس خاں بادشاہ

---

[۶۱] ہندوستان کی سلطنت مغلیہ کے تاجدار چغتائی ترک تھے۔ یہ تو ڈیڑھ صدی پہلے کی بات ہے مگر آج سے پچاس برس پیشتر بھی یہی ترک ساری اسلامی دنیا پر چھائے ہوئے تھے۔ ایران کا خاندان قاچار بھی ترکی النسل تھا۔ مصر کا خاندان سابق خدیوی حال سلطانی اور ٹیونس کے "بے" یا "بک" کا گھرانا اور قبل از قبضۂ فرانس الجزائری امیر سبکے سب نسلاً ترک تھے۔ یورپ میں صرف ایک ہی قوم بلکہ فرقہ قوم تاریخی حیثیت سے ترکوں کے مماثل ہے اور وہ گروہ شمالی فرانس میں نارمنی لوگوں کا ہے۔ [۶۲] ٹاڈ صاحب کی تاریخ مرتبہ کروک، صفحہ ۳۵۱۔

مغولستان کی لڑکی تھی۔ بابر ہندوستان آیا۔ ابراہیم حسین لودی سے جنگ آزما ہوا۔ فتح پائی۔ منگولوں کی جرأت، جفاکشی اور ترکوں کی ہمت و مردانگی، دو قابل عزت چیزیں اور عطیئے تھے جو رحمت الٰہی نے اس کے حصّے میں ڈالے تھے۔ بابر کی رگوں میں ایشیا کی دو زبردست اور طاقتور قوموں کا خون دوڑ رہا تھا۔ یعنی ایک طرف چنگیز خاں عرف تموجن، منگولی کا۔ دوسری طرف تیمور، ترک کا۔ اس کو آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک جانب تاتاریوں کی بہادری اور جنگ جوئی اس کا مائیہ خمیر تھیں تو دوسری جانب آریائی تہذیب و شائستگی اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔

ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ ان مغل بادشاہوں نے مذہب اور اسلام کی خدمت کیا کی؟ اس کا جواب انہوں سے نہیں غیروں سے لیجیے۔ سر الفریڈ لائیل (SIR ALFRED LYALL) اپنی کتاب ایشیاٹک سٹڈیز "ASIATIC STUDIES" میں فرماتے ہیں "جو فاتحین اسلام شمالی ہند میں شاہی خاندانوں کے بانی ہوئے یا جنھوں نے دکن میں اسلامی سلطنتیں قائم کیں، اُن کو مذہب کی کچھ پروا نہ تھی۔ ان میں اکثر ایسے تھے جن کو تبلیغ مذہب کی مہلت ہی نہیں ملی۔ کیونکہ یا تو ملک کے فتح کرنے میں ان کا وقت صرف ہوا یا خانہ جنگیوں سے ان کو فرصت

نہ ہیں۔ یہ مسلمان فاتح اکثر وحشی مغل یا تاتاری ہوتے تھے۔ پیغمبر عرب صلعم کے دین پر خود اُن کو استحکام نہ تھا۔ اور وہ جوش اور ولولہ جو سام ابن نوح علیہ السّلام کی اولاد کا خاصہ ہے اور جس کا نمونہ عرب کے قدیم مسلم برادرانِ اسلام نے دکھایا تھا چھو بھی نہ گیا تھا۔ جو سلطنت انھوں نے قائم کی اُس کی حیثیت ہمیشہ جنگی رہی۔[۶۳]

مسلمان حملہ آور فتح مندوں کا دعوےٰ بھی سن لیجئے۔ سلطان محمود نے راجہ انند پال پسر جے پال کو جواب دیا تھا کہ در کیش[۶۴] مسلمانان چنان است کہ ہر قدر رواجِ شریعتِ غزا و کسرِ معابدِ کفار سعی نمایند یوم الجزا اجر بیشتر یابند و نیت ہمایوں آنست کہ رسم بُت پرستی از جمیع بلاد ہندوستان بالکلیہ زائل نمائیم۔[۶۵]

فاضل پروفیسر آرنلڈ (T. W. ARNOLD) نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ فاتحین اور سلاطین عموماً لڑائیوں میں ایسے مصروف رہے کہ اسلام کو ترقی دینے کی مہلت نہ ملی۔ لوگوں کو مسلمان کرنے کی جگہ اُن سے خراج وصول کرنے کا اُن کو زیادہ خیال رہا۔[۶۶]

در کفر ہم ثابت نہ، زنّار را رسوا مکن۔

---

[۶۳] مطبوعہ لندن ۱۸۸۴ء صفحہ ۲۸۹۔ [۶۴] خوی، عادت، دین، مذہب۔ [۶۵] تاریخ فرشتہ جلد اول، صفحہ ۲۷۔ [۶۶] پریچنگ آف اسلام دعوت اسلام۔

مسٹر منوچی کئی سو برس پیشتر کا تجربہ بتاتے ہیں: "ناظرین کو معلوم ہوجانا چاہئے کہ اگرچہ یہ مغل لوگ مذہب اسلام کے پیرو ہیں، تاہم انکی عادات میں کئی ہندو رواجات بڑی مضبوطی سے جاگزیں ہوچکے ہیں۔ مثلاً جب وہ کوئی کام کرنا چاہیں یا کسی سفر پر جانا چاہیں تو کوئی نہ کوئی قربانی ضرور دیتے ہیں" [۶۷]

عظیم الشان انگریز مورخ گبن (EDWARD GIBBON) (از ۱۷۳۷ء تا ۱۷۹۴ء) نے مسلمانوں کے عروج و زوال یا دورِ حکومت کا خاکہ ان پانچ لفظوں میں کھینچا تھا۔ دہلی کے مغل بادشاہ بھی اسی اصل کی فرع ہیں، اس لئے یہ تعریف ان پر بھی حرف بہ حرف صادق آتی ہے۔ یعنی ۱۔ شجاعت ۲۔ عظمت ۳۔ نزاع ۴۔ ابتری ۵۔ تباہی۔ مردانگی و بہادری، شجاعت و عظمت کا دور دور۔ تو بابر سے لے کر اورنگزیب تک رہا۔ کم و بیش ۱۸۶ سال۔ اس کے بعد سو برس سلطنت کے بیمار پڑنے اور مرض الموت میں لگے۔ برادرانہ نزاعات، معرکے، نادر شاہ اور درانیوں کے حملے اس "ابتری" کی تعبیریں ہیں۔ "تباہی" و تباہ حالی کا زمانہ بھی خاصا طویل تھا جب کہ نام کا مغل شاہنشاہ محض برطانوی دوست وسطوت کے زیر فرمان ایک وظیفہ خوار و ذلہ ربا انسان رہ گیا تھا اور

---

[۶۷] جلد سوم، صفحہ ۱۴۸۔

بس۔ جس کا خاتمہ ۱۸۵۷ کے انقلاب سے ہوا۔ یہ زندگی کسی نوع کی سیاسی زندگی قرار نہیں پا سکتی۔ منشی محمد مرزا دہلوی کا یہ لکھنا کہ مغلوں اور تاتاریوں کا ماضی درخشاں و تاباں رہا ہے صرف پہلے دَور کی نسبت صحیح مانا جا سکتا ہے۔ آکسفورڈ کا نامور مورخ رابرٹس P.E.ROBERTS اپنی تاریخ ہند برطانوی (صفحہ ۱۲) میں رقم طراز ہے کہ جہانگیر کی تخت نشینی سے لے کر تقریباً سو برس تک مسلسل سلطنت مغلیہ پر لائق اور طاقتور فرمانروا حکمرانی کرتے رہے۔

"مرزا کے متعلق ڈی لیبٹ صاحب کے حاشیہ نویس لکھتے ہیں کہ یہ امیرزادہ کا اختصار ہے۔ ابتداءً یہ بادشاہوں اور شاہزادوں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ بابر نے ترک کر کے "بادشاہ" کا لقب اختیار کیا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی برابر چلا آیا۔ بعض صورتوں میں سلاطین اور شاہی اولاد و اخفاد کے ناموں سے پہلے اکثر میں ناموں کے بعد لگا دیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ ستر ھویں صدی میں زیادہ ممتاز امیروں اور امیرزادوں کے لئے استعمال ہونے لگا۔ مسٹر بیل (ڈکشنری صفحہ ۱۷۷) ڈی لیبٹ کے ہمنوا ہیں۔

مسٹر ونسنٹ اسمتھ، سر ولیم کی کتاب میں یہ نوٹ اضافہ کرتے

حاشیہ: صفحہ ۱۴۹۔ بحوالہ جورنل ایشیاٹیک سوسائٹی بنگال ۱۹۱۳ صفحات الغایتہ ۱۲۔

ہیں کہ صحیح طور پر تو یہ مغل کا لفظ ترک نسل کے مسلمانوں ہی پر صادق آتا ہے۔ ایسے لوگ عام طور پر اپنے نام کے ساتھ بیگ اور اکثر نام سے پہلے فارسی کا خطاب مرزا لگا دیتے ہیں۔[۲۹]

"بیگ" باتفاق جملہ اہل لغت قدیم و جدید ترکی لفظ ہے اور امیر یا بڑے آدمی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ "بیک اور بگ" اسی کا مخفف اور ترکوں کا معزز لقب ہے۔

میرزا اسداللہ خاں غالب پنج آہنگ میں لکھتے ہیں کہ امیر تیمور صاحب قران کے نام کے ساتھ صرف "امیر" کا لفظ ہوتا تھا، جو امیرالمومنین کا مخفف ہے۔ یہ ہی عنوان خلافت کا طغرا اور فرمان شرافت کا تمغا تھا۔ اس کے بعد اس کے فرزندان کا مگار "مرزا" کہلانے لگے۔ اسکو "امیرزا" کا مخفف سمجھ لیجئے۔ اس خاندان میں سب سے پہلے جس نے شاہی کا خطاب پایا، ظہیرالدین محمد بابر بادشاہ تھا۔[۳۰]

صفحہ ۵ نوٹ ۳۔ ملا نورالدین عبدالرحمٰن بن احمد جامی ہروی

بڑے بلند پایہ ادیب و شاعر، صوفی و عارف اور بہت سی

---

[۳۰] صفحہ ۹۸۔ سنہ صفحات ۳۴۰ و ۳۴۱۔

(تقریباً چوالیس) کتابوں اور مثنویوں کے مصنف ہیں۔ سلطان
ابوسعید مرزا اور اس کا فرزند و جانشین سلطان حسین مرزا، جامی
کے بڑے معتقد اور ادب کرنے والے، منزلت شناس تھے۔ اُن کا
وزیر میر علی شیر نوائی (فنائی تخلص) ان کا مرید و شاگرد تھا۔ شعبان
۸۱۷ھ (نومبر ۱۴۱۴ء) میں قریۂ جام (ملک خراسان) میں ولادت
ہوئی۔ محرم ۸۹۸ھ (نومبر ۱۴۹۲ء) میں وفات پائی۔ بعض سال
وفات ۸۹۷ھ لکھتے ہیں۔ ہرات دفن۔ سلطان بایزید خاں نے
بھی ان کو بلایا تھا۔ ہدایائے گراں بہا بھیجے۔ مگر آپ نے عذر کر دیا۔[۵۹]

اکبر کا درباری شاعر قاسم طوسی ارسلان تخلص، اپنی غزل کا
مطلع لکھتا ہے:-

ساقی ز عکس مے شدہ روشن ضمیر ما
جامے بدہ کہ عارفِ جامست پیر ما

"عارفِ جام" سے مراد یہی مولانا جامی ہیں۔

شمس العلما آزاد دہلوی راوی ہیں کہ مرزا محمد علی ماہر تخلص (صاحبِ
"گلِ اورنگ" مدحیہ اورنگ زیب عالمگیر) نے ایک "مثنوی بہاریہ"

---

۵۹ صفحہ ۶۰، مشاہیر اسلام، دہلی، ۱۳۲۳ھ۔ ۶۰ صفحہ ۸۴، ہفت آسمان۔

حیاتِ جلیل، حصہ اول، صفحہ ۲۷۳، نوٹ ۶۵

لکھی تھی۔ جو خاقانی کی " تحفۃ العراقین " کے طرز پر تھی۔ اس کا
مطلع اُن کے خوشگو شاگرد مرزا سرخوش نے کہا تھا۔

اے بر سرِ نامہ گل ز نامت
بارانِ بہارِ شیخ جامت

اہل نظر بتاتے ہیں کہ اس اُستاد تہا نہ صدا میں شیخ جام سے مقصود
شیخ جامی کی ذات گرامی ہے۔ (آبحیات، صفحہ ۱۴۱۔ بلبل صفحات
۱۶۲ و ۱۴۶)۔

صفحہ ۷۔ نوٹ ۴۔ توران

ایشیا کا مشہور ملک، جو تور پسر فریدوں کے ساتھ منسوب ہے۔
کسی وقت یہاں کے باشندوں نے دنیا میں بڑے بڑے کام کئے
تھے۔ حکمرانی کی تھی۔ یہاں کے اُمرا ہندوستان پر بھی مسلط رہے تھے
ڈاکٹر ہوئی (HOEY) کے ترجمۂ تاریخ فرح بخش سے پایا جاتا ہے کہ
عالمگیر کے زمانہ میں ان کی بڑی قدر تھی۔ انھیں چند تورانی عمائد کو
چھوڑ کر اس کے تمام درباری اور امرا شیعہ تھے۔ وہ ان کو ایرانی
غول بیابانی " کہا کرتا تھا "

ؔ صفحہ ۱۴۶۔

محمد شاہ کے عہد میں تورانیوں کی قدر بہت بڑھ گئی تھی۔ رسوخ زیادہ ہو گیا تھا۔ اِن کے گروہ نے ہندوستانی اور ایرانی مقربین دربار اور امراسے ذی اختیار کو نظروں سے گرادیا تھا۔

عربی داں ایرانی ملک توران کو ماورار النہر کہتے ہیں یعنی دریا کے اس پار۔ توران ایران سے جیحون پار ہے۔ اسی ملک توران میں عجم کا مشہور پرانا شہر سمرقند واقع ہے جو بادشاہان مغول کا صدیوں تک دار الحکومت رہا ہے۔

توران کی اسلامی آبادی اور ایک مدت دراز تک مسلمانوں کا محکوم رہنے والا یہ قطعۂ زمین اب غربی ترکستان میں داخل و شامل ہے۔ اور جمہوریت روسیہ کا جھنڈا اس پر لہراتا ہے۔

تورانی زبان چینی زبان کی قبیل سے ہے۔ اور اس (تورانی) زبان کی بہت سی شاخیں ہیں یعنی ازبکی۔ چغتائی، اوربن برگی (روس) داغستانی۔ آذربائیجانی، نوجائی۔ قرمی۔ تاتاری۔ ساپری باشغگر کارتشی۔ دیاندی وغیرہ۔ انگریز محققین لکھتے ہیں کہ "تورانی زبان" کا

---

۴۳ سمرقند آسیا وسطی میں مشہور شہر ہے۔ اس کا قدیم نام مرقند (MARAC – ANDA) تھا۔ عربوں کی تحریرات اور کتابوں میں سمران کے نام سے اس کا تذکرہ ہے۔ صفحہ ۹۴، قاموس الجغرافیۃ القدیمہ از احمد زکی بک۔

لفظ، زبانوں کے اَلطائیک (ALTAIC) خاندان کے لئے مستعمل ہے۔ اس میں اوگرین (UGRIAN) یا فینش (FINNISH) (فن لینڈ) کی ترکی، منگولین وغیرہ داخل ہیں۔

صفحہ ۷ نوٹ ۵۔ زبانیں

کسی ماہر لسانیات کا یہ مشہور قول ہے کہ ہر بارہ میل پر زبان تبدیل ہو جاتی ہے۔ عموماً اس سے مراد روزمرہ ہی کی بولی ہوتی ہے۔ زبان تو دور دور تک ایک ہی ملتی ہے مگر ایک ہی زبان کو لہجوں اور طرز ادا کے مختلف طریقوں سے مختلف پیرایوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اسلئے یہ دونوں شکلیں اپنی اپنی جگہ رہتی ہیں۔ ایک تحریر و تقریر کی۔ دوسری روزمرہ کی بول چال کی۔ اس پر ایک ذہین ناقد نے حاشیہ آرائی کی کہ نہیں۔ زبان میں اختلاف اور فرق تو ہر دس میل کے فاصلہ پر ہو جاتا ہے۔ تیسرا باکمال جو زیادہ وسیع النظر ہے اس سے بھی تجاوز کر جاتا اور دعوے کرتا ہے کہ ایک ہی شہر کے محلوں، کوچوں اور مختلف طبقوں و جماعتوں کی بول چال میں ممتاز فرق دیکھا جاتا ہے۔ اپنے ہندوستان کے متعلق بھی ہم کو ماننا پڑے گا کہ ہر قطعۂ ملک میں باوجود ایک زبان

۸۲ مولانا مناظر احسن، ہماری زبان یکم ستمبر ۱۹۴۱ء

ہونے کے شہروں اور علاقوں میں مختلف بولیاں بولی جاتی پائی جاتی ہیں۔ مثلوں اور کہاوتوں اور محاوروں کا فرق وا متیاز تو کہیں اہم اور نمایاں ہے۔ مہا مہو اپادھیائے گوری شنکر ہیرا چند اوجھا نے "قرونِ وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب" میں لکھا ہے کہ "ہندوستان کا ہر صوبہ ایک نئی راج دھانی، ایک نئی زبان، ایک الگ تمدن یعنی ہر ایک ایک نیا ملک تھا۔

نصف صدی کے قریب ہوا۔ سر جارج گریرسن (SIR GEORGE ABRAHAM GRIERSON) نے ہندوستانی زبانوں کا استقصا[۸۳] کیا تھا۔ اس کے مطابق مستقل زبانیں ۱۷۹ ہیں۔ ان کی شاخیں یا بولیاں ۵۴۴ مستعمل ہیں۔ برہما اور دکن کی زبانیں اس کے علاوہ۔ ان کو اس شمار سے باہر سمجھنا چاہیے[۸۴]

سچ تو یہ ہے کہ " ہندوستان آج بھی اقوام کا عجائب خانہ ہے جیسا کہ مسٹر یم راگوزن تحریر کرتی ہیں۔ مسٹر ہنٹر نے ہندوستان کی ۱۳۹ غیر آریائی زبانوں کا ایک لغت شائع کیا ہے[۸۵]

---

[۸۳] کسی چیز کی انتہا کو پہنچ جانا۔ حد سے زیادہ سعی، بڑی کوشش۔ [۸۴] رسالہ معارف، جلد ششم، نمبر ۳، بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۲۰ء صفحہ ۲۲۲۔ [۸۵] ویدک ہند، ترجمہ حمید انصاری، صفحہ ۲۲۱۔

[میں کہتا ہوں کہ ہندوستان میں ہندی تو پہلے ہی سے مختلف صورتوں میں موجود اور رائج تھی۔ کہیں برج بھاشا کے روپ میں کہیں اودھی کی شکل میں، کہیں کھڑی بولی کی صورت میں۔ اسی کھڑی بولی پر اردو زبان یا ہندوستانی کی بنیاد پڑی۔ یہی دہلی اور اس کے مضافات کی بولی تھی۔ اسی کی طرف انگریز دربار اور عمائد شہر دہلی کی تمام تر توجہ تھی۔ سنسکرت اور ہندوستان کی دراوڑی زبانوں کے خلط سے ہندی زبان بنی تھی۔]

ہندوستان کی زبانوں کی کثرت اور ان کے اختلافات کے بارہ میں زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ملک ہمیشہ سے ایک بڑا ملک (پورے اقلیم کے برابر) اور زمین کا نہایت وسیع و آباد قطعہ رہا ہے۔ آج کل کے سوئٹزرلینڈ کو دیکھ لیجئے۔ اس چھوٹے سے پہاڑی ٹکڑے کے اندر زبانوں کا کتنا اختلاف ہے![۸۶]

صفحہ ۹ - نوٹ ۶۔ ابوریحان

ابوریحان بیرونی، جغرافیہ، فلسفہ و حکمت اور ریاضیات عالیہ کا بڑا عالم تھا۔ علوم اقلیدس، ہیئت، حساب، ہندسہ، معقول اور

---

۸۶ تاریخ پنجاب از بھائی پرمانند، صفحہ ۲۳۔

طلسمات کا ماہر کامل تھا۔ اس کا لقب "ارسطوئے اسلام" بالکل صحیح اور اسکی جامعیت کمالات کے لحاظ سے نہایت مناسب و زیبا تھا۔ ولادت ۳ ذی الحجہ ۳۶۲ھ (۹۷۲ء) کو بیرون (خوارزم) میں ہوئی۔ غزنی میں بہ عمر ۷۷ سال ۲ رجب ۴۴۰ھ (۱۰۴۸ء) کو رہگرائے عالم بقا ہوا۔ "عجائب الہند" کا موضوع تحریر نام سے ظاہر ہے۔ یہ ہند قدیم (پراچین بھارت) کی تہذیب و تاریخ پر بہترین اور مستند کتاب ہے۔ آثار الباقیہ عن القرون الماضیہ میں پرانے مصر، خالدیہ، آسور، ایران، مقدونیہ اور روم کی بادشاہیوں کا ذکر ہے۔ کتاب الارشاد، تاریخ الامم المشرقیہ، قانون المسعودی، کتاب الصید لہ وغیرہ بھی یادگار چھوڑی تھیں۔ سولہ برس تک ہندوستان میں رہا۔ اور اسی مدت میں اس نے سب کچھ کیا اور زبانوں اور علموں کی بڑی بڑی خدمتیں انجام دیں۔ وہ علمی مذاق میں رچا ہوا تھا[۸۳]۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ شیخ بو علی سینا کا معاصر بلکہ بہت سے علوم میں اُس کا حریف مقابل تھا۔ اس نے ہندوؤں کے علوم اور سنسکرت کے حاصل کرنے کے لئے جو محنتیں کیں

---

[۸۳] مشاہیر اسلام صفحات ۳۳ و ۵۷۔ اور نیل بیاگرفی کل ڈکشنری صفحات ۱۹ و ۳۵۔ ہندوستان کی تاریخ از ڈوسن المیٹ جلد دوم صفحہ ۱۔ اسلامی ہند از نیاز فتحپوری صفحات ۱۸ تا ۲۱۔

اور زحمتیں اُٹھائیں وہ حقیقت میں تعجب انگیز ہیں۔ خود اُس کا بیان ہے "اس زبان کے سیکھنے میں مجھکو نہایت مصیبتیں پیش آئیں۔ ہندوؤں کا تعصب اس قدر بڑھا ہوا ہے جس کی کچھ انتہا نہیں۔ وہ ہم مسلمانوں کو ملیچھ کہتے ہیں۔ ہم سے جو چیز چھو جائے اُن کے نزدیک ناپاک ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے بچوں کو ہمارے نام سے ڈراتے ہیں اور ہم کو شیطان کہتے ہیں۔ ان سب باتوں کے ساتھ وہ تمام دنیا کو جاہل اور وحشی سمجھتے ہیں۔ ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ ہندو اس کو کتابوں کے دینے میں نہایت بخل کرتے تھے، حالانکہ وہ تمام کتابوں کے خریدنے میں بے دریغ روپیہ خرچ کرتا تھا۔ ان تمام مشکلات کے ساتھ جس طرح ہو سکا اس نے سنسکرت زبان حاصل کی اور نہایت کمال درجہ پر حاصل کی۔

اس نے بہت سی کتابیں زبانی پڑھیں اور یاد کر لی تھیں۔[۸۸]

اس کی ایک دوسری کتاب "قانون مسعودی" ہماری تعریف سے بے نیاز ہے۔ سلطان محمود کے جانشین شہاب الدین مسعود نے اس کا کیا انعام دیا تھا، ہاتھی بھر چاندی۔ فرشتہ لکھتا ہے "استاد ابوریحان خوارزمی منجم کہ علامۂ وقت بود و در ریاضیات نظیرے نہ داشت 'قانون مسعودی' در علم ریاضی بنام نامی او نوشت و فیلے از نقرہ صلہ یافت۔"[۸۹]

---

[۸۸] مقالاتِ شبلی۔ تراجم۔ صفحات ۱۳۹ و ۱۴۲۔ [۸۹] تاریخ فرشتہ، مقالۂ اول صفحہ ۴۴، نول کشوری۔

ابو ریحان کی سنسکرت دانی اس مرتبہ کی تھی کہ اس نے اہل ہند کے فائدہ پہنچانے کے لیے بعض عربی کتابوں کا سنسکرت میں ترجمہ کیا تھا۔

پروفیسر زخاؤ (SACHAU) جرمن کے مشہور عالم نے بیرونی کی کتاب الہند کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ سکندر کے ساتھ جو یونانی مصنف موجود تھے، انھوں نے ہندوستان کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ چینی مسافروں نے بھی اپنی ذاتی واقفیت و تحقیقات سے اس ملک کے حالات قلمبند کئے ہیں، لیکن ابوریحان بیرونی نے جب ہندوستان کا سفر کرکے وہاں کے علوم و فنون اور رسم و عادات پر کتاب لکھی تو تمام پچھلی تصنیفیں بازیچۂ اطفال بن گئیں۔[۹۰]

آثار الباقیہ اور کتاب الہند اپنی علمی حیثیت سے جس قدر و منزلت کی مستحق تھیں ویسے ہی اہتمام و تکلف سے یورپ میں چھاپی گئیں۔ ترجمے ہوے ہیں۔ ہماری اردو زبان بھی اس فیضان علمی سے محروم نہیں رہی۔

اس سلسلہ میں ایک قابل عزت نام اور یاد آتا ہے۔ "ابومعشر فلکی" جو ہندوستان میں دس سال رہا تھا اور سنسکرت زبان اور ہندوستانی علوم کو بحدِ کمال تحصیل کیا تھا۔ قصۃ السجودی والفران" میں

---

[۹۰] صفحہ ۳۹، ایضاً۔

میں (مقبول) نے ابومعشر کے حالات اور اس کے امامِ فن ہونے اور احکامِ نجوم اور تعدیلِ کواکب کے جاننے کے بارہ میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ اس کی تصنیفات اور کتاب الملاحم کا بھی ذکر کیا ہے[91]

صفحہ ۱۰ - نوٹ ۷ - ابو اسحٰق فارسی اِصطخری بغدادی

ایک بڑا سیّاح تھا۔ اسکی سیر و سفر کی وسعت اُقیانوس (افریقہ) تک نظر آتی ہے۔ ۳۲۹ھ (۹۴۰ء) میں سیاحت شروع کی۔ ۳۴۰ھ (۹۵۱ء) میں ہندوستان کی خاک نے اس کے قدم چومے۔ وہ ملکوں کی تاریخوں کو اُن کی جغرافیائی ہیئت و حالت کے ساتھ ساتھ دکھاتا جاتا ہے۔ اکثر علما تسلیم کرتے ہیں کہ علمِ جغرافیہ "تاریخی" کا منشی و بانی یہی ہے۔ "صُوَرُ الاقالیم" اور "المسالک والممالک" اس کی تصانیف میں امتیازِ خاص رکھتی ہیں۔ لائیڈن (ہولانڈ) میں چھپی ہیں۔[92]

صفحہ ۱۰ - نوٹ ۸ - ابن حوقل موصلی بغدادی

کتاب "الممالک والمسالک والمفاوز والمہالک" کا

---

[91] بحوالہ طبقات الامم، قاضی صاعد اندلسی، صفحہ ۹۸۔ [92] صفحہ ۷۷۔

مصنف ہی جو لائیڈن میں چھپی ہے۔[۹۳] اس کا زمانہ سفر ۳۲۰ھ (۹۳۲ء) سے لے کر ۳۳۸ھ (۹۴۹ء) تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ بڑے بڑے اور مشہور شہروں کے حالات لکھنے کی پروا نہیں کرتا۔ نظر انداز کر جاتا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر اصطخری سے کہیں زیادہ معلومات فراہم کر دیتا ہے ۳۶۷ھ (۹۷۷ء) کے بعد انتقال کیا۔ مورخین سال وفات کی تعیین نہیں کرتے۔ جس شخص نے اٹھارہ سال بحر و بر کے سفر میں گزارے ہوں اس کا تعاقب کون کر سکتا تھا۔ یہ بھی تاریخی جغرافیہ کے فن کا استاد تھا۔ تاجر تھا۔ بربر، اندلس اور ایران وغیرہ کی سیاحت کی تھی۔

حکیم سید شمس اللہ قادری فرماتے ہیں کہ اس نے ۳۳۱ھ - ۹۴۳ء سے ۳۵۹ھ - ۹۶۸ء تک بلاد اسلامیہ میں سفر کیا تھا۔ سفر نامہ ۳۶۷ھ (۹۷۷ء) میں مدون ہوا۔ اور ۱۸۷۳ء میں دیخویہ میں چھاپ کر شائع کیا گیا۔[۹۴]

صفحہ ۱۱ - نوٹ ۹- کرنیل ٹاڈ

جیمس ٹاڈ کے باپ جیمس ٹاڈ اول مع اپنے بھائی جان ٹاڈ کے

---

[۹۳] صفحات ۲۳۲ و ۲۷۹ - امرائے ہنود، صفحہ ۳۴ - [۹۴] اردوئے قدیم یعنی تاریخ زبان اردو، تاج پریس، صفحہ ۱۲-

اکتوبر ۱۷۴۵ء میں امریکہ سے ہندوستان چلے آئے تھے اور مرزاپور میں نیل کا کاروبار کرتے تھے۔ جیمس ٹاڈ (JAMES TOD) لفٹننٹ کرنیل کی ولادت ۲۰ مارچ ۱۷۸۲ء کو ہوئی۔ وہ ۱۷۹۹ء میں ہندوستان آ گئے تھے۔ سترہ سال کی عمر تھی۔ ۱۸۰۵ء سے ۱۸۲۳ء تک مختلف عہدوں پر راجپوتانہ میں متعین رہے۔ آخر میں گورنر جنرل کے ایجنٹ ہو گئے تھے۔ رئیسانِ راجپوتانہ سے ان کے تعلقات ایسے بڑھ گئے تھے، ایسے گہرے ہو گئے تھے کہ اس وقت کی انگریزی حکومت ان کو بدگمانی کی نظروں سے دیکھنے لگی۔ ۱۸۲۳ء میں وہ انگلستان واپس گئے۔ اور ۱۸۲۵ء میں اُن کو استعفا داخل کرنا پڑا۔ ۱۸۳۵ء میں وفات پائی۔ ملازمت سے کنارہ کشی کے بعد ان کی زندگی تمام تر علمی و تاریخی کاموں کے لئے وقف رہی۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کو ان کی خدمات و مساعی کا ممنون احسان رہنا چاہیئے۔ اپنا بیش قیمت عظیم الشان کتب خانہ بھی انجمن مذکور کی نذر کر گئے تھے۔ [95]

ANUALSAND ANTIQUITIES ان کی تاریخ راجستھان

---

[95] صفحہ تعارف، تاریخ راجستھان، مدونہ ولیم کروک، جلد اول، مطبوعہ آکسفورڈ، ۱۹۲۰ء۔

OF RAJASTHAN, OR THE CENTRAL AND WESTERN RAJPUT STATES OF INDIA.

نہایت ضخیم اور جامع کتاب ہے۔ کئی مرتبہ مختلف اہل فضل و کمال کی تہذیب و تحشیہ سے ہندوستان نیز انگلستان میں شائع ہو چکی ہے۔ تین جلدوں میں ہے۔ اور اپنی نوع کی پہلی چیز ہے۔ کرنیل صاحب کی دو تصنیفیں اور شہرت رکھتی ہیں۔ مگر میں ان سے اب تک مستفید نہیں ہو سکا۔ موصوف کی تاریخ کے حاشیہ نویس ان کا ذکر کرتے ہیں (۱) مغربی ہندوستان میں سیاحت[۹۷] (۲) TRAVELS IN WESTERN INDIA مشاہیر ہند

MEN WHOM INDIA HAS KNOWN

کرنیل ٹاڈ اور اُن کی تحقیقات کے بعض نتائج اور تحریرات کے ماحصل پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ چنانچہ بھائی پرمانند لکھتے ہیں "سب سے پہلے راجپوتوں کے مشہور مورخ کرنیل ٹاڈ صاحب تھے اُس زمانہ میں علم تاریخ میں اور علم تاریخ کی تحقیقات میں مدد دینے والے دوسرے علوم میں، بہت ترقی نہ ہوئی تھی۔ ٹاڈ صاحب نے تاتاریوں کی بہت سی رسوم کو راجپوتانہ کی رسوم سے مشابہ پایا اور وہ

---

۹۷ مطبوعہ ۱۸۲۳ء

جھٹ پٹ اس نتیجہ پر پہنچے کہ حقیقت میں یہ لوگ "تاتاری نسل کا ہی ایک حصہ ہیں"[97]۔ مسٹر ولیم کروک اسی کتاب کے محشی اور مدیر ٹاڈ صاحب کی بعض غلطیوں کو بہ تصریح لکھتے ہیں[98]۔ اور ارسکن صاحب کی تحریرات سے توثیق فرماتے ہیں[99]۔

صفحہ ۱۵ - نوٹ ۱۰- گروس اور بیمس

پرانے سویلین انگریزوں کو جس قدر التفات و شغف ہندی زبان اور ہندوستان کی اور بولیوں سے تھا، وہ آج سے ستر اسی برس پہلے کے اخبارات و رسائل کی ورق گردانی سے آشکار ہوتا ہے۔ پروفیسر گارسِن دی تاسی اپنے پندرھویں خطبے (۴ دسمبر ۱۸۶۵ء، صفحہ ۱۴۷، ترجمہ اردو) میں فرماتے ہیں "کلکتہ ایشیاٹک سوسائٹی کے رکن مسٹر ایف۔ ایس گروز (GROWSE) نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے درخواست کی تھی کہ ہندی کی جلیل القدر نظم پرتھوی راج راسو کو جو چند بردئے کی لکھی ہوئی ہے، سوسائٹی کی طرف سے شائع کرنے کا انتظام کیا جائے۔ اس شاعر کو راجپوتوں

---

[97] تاریخ راجستھان، صفحہ ۸۵۔ [98] صفحہ ۲۸۱ نوٹ ۴، جلد اول، مطبوعہ ۱۹۲۰ء۔ [99] جلد دوم، صفحہ ۱۴۔

کا ہومر (HOMER) تصور کرنا چاہیئے۔ اس تجویز کی پادری جیمس لانگ (JAMES LONG) نے تائید کی تھی۔ چنانچہ اس کا انتظام ہوا اور مسٹر بیمس (BEAMES) نے اپنے ذمّہ لیا۔"

(مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ۱۹۳۵ء)

اب ہندی کے اِن دونوں حامیوں یعنی گروس اور بیمس صاحبان کی کیفیت بھی سُن لیجئے۔

گروس صاحب بنگال سول سروس کے رکین رکن میرے والد بزرگوار کے ہم عصر حاکم اور میرے محسن تھے۔ ذاتی واقفیت اور علمی معاونت پانچ سال سے زیادہ کی ہے۔ اُن کا زمانۂ ملازمت بیشتر متھرا میں گزرا تھا۔ دنیاوی ترقیات وعروج کے زینے وہیں سے طے کیے تھے۔ وہاں کی علمی مجلسوں اور زباں داں باکمال پنڈتوں کی صحبتوں میں شریک ہونے اور اُن سے فائدہ اُٹھانے کا انکو پورا موقع ملا تھا جس نے ان پر بڑا اثر ڈالا تھا۔ اپنی منصبی خدمات اور ضلع کی سکلاٹری کے فرائض سے جب فرصت پاتے تو عمارات قدیمہ اور پُرانی یادگاروں پر توجہ فرماتے۔ ضلع کے گزیٹروں کو درست کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اُن کے تتمیمے بھی لکھتے رہتے۔ متھرا اور بلند شہر کے گزیٹیر نیچ پوہ کا تتمہ

اُن کی یادگار ہے۔ فرخ آباد کے گزیٹیر میں بھی بڑی کاوش و تحقیقات سے بہت کچھ اضافہ کیا تھا۔ اور قابل قدر حواشی لکھے تھے۔ علم رسم الارض علم آثار قدیمہ علم الاصنام اور علم اللاہوت میں کامل دلچسپی و تبحر رکھتے تھے۔ نامور ماہر تعلیم مسٹر گرفتھ (GRIFFITH) کا قول ہے کہ اس قطعۂ ملک (اضلاع مغربی و شمالی) میں تلسی داس[۱] کی راماین کو جو قبولیت عام اور عظمت حاصل ہے وہ بائبل (BIBLE) کو انگلستان میں نصیب نہیں[۲]۔ مسٹر گروس نے گوسائیں جی کی رامائن کا ترجمہ انگریزی میں کیا اور اُس کی اشاعت ۱۸۷۶ء میں شروع کی تھی۔ جس کے ۱۸۹۱ء تک پانچ ایڈیشن نکلے۔ موصوف کا عطیہ نسخہ میرے پاس محفوظ اور ذریعہ نازش و مباہات ہے۔ وہ صحیح اور سچے طور پر ہندی نواز اور اُس کے بہی خواہ تھے۔

مسٹر جے بمیس علوم صرف و نحو وغیرہ (PHILOLOGY) کے متبحر مشرقی زباں داں اور "انڈین فائیلالوجی" نام کی ایک کتاب کے مصنف

---

[۱] وفات تلسی داس سمبت ۱۶۸۰ مطابق ۱۶۲۴ء۔ بحوالۂ مقدمہ مسٹر گروس رامائن کے ترجمے پر۔ [۲] نیز ملاحظہ ہو پروفیسر ولسن کی تحریر[۱] تلسی داس پر ESSAY ON THE RELIGIOUS SECTS OF THE HINDUS[۲]۔ مسٹر بیاری لال شاکر کا مضمون تلسی داس پر مندرجہ رسالہ مخزن نمبر ۵، جلد ۱۵، ماہ اگست ۱۹۰۸ء

تھے۔ ہندی کے فضائل اور خوبیوں کی نسبت اُن کی کوئی تحریر اس وقت تک میری نظر سے نہیں گزری۔ البتہ اُردو کے حق میں وہ اِن لفظوں میں شہادت دیتے ہیں:۔

"میں اِس (اُردو) کو مختلف گروہوں کی بڑی اور وسیع زبان کی نہایت ہی ترقی یافتہ اور متمدن صورت خیال کرتا ہوں۔ صرف یہ ہی نہیں کہ یہ ایک فصیح، سلیس اور وسیع زبان ہی بلکہ اس میں وادیٔ گنگ کی بسنے والی قوموں کی زبان کی اصلی ترقی ظاہر ہو سکتی ہے۔" [۱۰۱]

صفحہ ۱۴ ۔ نوٹ ۱۱ ۔ محمود خلجی

اولوالعزم بادشاہ تھا جس کا ذکر اور جس کے قابل دید مناره کا حال تزک میں لکھا ہے۔ یہ عمارت سات منزل کی بنائی تھی۔ اسی لئے "ہفت منظر" نام رکھا تھا۔ ہر منزل یا طبقہ میں چار چار صفّے (یا ایوان) تھے۔ ہر طبقہ میں چار چار کھڑکیاں۔ سیڑھیاں ایک سو اکہتّر تھیں۔ بلندی ساڑھے چون ہاتھ تھی۔ دَور پچاس گز۔ جہانگیر نے یہاں آنے جانے وقت چودہ چودہ سو روپیہ نثار کیا تھا نکتہ رس

---

[۱۰۱] رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، جلد ۳۵، ۱۸۳۶ء۔ صفحہ ۱۰۔

ہیوریج صاحب (نوٹ نمبر ۲، صفحہ ۱۸۱، ترجمہ تزک میں) ارشاد فرماتے ہیں کہ حساب صاف ہے۔ دو دو سو روپیہ فی منزل دیا تعجب ہے کہ جورڈین صاحب (JOHN JOURDAN) اس کو چھ منزل کا لکھتے ہیں۔ سبز پتھر کی تعمیر ہے۔ بالکل سنگ مرمر معلوم ہوتا ہے۔ اس عمارت کے متعلق ولیم فنچ صاحب (WILLIAM FINCH) نے بھی لکھا ہے کہ یہ مینار "منارِ فتح" کے نام سے سلطان محمود اول نے ۱۴۴۳ء میں اس فتح کی یادگار میں تعمیر کیا تھا جو اس نے رانا سے چتور پر پائی تھی۔ (ملاحظہ ہو ضمیمہ حرف دال APPENDIX D)

جورڈین صاحب کا جورنل جس کی ہیک لوٹ سوسائٹی کی تحریک و فرمایش سے فاسٹر صاحب FOSTER نے تدوین کی تھی۔ تاریخ آئینہ تبدیل کھنڈ، از مولوی سید منظور احمد، قلمی، صفحہ ۱۶۵۔) یہ تمام تفصیل جو بظاہر غیر ضروری معلوم ہو گی۔ میں نے اس لئے لکھ دی ہے کہ پڑھنے والے ذی فہم حضرات یہ اندازہ کر سکیں کہ محمود نہ صرف قلم اور تلوار کا دھنی اور متعدد زبانوں کے ادب و نظم پر قادر تھا بلکہ فن تعمیر کا بھی بادشاہ تھا۔

محمود خلجی کے سوانح اور ذاتی وقائع (بعض) کا ذکر وقائع راجستھان میں[۱۰۴]

---

[۱۰۴] جلد اول، صفحہ ۱۰۵۔

اور "تاریخ راجستھان" میں بھائی پرمانند نے[104] نیز اس کھمبے کی تعمیر کا اور "شاہان مالوہ" میں منشی امیر احمد علوی نے کیا ہے[105]

حکومتِ مالوہ کا سلطان محمود خلجی بہترین فرمانروا اور مدبر ناظم مانا گیا ہے۔ وہ علم و ہنر کا قدر شناس، "تعلیم کو ترقی دینے والا" طلبا کا دستگیر و معاون، علما و فضلا کی عزت و احترام کرنے والا شخص تھا۔ "مآثر رحیمی" کا مولف لکھتا ہے کہ اس کی زرپاشی، کوشش اور ہمت افزائی سے علوم و فنون نے بڑی ترقی کی تھی اور ملکِ مالوہ یونانِ ثانی بن گیا تھا۔ (صفحہ ۱۲۵ جلد اول)

محمود شوال ۸۳۹ھ (مئی ۱۴۳۶ء) میں تخت نشین ہوا۔ ذیقعدہ ۸۷۳ھ (مئی ۱۴۶۹ء) میں وفات پائی۔[106]

حوالہ صفحہ ۱۹۰ - نوٹ ۱۲ - مالوہ

مالوہ یا مالوہ۔ اسی نام کے ایک قبیلہ سے منسوب ہے۔ مگر مالوہ دیس کا نام یعنی "مالو لوگوں کی سرزمین" سنسکرت کی کتابوں میں حضرت مسیح

---

۱۰۴ صفحہ ۹۹ - ۱۰۵ صفحات ۲۰۰ و ۱۴۰ - ۱۰۶ بیلی، صفحہ ۱۲۴ - و معارف نمبر ۵، جلد چہارم ۱۹۱۹ء، صفحات ۳۵۰ و ۳۵۱ - نیز ملاحظہ ہو پنڈت ایشوری پرشاد کی تاریخ عصر وسطیٰ صفحہ ۳۸۸، و صفحہ ۳۸۹ (فتح مینار)۔

سے دو صدیاں پہلے نہیں ملتا ہے۔ وہ خطہ جو اَب مالوہ کہ کے مشہور ہے دسویں صدی مسیحی بلکہ اس سے بھی بعد تک اس نام سے پکارا نہیں جاتا تھا۔ (امپیریل گزیٹیر آف انڈیا، جلد ۱۷، صفحہ ۱۰۰۔ بمبئی گزیٹیر حصہ اول، صفحہ ۲۸، حصہ دوم، صفحہ ۳۱۱۔)

سلطنت مالوہ کا پایۂ تخت مانڈو شادی آباد تھا جس کی تعمیر و آبادی سلطان ہوشنگ غوری کے ہاتھ سے ہوئی تھی شہ۱

صفحہ ۱۹ - نوٹ ۱۳ - راجہ نندا

راجہ نندا شعر ہندی بعبارتِ متین و استعارات رنگین کہ پسندیدۂ شعرایان خردگزیں بودہ باشد در مدح سلطان نوشتہ ارسال داشت زباندانِ ہند مضمون آں را بعرض رسانید سلطان مسرت اندوز گشتہ تحسین نمود و در جلدوے آں منشورِ حکومتِ پانزدہ قلعہ ضمیمۂ کالنجر نمودہ باتحف دیگر مرحمت فرمود۔ شہ۲

منشی گوکل پرشاد مترجم سیر المتاخرین، اپنی کتاب مرآۃ السلاطین

شہ۱ صفحہ ۴۴ اسلامی ہند، نیاز فتح پوری۔ تاریخ مالوہ۔ و تاریخ فرشتہ مقالہ سوم، صفحات ۲۵۱ و ۲۶۲ شہ۲ سیر المتاخرین، جلد اول، صفحہ ۱۰۱۔ ذکر محمود غزنوی۔

میں لکھتے ہیں۔

"راجہ نندا شعرگوئی میں نہایت ملکہ رکھتا تھا۔ آخر چند اشعار مدحِ سلطان میں تصنیف کرکے بھیجے۔ اس کا مضمون ہندی دانوں نے عرض کیا۔ بادشاہ بہت خوشنود ہوا[۱۰۹]۔ بہت تعریف کی اور اس کے صلہ میں بہت سے تحفے اور پندرہ قلعے کا نیز کے ساتھ اضافہ کر دئے"

صفحہ ۳۱ - نوٹ ۱۴ - ذُوالکِفل

قرآن پاک میں یہ نام نیک کردار نبیوں کے زمرہ میں آیا ہے۔ اور دو جگہ وارد ہوا ہے۔ مفسرین نے بھی اپنی کتابوں میں ان کے حالات پوری تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ تاہم بعض اس کو حضرتِ زکریاؑ کا دوسرا نام لکھتے ہیں، بعض حضرتِ الیاس کا اور بعض حضرت یوشع کا علیہم السلام۔ اس مختصر مگر عام رائے کے بتا دینے کے بعد قاریان کرام کی اطلاع کے لئے مجھے بعض اختلافات کا ظاہر کردینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک کہ کفل یا ذوالکفل کا لغوی معانی سے تعلق ہے، کفل نصیب کو کہتے ہیں۔ البتہ نصیب میں شئے زائد بھی شامل ہو جاتی ہے۔ مگر کفل میں نہیں۔ کفل مساوی کے مثل ہوتا ہے۔ اہل زبان نے اس

---

[۱۰۹] صفحہ ۱۴۳، جلد اول، نول کشوری۔

لفظاً کی جو تعبیرات کی ہیں اُن کے نقل کرنے کی نہ یہاں گنجایش ہے نہ حاجت۔

ہمارے ملک اور ہمارے زمانہ کی نئی پود کے ارباب علم کا ارشاد بھی سن لیجئے۔ ذوالکفل کے لفظاً معنی ہوتے ہیں "کپل والا" کپل ہندی لفظ ہے جس کا مُعَرّب "کفل" ہوتا ہے۔ مجوزین کی بنائے استدلال یہ ہے کہ بدھ مہاراج کپل وستو شہر میں پیدا ہوئے تھے جو ہمالیہ کے دامن میں واقع تھا۔ اور یہی شہر اُن کے باپ دادا کی راج دھانی تھا۔

اس آئینہ کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ بے شبہ ہندوستان اور ہندوؤں کے رشیوں اور مُنیوں میں "کپل جی" کا مرتبہ نہایت بلند ہے۔ ایک بڑی جماعت اُن کی بزرگی اور تقدس[۱] کی قائل اور اُن کے ارشادات و تلقنات[۲] پر عامل ہے۔ تاہم ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ان کے عقاید اور بانی ہوئی باتوں سے اختلاف رکھتا ہے۔ ان کو لوائے[۳] وحدانیت[۴] الٰہیہ کا حامل اور اقرار فردانیت و صمدانیت[۵] خداوندی پر قائل نہیں پاتا۔ مشہور سیاسی انقلاب پسند لالہ ہردیال نے "ہندوستان اور عقلیت

---

[۱] پاک ہونا۔ پاک کرنا۔ [۲] تلقین، سمجھانا اور تعلیم کرنا۔ [۳] لِوا۔ فوج کا جھنڈا۔ لشکر کا نشان۔ [۴] خدا کا ایک، اکیلا ہونا۔ [۵] تنہا ہونا۔ طاق ہونا۔ [۶] بزرگی۔ بے نیازی۔ حیوانی عادتوں سے پاک ہونا۔

کے عنوان سے ایک مضمون رسالہ پازیٹیوسٹ ریویو POSITIVIST REVIEW میں لکھا تھا۔ اس ہندو خدا شناس کا دعوےٰ یہ ہے کہ حکماے ہند سب کے سب بلا استثنا ملحد یا تقریباً ملحد ہوئے ہیں۔ وہ اس دعوے کے ثبوت میں "کپل" جی کا نام لیتے ہیں۔ اور اُن کے الحاد کی یہ مستحکم[116] دلیل اُن کے اس فقرہ میں پیش کرتے ہیں کہ "وجود باری ثابت نہیں ہو سکا ہے۔"[117]

وسیع النظر فاضل و محقق نے ایک موقع پہ فرمایا تھا کہ "کپل" کے مقلدین خدا اور دانش کو ایک مانتے ہیں۔ عالم اور نفس ناطقہ کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اور موت کو لازمۂ نیستی نہیں مانتے[118]

بعض انگریزی ناموں کا کپل ایک جزو اہم پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ سر روس کپل (SIR ROOS KEPPEL) جو حکومت برطانیہ کے بڑے ذمہ دار و منتظم عہدہ دار تھے اور پشتو کے مسلم الثبوت[119] زباندان اور مصنف گزرے ہیں۔ اسی طرح سنگاپور کی بندرگاہ کپل ہاربر (KEPPEL HARBOUR IN SINGAPUR) کو بھی یاران سر پل

---

[116] پیدا کرنے والا۔ آفرینندہ۔ [117] رسالۂ معارف، صفحہ ۲۸۸، جلد ہفتم، ۱۹۲۱ء۔ [118] معارف، صفحہ ۳۴۹، جلد چہارم، دسمبر ۱۹۱۹ء۔ [119] جو بدیہی طرح ثابت ہو۔ جو ثبوت کا محتاج نہ ہو۔

اسی مختلف فیہ مگر روایتاً بلند ہستی سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ اُن کی محض ذہانت اور طباعی ہے۔ ورنہ کسی کتاب یا تاریخ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔

صفحہ ۲۱ ۔ نوٹ ۱۵۔ جودی

جُودی[۱۲۰] ایک چھوٹے سے پہاڑ کا نام ہے جو موصل میں جزیرہ کے قریب واقع ہے۔ جزیرہ مابین دجلہ و فرات کے دیار بکر سے بغداد تک مسلسل پھیلا ہوا ہے۔ بقول زجّاج ولایت آمُل کے ایک کنارے ہے۔ قرآن پاک میں وارد ہوا ہے۔ وَاستَوَت عَلَی الجُودِیِّ[۱۲۱] یعنی طوفان کے بعد حضرت نوحؑ کی ناؤ اسی پہاڑ پر (جا کر) ٹھہر گئی۔ کم سے کم چار ہزار برس پرانی بات ہے۔[۱۲۲] مسلمان مفسر، تاریخ نگار، جغرافیہ نویس اور جہانگرد سیّاح بالاتفاق ایسا ہی لکھتے ہیں۔ زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ اس کشتی کے کچھ ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے اس مقام پر موجود تھے۔ بہت سے عقیدتمند باشندے ان چھپٹریوں کو تبرک کے طور پر لے جاتے اور گنڈے تعویذ

نمبر۱۲۰ مختصر کتاب البلدان، لابن الفقیہ مطبوعہ لائیڈن - اپریل ۱۳۰۲ھ، صفحہ ۲۲۔

۱۲۱ بارہواں پارہ، سورۂ ہود کی بینتالیسویں آیت۔ نمبر۱۲۲ ولایت حلب کا تر کی سالنامہ صفحہ ۷، مطبوعہ ۱۳۱۶ھ، ذکر وقائع مشہورہ۔

کا کام لیتے تھے۔ مادی شہادت کے طور پر باتبرکات قدیمہ کے سلسلہ میں حضرت نوحؑ کی ایک دیگچی بھی استانبول کے ذخیرہ عجائب و نوادر میں باقی اور محفوظ ہے۔ سلاطین عثمانی اس کی بڑی تعظیم و ادب کرتے تھے

دوسری طرف یہودیوں کا دعوے ہے کہ اس پہاڑ کا نام اراراط ہے جس پر سفینہ ٹھہرا تھا۔ اور یہی نام توریت میں دو جگہ آیا ہے۔ عہد نامہ قدیم سفر تکوین[۱۲۳] میں آیا ہے فقال اللہ لنوح۔۔۔۔۔۔ اصنع لنفسک فلکا من خشب جفر۔ اور آٹھویں اصحاح[۱۲۴] میں سے واستقر الفلک ۔۔۔۔۔۔ علی جبال اراراط۔ (ترجمہ:" اور خدا نے نوح سے کہا۔۔ ۔۔ تو گوپھر کی لکڑی کی ایک کشتی اپنے لئے تیار کر۔۔ ۔۔ اور کشتی ۔۔ ۔۔ ۔۔ اراراط کے پہاڑوں پر ٹک گئی۔")

تیسرا فریق ہمارے اہل وطن ہندوؤں کا ہے۔ ان کے اسلاف اور پرانے صحیفے ہندوستان تک طوفان کے پہنچنے کے قائل نہیں۔ تاہم بعض طباع دوست یہی کہتے ہیں کہ جودی سے مقصود "اجودھیا"[۱۲۵] ہے۔ اس کے لئے دلائل بھی پیش کرتے ہیں۔ کوئی ان کو مانے یا نہ مانے اور ماننے کے لائق ہوں یا نہ ہوں۔

---

۱۲۳ کی اصحاح سادس کی آیتہ ۱۴۔ ۱۲۴ کی پانچویں آیت۔

۱۲۵ گم گشتہ حالات اجودھیا مطبوعہ صفحات ۱۲ و ۲۴۔

میں نے اس مبحث پر ایک ضخیم کتاب قِصَّةُ الْجُودِيِّ وَالْقُرْآن[2] لکھی تھی جو نگار پریس لکھنؤ میں دسمبر ۱۹۴۲ء میں چھپنا شروع ہو گئی تھی مگر کاغذ کی کمیابی کی وجہ سے اس کی اشاعت حیز[126] التوا[127] میں ہے۔

لوئیس بک صاحب کا قصیدہ اور مقالہ موصوف کے دیوان شعر النحلۃ (صفحات ۱۲۷ تا ۱۳۸) میں حیرت افزا معلومات کا حامل ہے۔

صفحہ ۲۲ - نوٹ ۱۶ - پورب

پورب قدیم سے علوم و فنون کا معدن و مخزن، علما کا موطن و مسکن چلا آتا ہے۔ ثانی صاحب قرآن شاہ جہان فخریہ کہا کرتا تھا۔ "پورب شیراز مملکت ماست۔" اس میں تین صوبے الہ آباد، اودھ، پٹنہ عظیم آباد داخل تھے۔ [سبحۃ المرجان - مآثر الکرام، صفحہ ۲۲۲ - حیات جلیل، حصہ اول، صفحہ ۴۰ - سیاحت نامہ ڈی لیٹ، صفحہ ۱۴، نوٹ ۲۶ - ارلی ٹریولس ان انڈیا ۱۵۸۳ - ۱۶۱۹، صفحہ ۱۴۷، مرتبہ سر ولیم فاسٹر FOSTER مطبوعہ آکسفورڈ] ڈی لیٹ صفحہ ۱۱ پر رقم طراز ہے: "صوبہ آگرہ۔ بعض لوگ اس کو پورب اور پربت بھی کہتے ہیں۔" اس کتاب کا حاشیہ نویس اپنے نوٹ میں لکھتا ہے بظاہر یہاں کچھ غلطی ہے۔ پورب (مشرق) کا عام طور پر اس

---

[126] ہر چیز کا کنارہ - مکان - [127] ملتوی رہ جانا - لغواً پیچیدگی -

ملک پر اطلاق ہوتا تھا جو الہ آباد کے گرد و پیش واقع ہے۔ "پربت" سے مقصود پہاڑ ہو سکتا ہے اور بسن گڑھ اور لاہور ایک دوسرے سے چار سو میل انگریزی کے فاصلہ پر ہیں اور شہنشاہی سڑک اعظم دونوں کو ملاتی ہے۔ درختوں کی دوہری قطار سے زینت ہے۔ اور ایک خوش نما و دلکش سیر گاہ معلوم ہوتی ہے۔

(۱) صوبہ۔ وہ ایک بڑا قطعہ ملک یا پراونس (PROVINCE) کا ہوتا تھا۔ اور اس کا حکمران جو بادشاہ وقت کی طرف سے مامور و متعین ہوتا تھا۔ صوبہ دار یا نائب السلطان کہلاتا تھا۔ سرکار یا چکلا ایسے صوبہ کا ایک حصہ ہوتا تھا۔ اور پرگنہ سرکار کا ایک ٹکڑا۔

صفحہ ۴۴۔ مقالہ ۱۷۔ ملک محمد جائسی پدماوت

ملک صاحب، جائس، ضلع رائے بریلی، اودھ کے رہنے والے ہندی کے بڑے نامور شاعر تھے۔ سنہ ۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء) میں رحلت کی۔[۱۲۸]

برج بھاشا زبان کے سلسلہ میں مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ یہ بھاکھا کے نہایت زبردست اور مقبول شاعر تھے۔ خود ہندوؤں میں بھی آج تک

---

[۱۲۸] زبدۃ الکلام فی مشاہیر الاسلام، صفحہ ۶۰۔ و ہندی شاعری، اعظم کراوی، صفحات ۷۸، ۷۹، ۱۱۹۔

کوئی ان کا ہمسر پیدا نہیں ہوا۔ ان کی مثنوی پدماوت آج بھی گھر گھر پھیلی ہوئی ہے... ... ...[۱۲۹]"

ایک ہندو محقق تجویز فرماتے ہیں "سب فاضلوں کی رائے ہے کہ ملک محمد جائسی کی ڈالی ہوئی بنیادوں پر ہی اودھی میں گوسوامی تلسی داس جی کی رام چرت مانس (راماین) کی شاندار عمارت کھڑی کی جا سکی"۔

پنڈت شری نراین چترویدی اپنی کتاب موسوم بہ "تعارفِ تاریخ یعنی "ہندوستان کی مختصر تواریخ" میں تحریر کرتے ہیں :-

"تلسی داس کی رامائن نے زبان کی خوبی اور خیالات کی بلندی کے سبب سے شمالی ہندوستان میں صرف ہندی ہی نہیں بلکہ قومی کتاب ہونے کا درجہ حاصل کر لیا۔ اُس وقت سے اب تک ایسی ہر دلعزیز کوئی کتاب اس ملک میں تصنیف نہیں ہوئی تھی۔[۱۳۰]"

ممکن ہے کہ اس ثنا خوانی میں کسی سنجیدہ و شایستہ انسان کو مبالغہ و افراط کا انداز محسوس ہو اور اُس زمانہ سے اب تک کی دیگر زبانوں کی علمی و ادبی تصانیف کی خوبیوں سے ناآگاہی کا شائبہ نظر آئے۔ اس لئے میں اپنے خوش خصال حریف کو یاد دلاؤں گا کہ اس تاریخ کا جامع

نمبر ۱۲۹ مقالات، صفحہ ۱۸۔ نیز آب حیات، صفحہ ۲۰۔ نمبر ۱۳۰ پہلا حصہ، صفحہ ۲۹۶، الہ آباد، ۱۹۳۲ء۔

ہمارے صوبہ کے سررشتۂ تعلیمات کا ماہر افسر اور رائج الوقت زبانوں کا منجھا ہوا جاننے والا ہے۔ گوسائیں تلسی داس کے کمال کی تصدیق اور اس قسم کے اظہار خیال کے لئے اس کے بعد کسی دوسری سند کی حاجت نہیں ہے۔

پدمنی۔ پدماوتی۔ لفظی معنی گل نیلوفر۔ ہمیر سنگھ چوہان والی سیلان (لنکا) کی بیٹی تھی۔ رتن سین (بھیم سی) راجہ چتوڑ زبردستی چھین لایا تھا۔ علاء الدین کے دل کا شوق کا تقاضا تو یہی تھا کہ رانی پر قبضہ کامل حاصل کرے۔ مگر بعد کو اتنے ہی پر رضامند ہو گیا کہ اس کی صرف ایک جھلک دیکھ لے، وہ بھی آئینہ میں [۱۳۲]۔ اس کے تمام واقعات کم و بیش مشہور ہیں بھیم سی کا مقید ہو جانا، پدمنی کی ہوشیاری، اور اس کے مشورہ پر عمل کرنے سے شوہر کا تا نادیوں کی قید سے رہائی پانا۔ راجہ دیوپال کا تعشق مارا جانا، بڑے دلچسپ حالات ہیں جو فارسی اور ہندی کی متعدد ناولوں اور نظموں میں مندرج ہیں۔

پدماوت، پوربی زبان میں ۹۴۷ھ (۱۵۴۰ء) اور ۹۵۲ھ (۱۵۴۵ء)

---

[۱۳۱] مختصر تاریخ اسلامیان ہندوستان، از ایشری پرشاد، صفحہ ۱۰۲۔ [۱۳۲] ٹاڈ کا راجستھان انگریزی مطبوعہ ۱۸۷۳ء، مدراس، صفحہ ۲۲۰۔ ایضاً ترجمہ افق لکھنوی جلد اول، صفحہ ۹۹۔ حوالہ کا لج ہسٹری آف انڈیا از وھیلر۔ بیل کی ڈکشنری صفحہ ۲۱۵۔ حیات جلیل، صفحہ ۱۰۶، نوٹ ۸۲، حصہ اول۔ وقائع راجستھان، جلد اول، صفحہ ۱۱۵۔

کے درمیان کی تصنیف قرار دی جاتی ہے۔ یہ شیر شاہ سور کے نام سے منسوب ہے۔

شیر شاہ دہلی سلطانوں چار ہوں کھنڈ پتی جس بھانوں

حسنِ اتفاق سے اس کتاب کا اصلی نسخہ خود شیخ محمد جائسی کے قلم کا لکھا ہوا ریاست بہاول پور کے سرکاری کتاب خانہ میں محفوظ ہے۔

فارسی میں (نظم) حسین غزنوی کا قصہ پدماوت (نثر) رائے گوبند منشی کا تحفۃ القلوب (۱۰۶۲ھ = ۱۶۵۲ء)۔ بھاکھا نظم میں ملک محمد جائسی کی پدماوت (متوفی ۱۰۴۹ھ آخر عہد جہانگیر) اردو = نثر میں میر ضیاء الدین عبرت و غلام علی عشرت نظم میں۔ منشی درگا پرشاد سرور کی پدمنی [۱۳۳] ماڈ کے راجستھان پر ولیم کروک WILLIAM CROOKE کا مقدمہ [۱۳۴]۔ عاقل خاں رازی کی جنبش قلم کا بھی یہ قصہ ممنون ہے۔ جس نے ان سب سے پہلے زبان فارسی میں اس کو مدون کیا تھا۔

ملک محمد کی کتاب اتنی مقبول عام ہوئی کہ سو برس کے اندر اندر یعنی سولھویں صدی میں بنگالی زبان میں اس کا ترجمہ ہو گیا محرک اور باعث ایک مسلمان راجہ مانگن ٹھاکر والی اراکان و آسام ہوا۔ ترجمہ

---

[۱۳۳] مخزنِ ادب الشیخ عبد القادر، صفحہ ۹۶۔ [۱۳۴] صفحہ ۴۲۔ نیز مولوی حکیم نجم الغنی خاں کا تاریخ راجگان ہند (صفحات ۱۱۷ و ۱۱۹) میں اس پدماوت کے واقعہ کو نقل کرنا۔

کرنے والا بھی بنگال کا مشہور مسلمان شاعر علاءول شیخ تھا۔
چند اشخاص کی خاموشی یا انکار دقوع سے کیا ہوتا ہے۔ پدمنی کا واقعہ تو تمام مستند ہندو مورخوں اور شاعروں نے (جن جن کی اس زمانہ میں کچھ قدر و منزلت تھی) نہایت تحقیق اور پوری تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ میں اپنے ایک نامور معاصر بھائی پرمانند کی کتاب سے ذیل میں نقل کرتا ہوں۔ علاء الدین کی نسبت پہلے لکھ چکا ہوں۔ قادیان کتاب کو اسکی یاد ہو گی۔ وہ ایسا از خود رفتہ و زبان گا دانسان تھا جس کا عمل ہر وقت اس فرانسیسی مثل پر رہتا تھا۔ شرشے لی فیم (CHAR-SHEZ LA FEME) (عورت کی تلاش رکھو)۔
۱۲۷۵ء میں ایک نابالغ لڑکا رانا لکشمی چند کی گدی پر بیٹھا تھا۔ اس کا چچا بھیم سی مختار سلطنت تھا۔ اسی بھیمسی کی بیوی کا نام پدمنی تھا۔ جو لنکا کے راجہ کی لڑکی تھی اور حسن میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ اس کی خوبصورتی کی شہرت علاء الدین کے کانوں تک پہنچی۔ آتش شوق بھڑکی کہ پدمنی کو کسی نہ کسی طرح حاصل کرے۔ لشکر کشی کی۔ خوب مقابلہ ہوا۔ بالآخر قرار پایا کہ پدمنی آئینے میں اپنی صورت دکھا دے اور صلح ہو جائے۔ علاء الدین قلعے گیا۔ دونوں تاجدار ایک جا بیٹھے۔ آئینہ آگے رکھا گیا۔ پدمنی گھونگھٹ نکالے خنجر آبدار ہاتھوں میں لئے پیچھے آکر

کھڑی ہو گئی۔ بادشاہ اس کے جمال کو آئینہ میں دیکھ کر آئینہ کی طرح حیران رہ گیا۔ اس کے بعد تو ولولۂ شوق اور بھی بڑھا۔ تدابیر اور افسوں کام میں لائے گئے۔ بھیم سی گرفتار کر لیا گیا۔ پدمنی کی طلبی کے لئے قلعہ میں پیغام پہنچا۔ اس کے جواب میں پدمنی نے جو کچھ کہا یا کیا مشہور ہے۔ فوجی سوار، زنانہ پوشاک میں، سات سو ڈولیوں میں بٹھا کر باہر بھیجے گئے کہ یہ پدمنی کی سہیلیاں ہیں۔ خود پدمنی کے عوض اس کی پالکی میں اس کا نوجوان بھتیجا گورا، اکا بیٹا بادل بیٹھا علاء الدین کی فوجوں کا بھیم سی کے راجپوتوں نے جان توڑ کر مقابلہ کیا۔ بھیم سی موقع پاکر گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ نکلا۔ لیکن اس گھمسان لڑائی میں پانچ ہزار راجپوت جانوں پر کھیل گئے۔ گورا مارا گیا۔ اس کی عورت بڑی خوشی و دلیری سے ستی ہوئی۔ اس کا آخری فخریہ پیغام اور بیٹے کو وصیت تاریخ کا زیور ہے۔"

ناکامی کا داغ مٹانے یا اپنے ولولۂ شوق اور آرزو کو پورا کرنے کے لئے "علاء الدین نے پھر ایک بار چتوڑ پر حملہ کیا۔ نابالغ لکشمی مر چکا تھا تجربہ کار و خوش تدبیر بھیمسی گدی پر بٹھا دیا گیا تھا۔ دونوں فوجوں کے زبردست مقابلے ہوئے۔ سرنگیں لگا کر قلعہ کی دیوار توڑ دی گئی۔ کشت و خون کا بازار گرم رہا۔ دونوں طرف کے ہزاروں

بہادر کام آئے۔ بھیم سی کے گیارہ لڑکے راج گدی پر قربان ہو گئے بارہواں پانچ برس کا بچہ تھا۔ اس کو باپ نے روک لیا تا کہ رانا کی نسل قائم رہے۔ رانا نے جوہر کرنے کا حکم دیا۔ راجپوتوں نے کیسری بانا پہنا۔ مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ ۔۔۔ ۔۔۔"

میں اس بیان کو سادہ و بے تکلف افراط[۱۳۵] و تفریط[۱۳۶] سے دور، داد طرف دارانہ و متعصبانہ اظہار خیال سے خالی پاتا ہوں۔ توریہ و تاویل سے مبرا۔

ٹاڈ صاحب کی تحریر سے پایا جاتا ہے کہ مضبوط دل اور ہمت والے علاء الدین نے ازراہِ تلطف و نوازشِ شاہانہ بھیم سی اور پدمنی کے محل کو محفوظ و بدستور رکھا تھا[۱۳۷]۔ جو اس واقعہ اور اس کی حسرت آمیز کی یاد آج بھی دلاتا ہے۔ ایک ممتاز سیاح اسٹان ہارڈنگ (STAN HARDING) لکھتا ہے کہ وہ خوشنما قصر یا نظر فریب پویلین (PAVILION) اب تک برقرار اور اچھی حالت میں محفوظ ہے جہاں سے علاء الدین

---

۱۳۵ افراط، حد سے گزر جانا۔ ۱۳۶ تفریط کمی کرنا، کوتاہی کرنا۔ توریہ۔ کسی خبر کی حقیقت کو چھپانا اور کچھ اور ظاہر کرنا۔ تاویل، اولٹ پھیر، حیلہ شرعی۔

۱۳۷ ٹاڈ صاحب کا راجستھان، جلد اول، صفحہ ۲۱۲، مطبوعہ ۱۹۲۰ء، مقدمہ نویس ولیم کروک۔

کو اجازت دی گئی تھی کہ پدمنی رانی کی جھلک یا صورت شیشہ میں دیکھ لے جو سامنے کو مخالف رُخ محل میں بیٹھی ہوئی تھی۔ پدمنی کا خلوت کدہ (LONELY) "آبی محل" اسی کے قریب پہاڑی کے جنوبی کنارہ پر جو واقع ہے جس کی حال میں مرمت ہو گئی ہے بلکہ از سر نو تعمیر ہوئی ہے۔ گو مکھ تالاب کے شمالی کنارے پر پرانا اور خوبصورت سمدھیشور مندر (SAMIDHESWAR A TEMPLE) واقع ہے۔ اس کے نیچے جو درخت ہیں ان کے درمیان وہ راستہ ہے جو ان اندرونی یا زیر زمین کمروں کو جاتا ہے جہاں پدمنی رانی اور چتوڑ کی بادشاہت کی بڑی بڑی خواتین نے مع اپنی مصاحب و رفیق عورتوں کے جن کی تعداد کئی ہزار تھی آگ میں جل کر جان دیدی تھی، اور جوہر کی ہیبت ناک رسم کو انجام دیا تھا تاکہ مغلوب و مفتوح گروہ کا انجام دیکھنا ان کو نصیب نہ ہو۔ اسوقت ان پر صاف روشن ہو گیا تھا کہ اب قلعہ پر قبضہ نہیں رہ سکتا ہے۔[۱۳۸]

صفحہ ۴۳ - نوٹ ۱۸ - انی رائے

• انی رائے دلّی وہ شجاع راجپوت تھا جو قلعہ گوالیار پر مدت دراز

---

۱۳۸ السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا۔ مورخہ ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۹۴۲ء صفحات ۳۱ لغایتہ ۳۵۔

تک قابض رہا تھا۔ (ڈی لیٹ، صفحہ ۲۳۲، نوٹ ۱۷۶)

اس کی وفا کوشی اور آقا کی خیر اندیشی کا ایک واقعہ ڈاکٹر بینی پرشاد کی تاریخ جہانگیر (صفحہ ۱۹۹، نوٹ) سے نقل کرتا ہوں۔

شاہزادہ خسرو سے جب اُس کا باپ جہانگیر ناخوش ہو گیا اور قید کر دیا تھا تو اُس کو راجہ انی رائے سنگھ دلن کی حراست و نگہداشت و سپردگی میں دیدیا تھا۔ محل سرائے شاہی کی بیگمات نیز راجہ کے مخالفین بار بار سعایت[۱۳۹] کرتے اور جہانگیر سے کہتے رہتے کہ شاہزادہ کو اس ہندو راجپوت کے ہاتھ میں نہ رکھئے۔ جہانگیر نے بالآخر مجبور ہو کر ویسا ہی حکم دیدیا۔ آصف خاں اُسی وقت رات ہی میں بادشاہ کا نام اور حکم لیتا ہوا، شاہجہاں کا معتمد و مرسلہ بن کر، خسرو کو لینے کے لئے پہنچا۔ مگر راجہ نے حوالہ کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ میں سلطان خورم کا ادنےٰ چاکر و خدمت گزار اور بندۂ فرمان ہوں۔ مگر شاہزادہ کا بھائی میری تفویض و حوالگی میں ہے۔ خود جہاں پناہ نے دیا ہے۔ اس لئے بادشاہ کے سوا اُس کو کسی غیر کے حوالہ نہیں کر سکتا۔ صبح ہوئی۔ دربار لگا۔ انی راے نے بھی شرف حضوری حاصل کیا اور سارا ماجرا دو شینہ[۱۴۰] گوش گزار کر دیا۔ جہانگیر نے تحسین و آفرین فرمائی۔

---

۱۳۹ غمازی، بدگوئی۔ ۱۴۰ شب گزشتہ کا۔

یہ ہوا اور سب کچھ ہوا۔ پھر بھی کانوں نے سنا اور آنکھوں نے دیکھا کہ انی رائے سنگھ دلن سے لے کر خسرو آصف خاں کے حوالہ کر دیا گیا نتیجہ مشہور عام ہے۔ اس راجہ کا اصلی نام انوپ سنگھ گوت کا بڑگوجر تھا۔ دو پشت سے اکبری دربار میں رسائی حاصل تھی۔ شاہی محافظین خاص میں داخل تھا۔ ایک نہایت نازک موقع پر شکار جلوس میں شیر نے دفعۃً حملہ کیا تو اس نے بڑی چستی و چالاکی سے مقابلہ کیا اور جہانگیر اور شاہزادوں کو بچا یا تھا۔ جہانگیر اس سنگین واقعہ کو یوں قلمبند کرتا ہے "انوپ رائے سہ پایہ را از دست گذاشتہ بہ شیر متوجہ شد۔ شیر بہمان چستی و چالاکی کہ حملہ آور شدہ بود برگشتہ داد مردانہ بہ شیر زدہ بود شد۔ آن چوب کہ در دست داشت بہ ہر دو دست دو بار بر سر او محکم فرو کوفت۔ شیر دہن باز کردہ ہر دو دست انوپ رائے در دہن گرفت۔ انوپ رائے زور کردہ دست ہائے خود را از دہن شیر بیرون آورد۔ دو سہ مشتے بر کلہ او می زند۔ و بہ پہلو غلطیدہ بزانو افتادہ است می افتد در رنگ دو کشتی گر بر یک دیگر پیچیدہ غلطان شدند۔[1]"
اسی خدمت پر یہ خطاب جہانگیر نے دیا تھا۔ جہانگیر کے دل میں اس کا بڑا اعزاز و اعتبار تھا۔ انشاء پرداز اور خطوط لانے والے ...

---

[1] تزک، صفحہ ۹۰۔

بھی ماہر و کامل تھا۔[۱۴۲]

اس کے بعد تو یہ نام اس درجہ مقبول اور معروف ہوا کہ لوگ اس کے گرویدہ ہو گئے۔ روح اللہ خاں کے دیوان کا یہی نام اپنی رائے شہرت رکھتا ہے جو ذات کا برہمن تھا۔

صفحہ ۲۵ - نوٹ ۱۹ - اودے پوری

منوچی "اودے پوری" کے معنی خوشی سے بھری ہوئی بتاتا ہے! اور شہر یا ریاست اودے پور سے متعلق نہیں لکھتا۔ اسی طرح "اورنگ آبادی بیگم" سے "تخت کی آبادی" مراد لیتا ہے! اورنگ زیب نے جو نام بیگمات اور شاہزادیوں کو دئے تھے، اس نے اُن کی ایک طویل فہرست دیدی ہے۔ کسی بیگم کا نام کسی خاص مقام سے منسوب نہیں بتاتا حتے کہ اکبر آبادی کو "آبادی کی بادشاہ" لکھا ہے!!![۱۴۳]

کرنیل ٹاڈ لکھتے ہیں کہ اُودے سنسکرت میں اورینیس ORIENS

---

[۱۴۲] تذکرہ شاہزادہ خسرو، مولفہ مقبول صفحہ ۱۴۰ - امرائے ہنود، از منشی سعید احمد مارہروی صفحات ۵۱ تا ۵۵ - تزک جہانگیری، صفحہ ۹۰ - ادبیات مغل، صفحہ ۲۵۲ -

[۱۴۳] ہندوستان عہد مغلیہ میں، حصہ سوم، صفحہ ۷ -

کے مرادف ہے جس کے معنی نقطہ طلوع کے ہیں۔ بول چال میں "اودی" کہا جاتا ہے۔ مثلاً اودیت UDYADITYA' KHEAT یعنی اُٹھتا ہوا سورج۔ [۱۴۴]

مرزا محمد آغا خاں اودیماق مُغل میں فرماتے ہیں کہ بیگم اودے پوری اودے پور کی تھی۔[۱۴۵] پروفیسر نجیب اشرف لکھتے ہیں کہ پرستار جس شہر میں داخل ہوتی، اسی شہر کے نام سے منسوب کردی جاتی تھی۔[۱۴۶]

حسب روایت مسٹر ولیم آیرون، بائی اودے پوری نے گوالیار میں جون ۱۷۰۷ء میں انتقال کیا۔[۱۴۷] یہ زمانہ سنہ ۱۱۱۹ھ کے ماہ ربیع الثانی کے مطابق ہوتا ہے۔ موصوف اپنی کتاب (مغول آخرین، صفحہ ۵۴) میں تحریر کرتے ہیں کہ اودے پوری محل، مادرکام بخش، داراشکوہ کے حرم میں داخل ہونے سے پہلے ایک رقاصہ عورت (یا انگریزوں کے طرز تحریر و انشا کے موافق ایک رقاصہ لڑکی) تھی۔ عالمگیر نے اس کو دارا سے لے لیا تھا۔ پروفیسر جدوناتھ سرکار کی تاریخ اورنگ زیب (جلد اول، نوٹ ۶۳) میں بھی ایسا ہی لکھا ہے۔

---

[۱۴۴] صفحہ ۳۳، نوٹ، تاریخ راجستھان، جلد دوم، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۹۴ء۔ [۱۴۵] صفحہ ۵۵۱ مطبوعہ ۱۹۱۷ء امرتسر۔ [۱۴۶] صفحہ ۵۵، مقدمہ رقعات عالمگیر۔ [۱۴۷] مغول آخرین (LATER MUGHALS) صفحہ ۲، آیرون۔

اور سب پوری کی اصل نسل کا پتہ چلانا اور وثوق و تعیین کے ساتھ کوئی بات کہہ دینا دشوار ہے۔ بیچارہ منوچی ایک بدیسی اور ناآشنا شخص تھا۔ وہ جتنی غلطیاں کر جاتا اور وہ سب کم ہے۔ اس کی اجنبیت سے بعید نہ تھا۔ خود معاصرین اور ہمارے ہم وطن اہل قلم نے بہت سی لغزشیں کی ہیں۔ مولوی حکیم شمس الغنی خاں رامپوری نے "وقائع [illegible]" میں اس کے متعلق بہت سی تحقیقات اور بحث کی ہے۔ اور ان کی خامیوں اور ان کے اختلافات کو دکھا دیا ہے۔[۱۴۸]

حکیم صاحب نے اس کا اصلی نام "سرونچی" لکھا ہے۔ موصوف نے اس خیر حسین ملکہ کی تصویر بھی دیکھی ہے جس سے اس کے حلیہ اور اعضا کی کیفیت ظاہری تحریر فرمائی ہے گویا کہ اپنے ہاتھ سے "قلم سے پوری صورت کشی کی ہے۔ جلال الدین شروانی کا حوالہ بھی دیا ہے۔ "تذکرہ عالم" اور "راحت افزا" کے بیانات سے بھی پردہ اٹھایا ہے۔[۱۴۹]

بیگم! شہنشاہ بیگم!! تیرا حسن دلربا اور جمال حیات افزا نہ رہا ہو — نہ سہی۔ مگر تجھ میں وفا شعاری کا جوہر تھا۔ اور خدمت گزاری کا سلیقہ اخلاص و محبت تیرا خاصہ تھا۔ جس نے اور کس نے ایسا دستگیر کہ وسیع جہاں دیدہ شخص کو تیرا گرویدہ بنا لیا تھا۔ تیرا آہ جبار سمر تاج اپنے

---

[۱۴۸] [illegible] جلد اول صفحہ ۹۰ [illegible]

[۱۴۹] [illegible] صفحہ [illegible]

وقتِ آخرین میں میرے فرزند جگر پیوند کو میری نسبت لکھتا ہے: "اور
پدری والدہ شما در بیماری بمن بودہ ارادہ نہ رفاقت دارد۔" [۱۵]

صفحہ ۲۲۔ نوٹ ۲۔ بھاشا

محققین فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں کئی صدیوں تک جو بولی رائج
رہی وہ سادہ بھاشا تھی۔ جو سنسکرت الفاظ کی آمیزش سے خالی تھی
اس کے متعلق پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے اپنے لکچر
موسوم بہ "ناگزیر تبدیل و تفال" میں بصراحت تحریر کیا ہے۔ بڑے اور اونچے
خاندانوں کی عورتوں کی جو زبان تھی وہ اور بھی آسان تھی۔ بے تکلف
ذرا سی کوشش سے سمجھ میں آجاتی تھی۔ موصوف نے اس کی نظیر
میں ایک خط اُنگ سندری دادی سمبت ۱۲۴۹ بکرمی یعنی عیسوی ۱۱۹۲ء کا لکھا ہوا
نقل فرمایا ہے۔ سالِ مذکور میں سلطان شہاب الدین محمد غوری اور مہاراجہ
پرتھی راج سے ترائن کے میدان میں آخری اور فیصلہ کن جنگ ہوئی
تھی۔ یہ پرتھی راج کا داماد یعنی پرتھا بائی کا شوہر چتوڑ کا راول سمر سنگھ
بھی اس میں شریک تھا۔ کام آیا۔ رانی پرتھا نے ستی ہونے سے پہلے
اپنے بیٹے کو یہ خط لکھ کر چتوڑ بھیجا تھا۔

---

۱۵ ۔ فتاویٰ عالمگیری - نول کشور پریس - صفحہ ۹۳

"میری حضوری سمر (جنگ) میں مارے گئے" اور ان کے سنگ رشی
کیش جی بھی بیکنٹھ کو پدھارے ہیں۔ رشی کیش جی اُن چار لوگوں میں
سے ہیں جو دلی سے میرے سنگ دہیز میں آئے تھے۔ اس لئے ان
کے بنسیوں کی خاطر رکھنا۔ دونے باپچھے مارا جیا دی گراں کے منشا
(کنبہ والوں) (اور) (اچاکری گریعنی نوکر چاکر)
کی خاطر راکھجو۔ ای ماراجیو کا چاکر ہے جو تھا سو سرکدی حرامخوری نیویگا۔[۱۵۱]
(یہ) (تم سے) (کبھی) (نہیں کریگا)

ہینڈٹن صاحب فرماتے ہیں کہ "ملکی زبان بلکہ زبانوں میں فارسی
الفاظ کا شامل ہونا آج کی بات نہیں جہاں تک تاریخ کی روشنی پہنچتی
ہے ایسا ہونا برابر پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ عربی فارسی لفظوں کا
ہندو مخدرات کے استعمال میں ہونا مسلمانوں کے راج سے پہلے
پایا جاتا ہے۔"

صفحہ ۲۸ - نوٹ ۲۱ - رجواڑہ۔

راجہ کے ترکیبی و اضافی مصطلحات میں ایک لفظ "رجواڑہ" بھی
ہے جو ہمارے زمانہ میں مسلّم اور متفق طور پر راجاؤں کے دارالصدر

---

۱۵۱ مضمون "چند غلط فہمیاں" صفحہ ۱۲۳ "چراغ محفل فصاحت" سنہ ۱۹۴۱ء، الہ آباد۔

یا ریاستوں کے حدود قلمرو کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن دو ڈھائی صدی پہلے اس کے معنی کچھ اور لئے جاتے تھے۔ ملا عبدالواسع ہانسوی[۱۵۱] نے جو اپنے فارسی قواعد " رسالہ عبدالواسع " کے نام اور ذریعہ سے کافی شہرت رکھتے ہیں، غرائب اللغات میں اس لفظ (رجواڑہ) کے معنی " قحبہ خانہ " کے لکھے تھے۔ خانِ آرزو سراج الدین علی خاں، اس پر برہم و معترض ہوئے۔ فرمایا کہ " رجواڑہ بدین معنی اصطلاحِ شاہ جہان آباد است بلکہ اردو است کہ این قسم اماکن اکثر در لشکر ہا می باشند۔ والّا در اصل رجواڑہ جائے بودن راجہا ست"۔

اس معنی میں یہ لفظ (رجواڑہ) اہلِ شاہ جہان آباد (دہلی) بلکہ اردو (لشکر) والوں کی اصطلاح ہو گی۔ اس لئے کہ راجاؤں کے لشکروں میں اس قسم کے ٹھکانے اکثر و بیشتر ہوتے ہیں۔ ورنہ اصلیت یہ ہے کہ راجگان کے رہنے کی جگہ " رجواڑہ " کہلاتی ہے۔

رجواڑہ کی مثال میں شاہ مبارک آبرو کا یہ شعر یاد رکھنے کے قابل ہے۔

فاسق کے دل پہ ڈالی حبِ نفسِ بد نے بر کی
رجواڑے کی گلی کا تب جا غبار دیکھا[۱۵۳]

---

[۱۵۱] مفصل حالات کارروائی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال بابت ۱۸۷۷ء صفحہ ۱۲۱ میں ملیں گے

اورینٹل بیاگرفی کل ڈکشنری صفحہ ۱۰۔ [۱۵۲] اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۲۱ء صفحہ ۳۸۔ از پروفیسر حافظ محمود شیرانی۔

کہ فارسی خواں ہندوؤں کی ضرورت ہوئی تو اس نے ایک دن دربار میں کہا کہ "کدام ہندو بچہ است کہ فارسی می داند؟" جواب ملا کہ ایک بھی نہیں تھا۔ اس پر بادشاہ نے اول برہمنوں کو طلب کر کے فارسی پڑھنے کے واسطے کہا۔ انھوں نے جواب دیا کہ مہاراج ہم کو اپنے دھرم کرم ودیا سے کہاں فرصت ہے جو فارسی پڑھیں۔ پھر چھتریوں کو بلا کر کہا۔ وہ بولے کہ ہم اہلِ سیف ہیں، اہلِ قلم بننا نہیں چاہتے۔ اسی طرح ویشوں نے عذر کیا کہ ہم تجارت پیشہ ہیں۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں کہ فارسی پڑھیں۔ جب شودروں میں کایستھوں کی باری آئی جو پہلے سنسکرت کی کتابت سے اوقات بسری کرتے تھے، اُنھوں نے خوشی سے قبول کر لیا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں فارسی پڑھ کر ملکی عہدوں پر مامور ہونے لگے۔ ان کی دیکھا دیکھی اور ہندو بھی پڑھنے لگے۔ اور سکندر لودی ہی کے زمانے میں اکثر ہندو فارسی عربی میں کامل ہو کر ان علوم کا درس دینے لگے۔ ... لیکن چونکہ ہندی ملکی زبان تھی اور ہزاروں ایسے ہندو جو فارسی نہیں جانتے تھے سلطنت کے کاموں خصوصاً محکمۂ مال میں ملازم چلے آتے تھے، اس کے علاوہ سکندر لودی کے بعد سے اکبر کے عہد تک ملکی انقلاب بھی جلد جلد ہوتا رہا اور کسی بادشاہ کو اتنی فرصت نہ ملی کہ ادھر

توجہ کرتا۔ لہٰذا ٹوڈرمل کے عہد تک دفتروں کا انتظام کچھ بہتر نہ رہا۔[157] علوم و فنون کی سرپرستی اور مساعی اشاعت و اذاعت[158] کے باوجود الفنسٹن نے (MOUNT STUART ELPH INSTONE) تاریخ ہند میں سکندر لودی کی بڑی برائی کی ہے۔ جرم وہی تعصب بربریت اور تذہیب کا لگایا ہے۔ حالانکہ دنیا پر بخوبی روشن ہے کہ وہ عالم، علم دوست اور صالح[159] بادشاہ تھا۔[160] الفنسٹن خود ہی یہ بھی روایت کرتا ہے کہ سکندر لودی نے عورتوں کو قبروں کی زیارت سے روک دیا تھا۔[161]

حالانکہ صاحب سیر المتاخرین، سلطان فیروز شاہ تغلق کے ذکر میں ناقل ہے کہ "بمقتضائے نیک ذاتی و نیک نیتی عورات مسلمہ و کافرہ را از رفتن بر مزارات و بت خانہا منع کرد و اسباب فسق و فجور مثل مے کدہ و بنگ خانہ و دیگر ملاہی منہدم گردانید۔"[162]

---

[157] امرائے ہنود صفحہ ۱۳۵۔ [158] اشاعت: پھیلانا، پراگندہ کرنا۔ اذاعت: آشکارا کرنا۔ [159] نکوکار۔ [160] طبع ہشتم، صفحہ ۱۹۴ مؤلفہ و مصححہ ای بی کاول (E.B. COWELL) سنہ ۱۹۱۱ء، لندن۔ [161] ایضاً، صفحہ ۴۴۸۔ الفنسٹن کی اس تاریخ کا ترجمہ "تاریخ ہندوستان" کے نام سے اردو میں ہو چکا ہے اور ضخیم ہے۔ یہ آسانی دستیاب ہو جاتا ہے۔ [162] صفحہ ۱۲۸، نول کشوری۔

نامور مورخ ایلیٹ نے سلطان کے اس کارنامہ کو اُسی کی زبان سے
یوں بیان کیا ہے " مسلمان شہروں میں ایک غیر شرعی رواج عام ہو گیا ہے
متبرک دنوں میں عورتیں پیادہ پا' یا سواریوں پہ' جھنڈ کے جھنڈ مقبرہ
کی زیارت کو جاتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے حکم دیدیا کہ کوئی عورت
مزارات پہ نہیں جا سکتی ۔ اب اللہ کا شکر ہے کہ کوئی شریف مسلمان عورت
قبروں کی زیارت کو نہیں جاتی ۔ یہ رواج اب بالکل موقوف ہو گیا ہے "[163]

باز آمد ۔ تاریخ بتاتی ہے کہ فارسی تعلیم کا رواج ہندوؤں میں سکندر لودھی
سے پہلے شروع ہو چکا تھا ۔ سلطان فیروز شاہ تغلق ۷۵۲ھ (۱۳۵۱ء)
میں تخت نشین ہوا ۔ کانگڑہ کی فتح کے موقع پر جوالا مکھی کی سیر کو گیا وہاں
ایک چھوٹا سا کتب خانہ ملا ۔ پنڈتوں کو بلا کر چند کتابوں کا فارسی میں ترجمہ
کرایا ۔ مصنف سیر المتاخرین کا بیان ہے کہ " سلطان علمائے آں طائفہ را
بحضورِ خویش طلب داشتہ مضامین آں را شنیدہ محظوظ گردید و فرمود
بعضے ازاں کتب را بہ فارسی ترجمہ کنند ۔ تا مطلب آں درست
و بآسانی فہمیدہ آید ۔ مولانا عزالدین حسب الامر کتابے در حکمت طبیعی از آں
کتب چیدہ مطالب آں را در سلکِ نظم کشید و بکتاب فیروز شاہی موسوم
گردانید "[164] سلطان نے اس گروہ کے عالموں کو اپنے سامنے بلایا ۔ ان

---

[163] از اصلاح نمبر ۱۸، بحوالہ تاریخ ایلیٹ، جلد سوم، صفحہ ۳۸۰ ۔ [164] (ملاحظہ ہو [illegible]

کتابوں کے مضمون سن کے خوش ہوا۔ فرمایا کہ ان میں سے بعض کتابوں
کا ترجمہ فارسی میں کیا جائے تاکہ ان کا مطلب درست اور آسانی
سے سمجھ میں آجائے۔ اس حکم کے مطابق مولانا عزالدین نے ان کتابوں
میں سے ایک کتاب حکمت طبعی کی فن کر اثیر [۱۴۵] کا مطلب نظم میں کہہ دیا۔
اس کتاب کا نام فیروز شاہی رکھا گیا۔

نامور مستند اہل قلم سر ہنری ایم ایلیٹ SIR HENRY MYE-
کی تاریخ ہند (جیسی کہ اس ملک کے مورخین نے لکھی RS ELLIOT--
ہے) جلد ششم صفحات ۲۳، ۵، ۲، ۷، ۵ (مع انڈکس صفحات مذکورہ)
کے حوالے سے پروفیسر ایشوری پرشاد اپنی تاریخ عہد وسطیٰ (انگریزی)
میں تحریر فرماتے ہیں کہ ایلیٹ صاحب نے نواب جلال الدین فرخ کے کتب
خانہ واقع لکھنؤ میں سنسکرت کی ایک کتاب کا ترجمہ دیکھا تھا جو ہم
کو اکبر [illegible] تھی۔ یہ فارسی ترجمہ فیروز تغلق کے عہد میں ہوا تھا۔ ایلیٹ
کی تاریخ مرتبہ جان ڈاوسن (JOHN DAWSON) مطبوعہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) صفحہ ۹۳ نول کشور۔ مسٹر بیلی نے اعز الدین خالد خانی کے اس ترجمہ
اور کتاب کو دلائل فیروز شاہی کے نام سے یاد کیا ہے۔ ترجمہ سنسکرت سے فارسی میں کیا
گیا تھا۔ کتاب علم طبیعیات نجوم و الٰہیات کی جامع ہے۔ (فرشتہ مترجمہ صفحہ ۱۰۸)
۱۴۵ مرآۃ السلاطین صفحہ ۹۳۰ جلد اول۔

لندن، ۱۸۶۶ء)

صحیح یہ ہے کہ باقاعدہ اور عمومیت کے ساتھ ہندوؤں میں فارسی تعلیم
کا رواج سکندر لودی کے زمانہ سے ضرور ہوا۔ اُس نے محض ترغیب
و تشویق ہی سے کام نہیں لیا بلکہ ہندوؤں کے تھان کی جگہوں میں مساجد
مدرسے اور بازار قائم کیے سپاہیوں کو بھی تعلیم پر مجبور کیا۔ نتیجہ یہ تھا کہ
ہندوؤں میں بھی عام طور پر فارسی تعلیم رواج پا گئی۔ فرشتہ شہادت
دیتا ہے "در بتخانہا کہ ہندوان[143] غسل می کردند، سرا و مسجد و مدرسہ
و بازار ساختہ موکلان گماشتہ اند۔" وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ بسبب
فرخندہ او علم رواج یافتہ و امرا و ارکان و سپاہیان بکسب فضائل
اشتغال نمودند و کافران بخواندن و نوشتن[144] خطِ فارسی کہ تا آں زمان
درمیان ایشاں معمول نبود، پرداختند" [ان اچھے اچھے مقامات پر
جہاں ہندوؤں کے استھان ہوتے تھے سرائیں، مسجدیں، مدرسے اور
بازار بنوا دیے اور نگراں مقرر کیے۔ اس کے مبارک عہد میں علم کو
رواج بڑھا۔ امیر اور ارکان شاہی اور سپاہی ہنروں اور فضیلتوں
(باطنی نعمتوں) کے حاصل کرنے میں مشغول ہو گئے۔ اور ہندو فارسی
خط کے پڑھنے اور لکھنے میں جس کا اُس زمانہ تک ان میں معمول نہ تھا مصروف

---

۱۴۳ مقالہ دوم صفحہ ۱۸۶ - نول کشوری   ۱۴۴ مقالہ دوم صفحہ ۱۸۶

ہو گئے۔]

تاریخ داؤدی اور جامِ جہاں نما سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

صفحہ ۹۰۔ نوٹ ۳۳۔ سلطان معز الدین محمد سام ملقب بہ شہاب الدین غوری

پہلے غزنین کا گورنر تھا۔ خراسان فتح کیا۔ ہندوستان کے ایک بڑے حصے کو تسخیر کیا۔ دہلی اور اجمیر کے راجاؤں کو گرفتار کر کے قتل کیا۔ اپنے بھائی کے مرنے پر ۵۹۹ھ (۱۲۰۳ء) میں تخت پر بیٹھا۔ مدت سلطنت تو تین ہی سال تھی مگر مورخین اس کا عہدِ حکمرانی مجموعی حیثیت سے تیس سال شمار کرتے ہیں۔ ۲ شعبان ۶۰۲ھ (۱۴ مارچ ۱۲۰۶ء) کو گکھڑوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔[۱۲۸] آغازِ کار میں اس کی مدد امام فخر الدین رازی نے اپنے مال و دولت سے کی تھی۔ جب وہ عروج پاکر سلطان ہوا تو یہ اُس کے دربار میں گئے۔ شہاب الدین نہایت اعزاز و احترام کے ساتھ پیش آیا۔[۱۲۹]

دہلی کی مسجد "قوۃ الاسلام" یا "مسجد آدینہ" شہاب الدین کی

---

[۱۲۸] بیلی کی ڈکشنری صفحہ ۳۰۱۔ تحفۃ الکرام جلد دوم صفحہ ۱۱۲۔ سیر المتاخرین صفحات ۹۶ و ۱۰۵۔ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحات ۵۶ تا ۶۰۔

[۱۲۹] علمائے سلف مولفہ مولانا شروانی۔

یادگار ہے، جس کا تذکرہ تقویم البلدان اور فتوحاتِ فیروز شاہی میں موجود ہے۔[۱۶۱]

فتح ہند شہاب الدین کے ذکر کے ساتھ ایک ہندوستانی شاعر چندر بردے کا نام خود بخود زباں پر آجاتا ہے۔ وہ دربار راج دہلی کا بڑا با اثر شاعر تھا۔ اس کے کارنامے اور اس کے آقا کے انجام سے تاریخ کا ادنے طالب علم بھی واقف ہے۔[۱۶۲]

چندر یا چاند کے حالات ہندی تاریخ نویسوں اور تذکرہ نگاروں نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ لیکن اُن میں شاعرانہ انداز اور انشا پردازانہ شان غالب ہے۔ یہاں نہ کسی ملکی و سیاسی رنگ کو دکھانے کی ضرورت ہے نہ کمال فن پر بحث کرنے کی۔ بیل صاحب فرماتے ہیں کہ "چاند کا نام نرکلا بھی تھا جو اُس کے مفروضہ پیغمبرانہ اعجاز پر مبنی تھا۔ اس کا زمانہ بارہویں صدی عیسوی کا آخر سمجھنا چاہئے۔ اپنے آقا پرتھی راج یا پتھورا کے گرفتار ہو جانے پر (۱۱۹۳ء) یہ بھی غزنی پہنچا۔ شہاب الدین کا خون کر ڈالنے کے بعد خود بھی اپنی جان

---

[۱۶۱] مسلمان تاجداران ہند، جلد اول صفحات ۴۹-۵۰۔ [۱۶۲] نامی شاعر- آب حیات صفحہ ۱۷۔ [۱۶۳] اورینٹل بیاگرفی کل ڈکشنری، صفحہ ۱۰۲- یا ۱۱۹۳ء حسب تحریر آب حیات، صفحہ ۱۷۔

جس طرح سری گوسائیں تلسی داس جی[۱۷۵] "چوپائی" کے بادشاہ تھے۔ یہ تنہا شاعر ہی نہ تھا بلکہ پرتھی راج چوہان کا وزیر بھی تھا۔ سمت گیارہ سو انچاس میں پرتھوی راج کے ساتھ مارا گیا[۱۷۶]"

بھائی پرمانند "تاریخ راجستھان" میں لکھتے ہیں "عام خیال ہے کہ چند بردائی کی مشہور شاعرانہ تصنیف "پرتھوی راج راسا" ہندی زبان میں پہلی بڑی کتاب ہے اور یہ کہ ہندی زبان اس وقت تک ایک آزاد زبان بن چکی تھی۔ یہی پہلی کتاب ہے جس میں اس ملک کے لوگوں کے لئے "ہندو" شبد بار بار استعمال کیا گیا ہے۔ ہندی بھاشا اسی سے شروع ہوتی ہے[۱۷۷]"

صفحہ ۳۰۔ نوٹ نمبر ۲۔

اس قسم کی چھیڑ چھاڑ کا واقعہ سوریوں کے عہد کا ملا بدایونی نے بھی لکھا ہے۔

سلیم شاہ گاہے مرزا (کامران) را طلبیدہ شاعرہ می کرد۔ صحبت بناخوشی می گزشت۔ و میرزا از آن تکلفات و توا ضعات بسیار بجان

---

۱۷۵ تلسی داس اور راماین۔ آب حیات صفحہ ۱۱۔ ۱۷۶ صفحہ ۱۵۲ جواہر خسروی مطبوعہ علی گڑھ مرتبہ شمس العلما مولوی محمد امین۔ ۱۷۷ صفحہ ۷۰ مطبوعہ لاہور ۱۹۳۲ء

آمدہ از عمر و زندگی بیزار گشت ۔ و فرصت بجہت برادی جست ۔ و افغانان بادی بزبان ہندی ہر لے می کردند ۔ و چوں بدربادی آمد می گفتند مورد مرغ ہمی آید ۔ مرزا از یکی مقربان حضور سلیم شاہ پرسید کہ مورد گرامی گویند ۔ او گفت مردے عظیم الشان را می گویند ۔ مرزا گفت بریں تقدیر سلیم شاہ خوش مورد باشد و شیر شاہ ازاں ہم خوش تر بود ۔ [178]

صفحہ ۳۳۳ ۔ نوٹ ۲۵ ۔ عبدالرحیم خان خاناں

جو خان میرزا بھی کہلاتا ہے بیرم خان کا بیٹا تھا ۔ ۱۴ صفر ۹۶۴ھ (۱۷ دسمبر ۱۵۵۶ء) کو پیدا ہوا ۔ چار برس کا تھا جب اس کا باپ مارا گیا ۔ جوان ہوا تو باپ کا منصب ساتھ ہی خانخاناں کا خطاب اور گجرات کی حکومت ۹۹۳ھ (۱۵۸۵ء) میں پائی [179] ۔ اس کی لڑکی جانی بیگم شاہزادہ دانیال کو بیاہی تھی ۔ اس نے عہد جہانگیری کے بھی اکیس سال دیکھے تھے ۔ بہتر سال کی عمر میں ۱۰۳۶ھ (۱۶۲۷ء) میں دنیا سے رخصت ہوا ۔ قبر دہلی میں ہے ۔

---

[178] منتخب التواریخ، جلد اول، صفحہ ۳۹۰ ۔ [179] ترجمہ آئین اکبری جلد اول صفحہ ۳۳۳

عبدالرحیم خاں کے حالات اور کارنامے اس کی زندگی میں ایک ایرانی اہلِ قلم مُلّا عبدالباقی نے لکھے تھے۔ یہ ضخیم و مبسوط کتاب مآثرِ رحیمی کے نام سے طبع ہو چکی ہے۔ اس میں اس کا عربی، فارسی، ترکی کا کلام بھی موجود ہے۔ یہ رحیم تخلص کرتا تھا۔[۱۸] خود جہانگیر تزک میں چار زبانوں میں اس کی مہارت کی تصدیق کرتا اور اس کے علمی مدارج، شاعرانہ عروج و قوت اور قدرتِ کلام کی ان الفاظ میں سند دیتا ہے "خانخاناں در قابلیت و استعداد یکتائے روزگار بود۔ زبانِ عربی و ترکی و فارسی و ہندی می دانست۔ و از اقسامِ دانشِ عقلی و نقلی بلکہ علومِ ہندیہ بہرہ وافی داشت۔ در زبانِ فارسی و ہندی شعر نیکو گفتے" مآثر کا مصنف ایرانی تھا، وہ غریب بھلا شاعر کیا سمجھ سکتا تھا؟ اس لئے اس کے نمونے بھی نہیں دئے ہیں۔ البتہ وہ لکھتا ہے کہ خانخاناں نے فارسی میں جس قدر کہا تھا اُس سے کئی گونہ ہندی زبان میں تھا۔ افسوس ہے کہ ان اشعار کے سوا جو ہندی شاعری نے شائع کئے ہیں یا کورس (اسکولوں) کے چند انتخابات میں نظر آجاتے ہیں، اس کا ہندی کلام ناپید ہے۔

اس کا فارسی دیوان بھی غائب ہے۔ بابر نے اپنے سوانح و واقعات

---

[۱۸] بیل کی ڈکشنری، صفحہ ۸۔

اپنی زبان (ترکی) میں حوالۂ قلم کئے تھے۔ خان خاناں نے اس کتاب تزک بابری کا ترجمہ فارسی میں کیا ہے[۱۸۱]۔ اس کی روانی، سادگی، شستگی اور صفائی زبان کی اہل نظر بہت تعریف کرتے ہیں۔ یہی واقعات بابری اور وقائع بابری کہلاتی ہے[۱۸۲] اور مقبول ہیچ مداں کے مطالعہ میں آچکی ہے۔

خان خاناں کی خوش استعدادی، علمی و ادبی قابلیت، انتظامی سلیقہ و شان اور ہر فن کمال کے لحاظ سے اکبر نے اس کو جہانگیر کا اتالیق مقرر کیا تھا۔

صفحہ ۳۴ نوٹ ۲۶۔ ٹوڈرمل

غریب گھرانے کا بچہ، ذات کا کھتری اور اعتقاداً پکا ہندو تھا۔ مالی معاملات میں اکبر کا دیوان، مشیر اعظم اور قوت بازو تھا۔ مالگزاری، خراج و محاصل ملکی اور نقدیات سب کے سب اسی کے زیر نگرانی و اہتمام تھے۔ اس نے کئی صوبوں کی پیمائش اپنے اہتمام و ہدایت سے کرائی تھی۔ (صفحہ ۳۴، بابو تریپراری سرن کی کتاب معلومات عامہ پر)[۱۸۳]۔ ضلع سیتاپور

[۱۸۱] آئین اکبری، جلد اول صفحہ ۷۰۔ [۱۸۲] رسالہ معارف نمبر ۱، جلد ۴۹، ماہ جنوری ۱۹۴۲ء صفحات ۴۰ تا ۵۳۔ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۱۱۔ مجمع النفائس خان آرزو۔ طبقات اکبری صفحات ۳۰۲ و ۵۲۹۔ [۱۸۳] پنڈت ایشری پرشاد کی تاریخ مسلمانانِ ہندوستان صفحات ۳۰۲ و ۳۳۱۔

(اودھ) کے لاہر گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ جہاں اس کے متعلقین کے گھنڈر اب تک موجود ہیں۔ کام کرنے کا طریقہ نہایت جلد، مجھ بیٹا اور خوب محنت و تندہی سے انجام دیتا تھا۔ اس نے شیر شاہ سوری کے زمانہ میں بھی نظامات ملکی کے سلسلہ میں کارہائے نمایاں کیے تھے۔ بہادر اور جاں باز بھی تھا۔ اکبر کے زیرِ حکم بنگال اور بہار کو بڑی دلیری اور مردانگی سے فتح کیا تھا۔[۱۸۵]

اکبر کے ۲۷ جلوس میں راجہ ٹوڈرمل نے زمین کی پیمائش کرائی۔ مختلف قیمتیں اور شرحیں تشخیص کیں۔ اس کا شریکِ خدمت، رفیقِ کار اور دستِ راست امیر فتح اللہ شیرازی تھا۔ جس کی عالی دماغی، خوبی تدبر، حسنِ تدبیر و مصلحت اندیشی کا اس وقت ایران میں بھی کوئی مقابل و ہمسر نہ تھا۔ اسی کی نسبت ابوالفضل کا دعوےٰ تھا کہ "اگر کتبِ ناجائے دانش مفقود شوند او اساس نو بہ نہند"[۱۸۶]

---

۱۸۴ صاحب تاریخ امرائے ہنود لکھتے ہیں کہ ٹوڈرمل ٹنڈن گوت کا کھتری چونیاں ضلع لاہور کا باشندہ تھا۔ یہ ایشیاٹیک سوسائٹی بنگالہ کی کاوشں اور تحقیقات کا نتیجہ ہے کہ اس کا وطن لاہرپور قرار پاتا ہے۔ ۱۸۵ امرائے ہنود، صفحہ ۱۳۶۔

۱۸۶ تاریخ ایشری پرشاد، صفحہ ۴۰۔ مفتاح التواریخ۔ صفحات ۲۸۲-۹۹۸

٭ ٭ ٭

اسی سلسلہ میں بہ عہدِ شاہ جہاں، مرشد قلی خاں صوبہ دارِ دکن نے بعض انتظامات میں ردوبدل یا اضافے کیے تھے۔ خافی خاں نے منتخب اللباب میں ان کو بہ تفصیل ضروری تحریر کیا ہے۔[187]

۱۵۸۲ء میں ٹوڈرمل "دیوانِ اشرف" مقرر ہوا تھا۔[188]

ہمارے مورخ اور بیگانہ ممالک کے سیاح اور اہلِ قلم لکھتے ہیں کہ ٹوڈرمل کی پالیسی نہایت کامیاب ثابت ہوئی۔ اس سے نہ صرف سلطنت مغلیہ اور باشندگانِ ہند کو نفع پہنچا بلکہ غیروں نے بھی فائدہ اٹھایا۔

نادر شاہ جب ۱۱۵۲ھ (۱۷۳۹ء) میں ہندوستان سے رخصت ہو کر چلا ہے تو کروڑوں روپیہ زرِ نقد اور جنس و متاع کے علاوہ ہزاروں کاریگر، دستکار، ہنرمند، اہلِ حرفہ اور پیشہ وروں کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ان میں ایک سو تیس نفر منشی اور اہلِ کار تھے جو اسی گورد کے چیلے نسلاً بعد نسلٍ ہوتے چلے آئے تھے، حکومت تیموریہ کے تمام حسابات کا بوجھ اٹھاتے ہوئے تھے۔ مالیات کے نسق و نظم میں مہارت کلی رکھتے تھے۔[189]

---

[187] صفحات ۲۴۲ و ۲۴۳۔ مختصر تاریخ از ایشری پرشاد صفحہ ۵۱۹۔

[188] ایشری پرشاد، صفحہ ۴۰۹۔ [189] دکن کی سیاسی تاریخ، صفحہ ۲۸۲۔ مطبوعہ حیدرآباد۔

پروفیسر رابرٹس اپنی تاریخ ہند برطانوی میں اس کو "سب سے بڑا ہندو وزیر" لکھتے ہیں (صفحہ ۱۱) اکبر نے جو انتظامی اور مالی طریقہ سلطنت رانی جاری کیا، جس سے مغلی حکومت کو استقلال اور قیام نصیب ہوگیا، اسی ٹوڈرمل کی ایجاد و تجویز سے تھا۔ اسی نے سب سے پہلا اور سب سے بڑا بندوبست مالگزاری کا کیا تھا۔

صفحہ ۴۳ - نوٹ ۲۷ -

دفاتر کی زبانوں کا ردوبدل ہمیشہ اہلِ اقتدار و اختیار کی مرضی و صواب دید پر منحصر رہا ہے۔ ابو العباس فضل بن احمد اسفرائینی سلطان محمود کا وزیر مقرر ہوا تو اُس نے سلطنت کے توقیعات[۱۹۰] و مناشیر[۱۹۱] جو عربی میں لکھے جاتے تھے، فارسی میں لکھوانا شروع کر دیا۔ وہ قدیم شاہان ایران کی نسل سے تھا۔ فارسی اُس کی مادری زبان تھی۔ اُس کو اس زبان کے ساتھ بڑا لگاؤ تھا۔[۱۹۲]

زمانہ کا انقلاب، طبائع کا اختلاف کہیے یا انتظامی و سیاسی ضرورتوں کا

---

[۱۹۰] بادشاہی فرمان جو متضمن مُہر ہو۔ اور اُس پر شاہی دستخط یا نشانی۔ [۱۹۱] منشور، بادشاہی فرمان جس میں لطف و عنایت کا اظہار ہو۔ مناشیر جمع۔ [۱۹۲] آثار الکرام از حکیم شمس اللہ قادری، صفحہ ۸۲۔

"انتشا کہ عہد بہمنیہ کی طرح ابراہیم عادل شاہ اول (۹۴۱ تا ۹۶۵ھ مطابق ۱۵۳۵ تا ۱۵۵۷ء) نے اپنے ملکی حسابات کو جو فارسی زبان میں تحریر کیے جاتے تھے اردو میں تبدیل کرا دیا تھا۔ یہ کام برہمنوں کے سپرد کیا گیا تھا۔ جنھوں نے بہت جلد حکومت میں اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ اگر یہ دکن میں فارسی اثر کی مخالفت نہ کرتا تو بیجاپور میں اردو کو شاید ہی پھولنا پھلنا نصیب ہوتا"[۱۹۳]

جیسے اس زمانہ کی "یا ولایت دکن کی قدیم اردو ہندی کی نوعیت سے معلوم نہیں ہے۔ مگر اوراقِ تاریخ بتلاتے ہیں کہ یہ بادشاہ (ابراہیم عادل) سخت مذہبی آدمی پابندِ شریعت تھا۔ ایک طرف تو دعوے سے کہا جاتا ہے کہ وہ ضعیف العقیدت تذبذب مزاج "دوسروں کے ہاتھ میں آسانی سے چلا جانے والا انسان نہ تھا۔ دوسری طرف ملا ابوالقاسم فرشتہ[۱۹۴] کی روایت ہے کہ "دفتر فارسی برطرف ساختہ ہندوی کرد و برہامنہ را صاحب دخل گردانید"[۱۹۵]

اسی فرشتہ کا اردو مترجم لکھتا ہے کہ ۹۴۲ھ میں دفتر فارسی برطرف

---

[۱۹۳] اردو شہ پارے، صفحہ ۲۹- نیز ابراہیم شیرازی کی "فتوحات عادل شاہی" قلمی نقوش سلیمانی، صفحہ ۵۲- امرائے ہنود، صفحہ ۴۴ [۱۹۴] برہمنان-

[۱۹۵] تاریخ، جلد دوم، صفحہ ۲۷-

کر کے ہندوی کیا۔ اور برہمنوں کو صاحب دخل کر کے ابراہیم عادل شاہیہ خاندان کے تمام ضوابط اور مقررات مسل و رسم اور قلم دان ان کے ۱۹۵

مولانا شبلی تحریر فرماتے ہیں اس نے تخت نشین ہوتے ہی تمام کاروبار سلطنت ہندوؤں کے ہاتھ میں دیدیا تھا۔ دفتر کی زبان بھی بدل ڈالی تھی فارسی کے بجائے ہندی کر دی تھی ۱۹۶

اسی سلسلہ میں برہمنوں کی نسبت شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی کی تحقیق یاد رکھنے کے قابل ہے۔ تاریخ دکن میں لکھتے ہیں کہ گنگو برہمن سے پیشتر برہمن لوگ سلاطین اسلام کی نوکری نہیں کرتے تھے۔ پنڈتائی اور پروہتائی اور جوتش وغیرہ کی کمائی پر گزر کیا کرتے تھے۔ اگر اتفاقاً کبھی امرائے اسلام کے پاس آتے جاتے تھے تو صرف نجوم یا زائچہ خوانی وغیرہ کے ذریعے آتے اور انعام و اکرام لے کر چلے جاتے تھے۔ نوکری نہیں کرتے تھے۔ ۱۹۸

اب یہی سرگزشت ہندو مورخین کی زبان سے سن لیجئے۔ دونوں کے باہمی اختلاف رائے اور خیالات پر نظر ڈالئے۔ کہانی پرانی ہے

---

۱۹۶ صفحہ ۷۴، ترجمہ جدید تاریخ فرشتہ، باب چہارم ۱۹۱۴ء نول کشور۔ ۱۹۷ مقالات شبلی، مسلمانوں کی علمی بے تعصبی، صفحہ ۵۔ ۱۹۸ صفحہ ۹۱، مطبوعہ ۱۸۹۶ء

❊ ❊ ❊

تاریخ مہاراشٹر میں لکھتے ہیں "مسٹر راناڈے کہتا ہے کہ پندرھویں اور سولھویں صدی میں دکن کے مسلمان بادشاہ مذہبی تعصب نہ رکھتے تھے۔ اور انھوں نے وہ سختیاں نہیں کیں جو شمالی ہند میں ہندوؤں پر کی گئیں۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے اس نے کئی دلیلیں پیش کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ باہمنی خاندان کے اندر شکرگزاری کا خیال پایا جاتا تھا۔ اور وہاں کا تمام مالی انتظام ہندوؤں کے ہاتھ میں اور دیسی زبان میں ہی رہا۔ جب محمد تغلق نے مسلمان باغی سرداروں پر حملہ کیا تو تلنگانہ اور وجیانگر کے ہندو اُن کے ساتھ شامل ہو گئے۔ دوسرے مسلمان بادشاہ مرہٹہ سپاہیوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرتے تھے اور ہندو راجاؤں کی لڑکیوں سے شادی کرتے تھے مسٹر راناڈے کی مشہور قابلیت کو سامنے رکھتے ہوئے ان کا یہ خیال اور دلیلیں بالکل کمزور اور بودی نظر آتی ہیں۔ دہلی کے مغل بادشاہوں نے بھی ہندو راجاؤں کے ہاں شادی کیں، مثلاً شاہ جہاں، جہانگیر، اورنگ زیب کے باپ اور دادا ہندو لڑکیوں کی اولاد تھے۔ ان کے ہاں بھی ٹوڈر مل اور مان سنگھ جیسے بہتیرے ہندو منصب دار بنائے جاتے تھے، جن کی لیاقت اور بہادری سے مغل بادشاہوں نے اتنا فائدہ اٹھایا۔ مسٹر راناڈے اس غلطی میں پڑے ہیں کہ

دکن کے مسلمان بادشاہوں نے مرہٹوں کو اپنے یہاں عہدے دیئے یا ہندو سرداروں کی لڑکیاں لے کر ہندؤں پر خاصی مہربانی کی۔ تو جن ہندؤں نے ایسا کیا انھوں نے ملک کے فائدے کے لئے کیا۔" یہ دونوں باتیں ہی غلط ہیں۔ مسلمان بادشاہوں کا لڑکیاں لینا ہندوؤں کی قومیت کچل دینے کا ایک بڑا بھاری ذریعہ تھا۔ اسی طرح جاگیروں اور عہدوں کا قبول کرنا بھی ان کی غلامی کی ایک بڑی علامت تھی۔ ان کو قبول کرنے والے تو غلامی کی زنجیروں کو مضبوط کرنے والے تھے ... ... مسلمانی لہر دکن پہنچنے تک اپنی تندی کو تھوڑا بہت کھو چکی تھی اور اس میں اتنی طاقت نہ رہی تھی کہ وہ دکن کے لوگوں کی زبان اور مذہب پر اپنے زور سے حملہ کر سکے۔ لیکن وجیانگر کی ساری تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مسلمان بادشاہوں کے دلوں میں وہاں بھی ہندؤں کے برخلاف تعصب کی ذرا بھی کمی نہ تھی۔ اور اگر انھوں نے مرہٹہ سپاہیوں کو اپنی فوج میں رکھا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ بہت دور ہونے کی وجہ سے انھیں فوج میں بھرتی کرنے کے لئے کافی افغان خلجی یا ترک نہ مل سکتے تھے۔" [199]

---

[199] صفحہ ۱۴۳۔

صفحہ ۴۳ - نوٹ ۲۸ -

مجھے پتہ نہیں چلا کہ اکبر کا دفترِ مالی کتنا بڑا تھا اور ٹوڈرمل نے
کس عظیم الشان اور عظیم کام کے کایا پلیٹ کا بار اپنے سر لیا تھا -
بہت ممکن ہے کہ اُس وقت ابتدائی حالت میں اتنا بڑا نہ رہا ہو - مگر
اورنگ زیب کے شاہی دفاترِ حساب کے بارہ میں منوچی صاحب
لکھتے ہیں کہ وہ تو ساتھ ہی رہتے ہیں - اصل کاغذات کو خفیہ اور
بجائے دربار کے ہمراہ رکھے جانے کا معمول ہے - اور اس ضرورت کے
لئے اسّی اونٹ تیس ہاتھی اور بیس گاڑیاں سلطنت کے
حساب کتاب کے کاغذات سے لدی ہوئی ساتھ رہتی ہیں - ن ۲

صفحہ ۴۵ - مقالہ ۲۹ - راج ترنگنی اور اس کا مؤلف

کلہن کا صحیح تلفظ کلہنڑ یا کلہنڑا ہے - چمپک برہمن کے
بیٹے تھے - راج ترنگنی (RADJATARANGINI) راجگان
کشمیر کی تاریخ چار دفتروں میں ہے - چاروں منظوم ہیں - اور سنسکرت

ن ۲۰ - اسٹوریا ڈو موگر دوسرا حصہ ، صفحہ ۴۲۲ N. MANUCCI'S STORIA DO MAGOR.

میں ہیں۔ پہلا حصہ اشلوکوں میں خود موصوف کی تالیف اور تقریباً ۱۱۴۸ء تک کے حالات ہیں ہے۔ یہ راجہ جے سنگھ یا راجہ سنگھ دیو کا عہد حکومت (۱۱۲۸ سے ۱۱۴۹ تک) تھا۔ جس کی فرمائش سے یہ کتاب لکھی گئی۔ مسلمان مورخ اس کو جے سنگھ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔
(۲)۔ دوسرا اُس کا تتمہ ۱۴۱۲ء تک کا جونراج (جون راجا۔ یا جیسن راجا) زین العابدین عرف بڈشاہ کے عہد کے ایک مورخ نے لکھا۔ اسکی کتاب راجا ولی عرف زینہ ترنگنی کہلاتی ہے۔ اس میں ۱۱۴۹ سے لے کر ۱۴۵۹ء تک کے حکمرانوں کے حالات مندرج ہیں۔ بادشاہ کے حکم سے راج ترنگنی کا سلسلہ قائم رکھنے کے لئے لکھی تھی۔ تیسرا حصہ یعنی دوسرے کا ضمیمہ سری ورا (شرلویر) پنڈت نے جو جون راج کے شاگرد تھے، قلمبند کیا۔ یہ بھی زینہ راج ترنگنی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ جزو بعہد سلطان فتح شاہ والی کشمیر ۱۴۸۶ء (۸۹۱ھ) میں لکھا گیا تھا۔ اس میں پانچ مسلمان بادشاہوں کا ۱۴۷۷ء تک کا ذکر ہے۔ جورنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی لنڈن ۱۹۱۲ء (صفحہ ۵۹۸) میں لکھا ہے کہ بعد میں کچھ اضافے کئے تھے۔[۱]

---

[۱] کشمیری کتابوں کی فہرست مرتبہ مسٹر کلاسن GERARD L. M. CLAUSON.

پنڈت کلہن ۱۱۵۰ء یعنی سنگھ دیو والی کشمیر کے زمانہ تک زندہ تھے۔ تالیف شروع کرنے سے پہلے گیارہ "تاریخیں" ملک کی مطالعہ فرما چکے تھے۔ خرد مند آگاہ دل نیل کی مشہور تاریخ (نیل مت پُران) بھی آپ کی نظر سے گزر چکی تھی۔ جو سب سے پرانی تاریخ سمجھی جاتی ہے۔ کلہن مہاراج نے اپنی کتاب کو اپنے ملک کی قدیم روایاتی، اعتقادی، افسانوی تاریخ سے شروع کیا ہے۔ پہلا بادشاہ گونارڈ (گونند؟) کو بتاتے ہیں۔ جو انکے حساب سے ۲۴۴۸ سال قبل حضرت مسیح حکمراں رہا ہوگا۔ آخری راجہ ان ہی کے وقت کا سیتہ دیو، عیسوی سال ۱۱۵۰ کے قریب تھا۔

(ببیل کی ڈکشنری، صفحات ۱۳۹ و ۱۴۰)

جہانگیر اسکو تزک میں راج ترنگ کی تاریخ لکھتا ہے۔ اکبری عہد کے ترجمہ کا بھی حوالہ دیتا ہے۔ تاریخ فرشتہ (مقالہ دہم جلد دوم صفحہ ۳۴۳) میں یہ تحریر ہے کہ "کتاب راج ترنگنی، کہ عبارت از تاریخ بادشاہان کشمیر است در عہد او (زین العابدین) تصنیف شدہ، و کتاب مہابھارت کہ از کتبِ مشہورۂ ہند است، نیز فرمود، تا ترجمہ کردند۔ در زمانِ اکبرشاہ ترجمۂ مہابھارت راکہ بد عبارت بود، بار دیگر بہ عبارتِ فصیح برآوردند، و تاریخِ کشمیر را نیز بہ فارسی ترجمہ کردند"

لیکن اکبر کے روبرو جو راج ترنگنی پیش کی گئی تھی وہ یقیناً ہندی

زبان میں تھی (آئینِ اکبری، جلد دوم، صفحہ ۱۸۱)۔ غالباً اسی کا ترجمہ اکبر کے حکم سے مولانا شاہ محمد شاہ آبادی نے فارسی میں کیا تھا (آئین، جلد اول، صفحہ ۷۹)۔[۲۰۲]

مجھے آگاہی نہیں ہے کہ اکبر کے عہدِ دولت میں کتابوں کا ترجمہ کرانے کے لیے کیا اہتمام و انتظام ہوتا تھا۔ مگر آج سے دو سو برس پہلے کشمیر کی ایک دوسری تاریخ کے متعلق جو کچھ ہوا تھا اُس کو حوالۂ قلم کر دینا چاہتا ہوں۔

سکھ جیون ذات کا کھتری، کابل کا رہنے والا تھا۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی اس کے حسن و جمال نیز ذاتی کمالات کی نسبت تحسین فرماتے ہیں۔ نصیبہ نے یاوری کی۔ عالمگیر ثانی کے نام سے کشمیر فتح کیا۔ راجہ بنا دیا گیا۔ بہت سی اچھی اچھی باتیں اس ملک میں رائج کیں۔ اصلاحات عمل میں لایا۔ وہاں کے نامی گرامی شاعروں کی ایک مجلس مقرر کی تاکہ کشمیر کی تاریخ، ابتدائے آبادی سے اُس کے زمانے تک کی لکھ ڈالیں۔ اس کام کے لیے پانچ شخص مامور کئے۔ ملا محمد توفیق، توفیق تخلص تھا۔[۲۰۳]

---

[۲۰۲] تذکرۃ الواصلین از مولوی رضی الدین بسمل، صفحہ ۲۰۰۔ و ہماری زبان، نمبر ۱۸، جلد دوم، مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۴۲ء۔ [۲۰۳] تذکرہ حسینی، از میر حسین دوست، صفحہ ۷۹۔

اس کا اصلی نام لال جو تھا۔ میر صاحب لکھتے ہیں کہ کشمیری زبان میں
اس سے بڑھ کر کوئی شاعر نہ تھا۔ دوسرے محمد علی خاں متین تھے جن
کا تذکرہ مصنف "حیات الشعراء" کے نام سے کافی شہرت پا چکا ہے
حسام الدین خاں مغل باشندۂ کشمیر کے بیٹے اور بادشاہی منصبدار
تھے۔ [ان دونوں (باپ بیٹوں) کا ذکر تاریخ الہ آباد جلد اول صفحہ
۲۵۰ میں کر چکا ہوں]۔ تیسرے دکن کا نام بھی محمد علی تھا۔ مگر نصیب نہیں
ان پانچوں میں سے ہر ایک کی امداد کے لئے دس دس مستعد باکمال
"فضلی" مامور تھے۔ خدا معلوم اس کتاب کی تکمیل کی نوبت بھی پہنچی تھی
یا نہیں۔ بعض شعرا کی نامزدگی و انتخاب سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ
تاریخ نظم میں لکھی گئی ہوگی۔

راج ترنگنی جیسا کہ اوپر گزرا کشمیر کا معمول عہد وسطیٰ کا تاریخی کارنامہ
سمجھی جاتی ہے۔ یہ کسی حد تک ان لوگوں کا منہ بند کر دیتی ہے جو اگلے ہندوؤں
کی تاریخ نویسی اور مہارتِ فن کے قائل نہیں ہیں۔ پھر بھی ملک کی سرزمین بھی
فخر کر سکتی ہے کہ اس سے ایک رباعی اور القاب پرداز فرزند آنجہانی شری
رنجیت سنگھ پنڈت جیسے شعر کہنے والے کشمیری ہی کے فاضل و نامور شعرا کے قلم سے

۳؎ مصنف لوگ — خواہ کار دربار میں خواہ لڑائی میں۔ ۴؎ خزانۂ عامرہ صفحہ
۱۱۵ - امرائے ہنود، صفحہ ۲۸۲۔

اس کے دو ترجمے نکل چکے ہیں۔ ایک انگریزی کا دوسرا ہندی کا ۔ دونوں اصل سنسکرت سے کئے گئے ہیں اور شمالی ہند کے اہل علم کی قدر شناسی کے مستحق ہیں۔

راج ترنگنی کا فرانسیسی ترجمہ کپتان انتھونی ٹرائر (ANTHONY TROYER) کا اچھا سمجھا جاتا ہے۔[۲۰۶] انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے پہلے مسٹر ولسن (WILSON) نے کیا تھا۔ ایشیاٹک ریسرچیز[۲۰۷] میں شائع ہوا (تمہید تاریخ راجستھان) پھر ڈاکٹر سر اوریل اسٹائین (SIR M. AURIAL STEIN) نے اپنا ترجمہ مع اپنے مقدمہ و تشریحات ضمیموں اور انڈکس کے سنہ ۱۹۰۰ء میں دو جلدوں میں شائع کرایا۔ یہ نامور فاضل و مصنف وسط ایشیا اور ترکستان کا سیاح اور جہاں گرد صاحب نظر تھا۔ اس کا نام کشمیر کے ساتھ ملا کر لیا جاتا تھا۔ ڈائر صاحب کا ترجمہ تین جلدوں میں ہے جو سنہ ۱۸۴۰ سے سنہ ۱۸۵۲ تک چھپتا رہا۔ اب یہ بھی ناپید نہیں ہے۔

زینہ کا ایک انگریزی ترجمہ "کنگز آف کشمیر" کے نام سے مسٹر جے سی دت نے فرمایا تھا۔ ۱۸۹۸ میں طبع ہوا۔

---

۲۰۶ گارسان دی تاسی کا پندرھواں خطبہ صفحہ ۵۰۶ مطبوعہ سنہ ۱۹۳۵ء۔

۲۰۷ جلد پانزدہم۔

عذر۔ بھاکا اور سنسکرت کے کم جاننے سے، صحیح، بداں راقم سطور (مقبول) بعض ناموں کو صحیح نہیں لکھ سکتا۔ کرنیل برگز (COLONEL BRIGGS) کو تو یہ شکایت تھی کہ اگلے وقتوں کے مسلمان مصنفین نے ہندوؤں کے ناموں کو ایسا بنا بگاڑ دیا تھا کہ سمجھ میں نہیں آتے تھے۔[۲۰۸]" میں کہوں گا کہ مسلمان مورخین کی یہ روش ہمیشہ قابل ستائیش رہی ہے کہ ہندو راجگان، امرا اور عمائد کو تعظیم و تکریم سے دیکھتے اور لکھتے ہیں جیسے فرمانروا کو کرنیل صاحب کے اہل وطن ننداکہہ دینے میں بھی تامل کرتے ہیں اس کو یہ حضرات انند پال کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ (فرشتہ)

اپنے ایک ناچیز مقالہ میں جو "یادپاستان" کے عنوان سے معارف میں نکلا تھا۔ پنڈت کلہن، اُن کی راج ترنگنی اور کشمیر کی اور تاریخوں کے بارہ میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہوں۔[۲۰۹]

پنڈت جواہر لال نہرو اپنے سوانح "میری کہانی" میں فرماتے ہیں کہ راج ترنگنی ایک ہزار سال کی پرانی اور کلہن شاعر کی لکھی ہوئی راجیشری تاریخی نظم ہے۔[۲۱۰]

---

۲۰۸ راجستھان، جلد دوم، مطبوعہ کلکتہ، سنہ ۱۸۹۴ء، صفحہ ۳۰۱۔ [۲۰۹] نمبر ۲، جلد ۹ہ، محرم ۱۳۶۲ھ صفحات ۱۲۴ لغایتہ ۱۳۹۔ [۲۱۰] صفحہ ۷۵۶، حصہ دوم، جامعہ دہلی۔

منشی الملکی سبحان رائے مکتری متوطن پٹیالہ خلاصۃ التواریخ کی تمہید اور اپنے شوق و شغلِ مطالعۂ تاریخ کے سلسلہ میں ان کتابوں کی نسبت لکھتے ہیں :-

(۱) نسخہ راج ترنگنی کہ پنڈت رگھو ناتھ احوال راجہائے والا شان و رایان رفیع مکان بہ تفصیل در سنسکرت نگاشتہ و آنرا مولانائے عماد الدین بہ فارسی ترجمہ نمودہ۔

(۲) نسخۂ راجاولی کہ مصر بدیادھر اسامی راجہائے بخط ہندی نوشتہ و آں را نانکو رام خلاصۂ مریدانِ گسائیں ذلی بعبارتِ مرغوب بہ الفاظ در آوردہ۔

(۳) تاریخ کشمیری متضمنِ احوالِ چہار ہزار سال کہ مولانا شاہ محمد شاہ آبادی از لغتِ کشمیری بفارسی در آوردہ۔

صفحہ ۹۴ نوٹ ۳۰ - جے پور

تیمور کی اولاد کے تخت پر بیٹھ جانے سے[۲۱۱] کچھواہا خاندان کی عظمت کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ حالانکہ یہی زمانہ دوسرے راجپوتوں کے لئے تنزل اور مشکلات کا ہے۔ وجہ یہی کہ دہلی کے نزدیک ہونے سے اس

---

[۲۱۱] ہندوستان کی بادشاہی تیمور کے خاندان میں کم و بیش سوا تین سو برس رہی ہے۔

ریاست نے فوراً ہی مغل راجاؤں کے ساتھ دوستی اور رشتہ گانٹھ کر اپنے آپ کو مغل حکومت کا حصہ بنا لیا"۔ [۲۱۲] یہ دلیر ہمت، منچلے جاں باز کچھواہے راجا بھارمل اور بھگونت داس تھے۔ [۲۱۳] غیرت مند مورخ بھائی پرمانند سخت ناخوش ہیں کہ "اس بھگوان داس نے دہلی میں اپنے رسوخ کو بڑھایا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں۔ اس شخص نے اپنی لڑکی شاہزادہ سلیم کو شادی میں دے کر راجپوتی شان اور غیرت مٹی میں ملا دی تھی۔ باپ بیٹوں نے مل کر کلہاڑے کا دستہ بن کر راجپوت قوم کے درخت کو کاٹنے میں کوئی کسر نہ رکھی۔ [۲۱۴] دہلی کے بادشاہوں کو کسی راجپوت کا اپنی لڑکی دے دینا ایک ایسا قومی گناہ تھا جس کی تلافی کبھی نہ ہو گی۔ [۲۱۵] کچھواہا راجپوت اپنے آپ کو سورج بنسی نسل سے ملاتے ہیں۔ [۲۱۶] راجہ بھاڑامل والی امبیر نے اپنی بیٹی اکبر کو دی تھی۔ یہی ملکہ مریم الزمانی بنی مان سنگھ کی پھوپھی اور جہانگیر کی ماں ہوئی۔ [۲۱۷] ابوالفضل علامی نے اکبر نامہ میں لکھا ہے کہ اسی طرح خود راجا بھاڑامل ہی نے اپنی خواہش سے قرابت کی تھی۔ اور اکبر نے اپنے لئے منظور فرما کر

---

[۲۱۲] تاریخ راجستھان، بھائی پرمانند صفحہ ۹۶۔ [۲۱۳] تواریخ منتخب الکلام قلمی، نوشتہ ۱۰۰۴ھ ورق ۱۶۔ بل کی ڈکشنری، صفحات ۷۲ و ۱۳۷۔ [۲۱۴] صفحہ ۴۵۳۔
[۲۱۵] صفحہ ۴۵۴۔ [۲۱۶] صفحہ ۴۴۹ [۲۱۷] مرقع اکبرآباد، صفحہ ۱۶۳۔

اُس کی عزت افزائی کی تھی۔ یہی سب سے پہلی راجپوت لڑکی تھی جو اکبر کی محل سرا میں داخل ہوئی۔ [۲۱۸]

ایسی مخلوط قرابتوں سے [۲۱۹] ہندؤں خاصکر بعض ہندو مورخوں کا بُرا ماننا اور بُرا بھلا کہنا اور اسکی تحریک یا ابتدا کرنے والوں پر غم و غصہ کا اظہار بالکل بجا اور قطعًا جائز ہے۔ فطرت بشری کا عین اقتضا یہی ہے جیسا کہ بحوالہ پر ماننڈ بحوالہ ہیون سانگ (چینی سیاح و عالم) کے فرماتے ہیں "ہندوستان کے لوگوں کی شادیاں اپنی ذاتوں کے اندر ہوتی ہیں۔ ماں یا باپ کی طرف سے نزدیکی رشتہ دار آپس میں شادی نہیں کرتے اور عورت کبھی دوسری شادی نہیں کرتی۔ [۲۲۰]" لیکن ان راجپوت رئیسوں نے اس راستے کو چھوڑ دیا۔ نہ اختلاف قوم و ملت کو دیکھا نہ مذاہب کے جدا ہونے کا لحاظ کیا۔ خود مسلمان بھی ایسی شادیوں کو اعتراض کی نگاہ سے دیکھتے اور آج تک ان کے جواز و عدم جواز کے متعلق بحث کرتے ہیں۔ البتہ مرزا غالب کی بزرگانہ شفقت کا فیصلہ با شاعرانہ و فلسفیانہ

---

[۲۱۸] امرائے ہنود، صفحہ ۷۷۔ معارف، جلد اول نمبر اول، صفحہ ۴۹۔ مجموعۂ کلام شبلی صفحہ ۸۱

[۲۱۹] تاریخ الہ آباد، مولفہ مقبول، صفحہ ۱۰۶۔ مسٹر نانالال مہتا کا مقالہ "ہندوستانی تمدن میں اسلام کا حصہ"، تاریخ راجستھان، صفحات ۲۱۶ تا ۳۰۸۔ [۲۲۰] تاریخ راجستھان صفحہ ۷۷۔

[۲۲۱] سیر المصنفین، مولوی محمد یحییٰ، جلد دوم، صفحہ ۲۱۹۔

توجیہ یہ ہے :-

بامن میاویز اے پدرِ فرزندِ آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

ہمارے ہم وطن مورخین میں سے پنڈت الیشری پرشاد اپنی تاریخ عہدِ وسطیٰ (صفحہ ۳۶۸، نوٹ اول) میں اکبر کی اس مصلحت اندیشی کو کامیاب اور ایسے بین الاقوام (انٹرنیشنل) شادی بیاہ اور میل جول کو کامیاب تر تحریر فرماتے ہیں۔

بازآمد۔ انبیر۔ جے پور سے چار میل شمال پہاڑوں سے گھرا ہوا ایک مختصر سے تالاب کے کنارہ پر ہے۔ پہلے راج دھانی یہی تھا۔[۲۲۲] جے پور کی بنیاد ۱۷۲۸ء میں مہاراجہ سوائی جے سنگھ ثانی نے ڈالی تھی (صفحہ ۸۷، انگریزی عہد میں ہندوستان کا تمدن (یوسف علی)۔ یہ گلابی شہر بھی کہلاتا ہے)۔ مان متی کا باپ ادے سنگھ فرمانروائے مارواڑ تھا۔ ادے سنگھ نہایت جسیم تھا۔ اس لئے اکبر نے ایک ہزاری منصب کے ساتھ "موٹا راجہ" خطاب دیا تھا[۲۲۳] بھائی پرمانند لکھتے ہیں کہ اس کے ستائیس رانیاں تھیں، پھر بھی اضافہ کی ہوس رہتی تھی۔[۲۲۴]

---

۲۲۲ مختصر تاریخ راجپوتانہ صفحہ ۱۸۔ از مولوی عبدالرحمٰن خاں۔ ۲۲۳ مختصر تاریخ راجپوتانہ، صفحہ ۱۷۴۔ ۲۲۴ تاریخ راجستھان، صفحہ ۲۴۲

"مہاراجہ جے پور کے زنانہ محلات کے اندر ایک قدیم (غالباً لکڑی کا) پیالہ موجود ہے جسکی نسبت مہاراجہ بہادر نے یہ واقعہ سنایا کہ اس پیالہ میں وقت کے مہاراجہ اور اکبر اعظم نے اس طرح پانی پیا تھا کہ ایک طرف پیالہ اکبر کے لبوں سے اور دوسری طرف مہاراجہ کے منہ سے لگا ہوا تھا۔ اور مہاراجہ نے فرمایا کہ اس طریقہ سے ایک غیر شخص "ٹھاکر" کیا جا سکتا ہے اور جب وہ ٹھاکر ہو جائے تو لڑکیوں کی لین دین میں کوئی امر مانع نہیں رہتا ہے۔ اس لئے مہاراجگان جے پور نے اکبر اور اسکی اولاد کے ساتھ رشتہ کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا۔ یہ ایسا عجیب و غریب انکشاف ہے کہ وہ تمام نظریئے جو مغلوں اور راجپوتوں کی باہمی رشتہ داری کے متعلق مورخین نے لکھے ہیں بالکل بدل جاتے ہیں۔"

روایت بالا انہیں الفاظ میں بحوالہ رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو مجھے نواب اکبر یار جنگ بہادر سے پہنچی۔ نواب موصوف کا شکر گزار ہوں۔ تاریخوں کی ورق گردانی سے قیاس (اغلباً صحیح!) ہوتا ہے کہ یہ واقعہ راجہ بہارا مل کچھواہہ والی امیر کا ہوگا، جس نے سب سے پہلے اپنی خوش سلیقہ و باتمیز بیٹی (مریم زمانی، جہانگیر کی ماں) اکبر کو دی تھی۔ اسی راجہ نے پہلے پہل مغلوں سے قرابت کی۔ تمام مورخ اس بارہ میں متفق ہیں۔[۲۲۵]

---

[۲۲۵] اکبر نامہ، جلد دوم، صفحہ ۱۹۸؛ نول کشوری ... (باقی صفحہ آئندہ پر)

جے پور کی اوّلیات و خصوصیات میں چند باتیں اور "قابل تذکرہ ہیں:۔

(۱) راجپوتوں کی ریاستوں میں جے پور ہی کے ذریعے سے فارسی زبان کو فروغ حاصل ہوا۔[226] اور شستگی، صفائی اور اہمیت حاصل کی[227]

(۲) ریاست جے پور میں دائروں کے نام سے جو مذہبی ادارے اپنی قدامت اور اہمیت کے اعتبار سے شہرتِ خاص و افادۂ عام رکھتے ہیں، ان میں پرانی کتابوں کے ذخیرے بھی محفوظ ہیں۔ یہ ذخیرے مع سرکاری پوتھی خانہ کے، سیکڑوں دستاویزوں اور تحریروں اور قابل قدر قلمی کتابوں پر مشتمل ہیں۔ یہاں شہنشاہ اورنگ زیب کے مکتوبات موسوم بہ "کلمات طیبات" اور بہت سے اور قیمتی مخطوطات دیکھنے کے قابل ہیں۔[228]

(۳) جے سنگھ سیوائی ثانی بہیں، کا حکمراں و منتظم تھا، جو اپنے پردادا مرزا راجہ

(بقیہ صفحہ گزشتہ) تزک جہانگیری، صفحہ ، (قدیم)۔ تاریخ فرشتہ، جلد اول، صفحہ ۲۵۱ ۔ منتخب اللباب، حصہ اول، صفحہ ۱۵۹۔ مآثر الامرا، جلد دوم، صفحہ ۱۱۳۔ ۱۲۱۔ سیر المتاخرین، جلد اول، صفحہ ۱۸۶۔ ہندوستان کے قرون وسطے کی تاریخ، صفحہ ۲۵۱۔ مرقع اکبرآباد، صفحہ ۱۶۳۔ بیل کی ڈکشنری، صفحہ ۱۷۲۔ امرائے ہنود، صفحہ ۷۷۔ رسالہ معارف، جلد اول، نمبر اول، صفحہ ۴۹۔ [226] جائزہ زبان اردو، حصہ اول، صفحہ ۹۔ [227] ایضاً صفحات ۱۰ و ۱۱۔ [228] ایضاً، صفحہ ۵۱۔

جے سنگھ اول کے نقش قدم پر چلتا اور اہل کمال کی بہت قدر کرتا تھا
زیج محمد شاہی جو ہماری زبانوں پر "جنتر منتر" کے نام سے چڑھا ہوا ہے۔
اسی جے سنگھ کی یادگار ہے۔ جس کا شہرہ ایران تک پہنچا تھا اور جسکی
نسبت ملک الشعرا مرزا حبیب "قاآنی" نے کہا تھا ؎

تقویم مہ اول آرد بخشش مویت
چوں خط جداول بر مہد خانہ جے سنگھ[۲۲۹]

شہر الہ آباد کا کٹرہ جے سنگھ اسی جے پور کے راجہ جے سنگھ کے نام سے منسوب
ہے جو شہر جے پور اور اسکی متعدد بے نظیر عمارات کا بانی تھا۔
مرزا راجہ جے سنگھ کے رقعات کا نام "ہفت انجمن" ہے۔ اس میں
اورنگ زیب کے جاری کردہ احکام موسومہ عنایت اللہ خاں محفوظ ہیں۔
"احکام عالمگیری" کے سوا شاہ جہاں اور اس کے فرزندوں کے خطوط اور
"قیاس القوانین" کا بھی یہ مجموعہ ہے۔ (صفحہ ۱۵، سوانح ولیم آیمڈیر مشمولہ
لیٹر منظلس) مسٹر بیل اس راجہ کی نسبت (ڈکشنری صفحہ ۱۲۹) لکھتے ہیں
کہ راجپوتوں میں کوئی شاہزادہ فضائل و کمالات کے لحاظ سے اس کے
برابر نہیں گزرا۔ یہ ہندی کی کامل و بے نظیر استعداد رکھتا تھا۔ نیز
فارسی، اور عربی زبانوں میں بھی اسکو دخل حاصل تھا۔ بقول موصوف

---

۲۲۹ ایضاً، صفحہ ۱۱۔

(صفحہ ۱۲۰) "احکام عالمگیری" کا مولف اور "کلمات طیبات" کا جامع عنایت اللہ خاں پسر شکر اللہ خاں ہے۔

صفحہ ۵۰ نوٹ ۳۱ - رقیہ سلطان

ڈی لیٹ نے اپنے سفرنامۂ ہند کے صفحہ ۳۹ پر لکھا ہے کہ رقیہ سلطان بیگم جہانگیر کی بن بیاہی بہن کا نام تھا۔ یہ غلط ہے۔ مسٹر بنرجی (کتاب کے مترجم) کو کہیں ثبوت نہیں ملتا کہ بادشاہ کی کوئی بہن اس نام کی تھی۔ البتہ اکبر کی بی بی ہندال کی بیٹی کا یہ نام تھا۔ (نوٹ نمبر ایک)

اپنے محدود مطالعہ و واقفیت کی بنا پر اس کے متعدد حوالے اور شواہد[۲۳۰] نوٹ نمبر ۱۸۸ انتخی میں پیش کر چکا ہوں۔

صفحہ ۶۰ - نوٹ ۳۴ - علاء الدین

مسٹر بیلی لکھتے ہیں کہ چتوڑ فتح کر لینے پر سنہ ۷۰۳ھ (۱۳۰۳ء) میں پدماوت کو علاء الدین رتن سین سے چھین کر لے گیا تھا[۲۳۱]۔ وہ اپنی سند یا تحریر کا حوالہ نہیں بتاتے۔ بیلی صاحب محقق قلم کش تھے۔ شاید ان کو سورما کی کے ساکھا کرنے اور دیویوں کے جوہر کا یقین نہیں آیا۔ جن کو بعد مرگ

---

۲۳۰ جیمز شاہد۔ گواہ۔ حاضر۔ ۲۳۱ انتخب گزیٹیر صفحات ۳۴ - ۲۱۵

باردوش ہونا گوارا نہ تھا۔

پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی "منشورات" میں رقم پرداز ہیں کہ مولانا آزاد دہلوی نے جس مُعترِفانہ گرم جوشی اور دلسوزی سے "قصص ہند" میں رانی پدمنی کا باب لکھا ہے اُس کی مثال النّادر کالمعدوم ہے۔[۲۳۲] (شرح رانی نے جوہر کرکے خاندان کی آن پر جان قربان کی)۔

لیکن بقول ایک سنجیدہ مزاج تاریخ نویس بھائی پرمانند کے اس سے بڑا ساکا ایک اور تھا۔ وہ یہ کہ ایک بڑی بھاری چتا تیار کی گئی جس پر شاہی نسل کی سب شہزادیاں سرداروں اور ٹھاکروں کی بی بیاں اور ان کی سہیلیاں چڑھنے کے لئے تیار بیٹھی تھیں۔ اُن کی تعداد کئی ہزار بتائی جاتی ہے۔ جو خاندان کے نام سے آگے جان کو کچھ مال نہ سمجھتی تھیں۔ سب آئیں۔ سر سے پاؤں تک چادریں اُوڑھے ہوئے۔ پھولوں کی ایک ایک مالا گلے میں۔ رام رام کا سمرن کرتی چتا پر چڑھ گئیں۔ خوبصورت پدمنی ان سب کے درمیان جا کر بیٹھ گئی۔ اور چتا کو روشن کرنے کا حکم دے دیا۔ غار کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ نہ کہیں رونا نہ کوئی اور آواز سنائی دی۔ نہ کسی نے ان سب کے جل جانے پر افسوس کا اظہار کیا۔ اگنی دیوتا نے چند لمحوں کے اندر ان خوبصورت نوجوان اور نازک بدنوں کو جلا کر مٹی کا

[۲۳۲] صفحہ ۱۷۰

ڈھیر کر دیا۔"[۲۳۳] وقائع راجستھان میں بھی یہ واقعہ اسی تفصیل کے ساتھ منقول ہے۔[۲۳۴]

سلطان علاء الدین کے سوانح شاہانہ میں سے ایک اور کارنامہ قابل ذکر ہے۔ اس نے راجہ کرن والی گجرات پہ مہم بھیجی۔ راجہ اس جرار لشکر کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکا۔ راج دھانی (نہروالہ یا انہل واڑہ) چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ دیو گیر کے راجہ رام دیو کے یہاں پناہ گزیں ہوا۔ اس جنگ میں راجہ کرن کی رانی کنولا دیوی مع اور بہت سی عورتوں کے گرفتار ہو کر دہلی میں آئی۔ پری جمال کنولا دی حرم میں داخل ہو گئی۔ اپنی خوبصورتی، خوش سیرتی اور سلیقہ مندی کی بدولت علاء الدین کے دل میں بڑی قدر و منزلت حاصل کر لی۔ موقع مناسب دیکھ کر ایک روز سلطان سے عرض کیا کہ میری دو لڑکیاں وہاں چھوٹ گئی تھیں۔ ان میں سے بڑی تو بقضائے الٰہی رخصت ہو چکی۔ دوسری باقی ہے۔ چاہتی ہوں کہ منگوا دی جائے مجھ سے ملا دی جائے۔[۲۳۵] بادشاہ نے پسند کیا۔ رائے کرن کو شاہزادہ ولی عہد خضر خاں کے لئے رشتہ کا پیغام بھیجا۔ اس نے فخر و مسرت کے ساتھ

---

[۲۳۳] تاریخ راجستھان، صفحات ۲۷۵۔ نمائیہ ۲۸۲۔ حیات جلیل حصہ دوم، صفحہ ۱۰۶۔ نوٹ ۸۲۔ [۲۳۴] وقائع راجستھان، جلد اول، صفحہ ۱۲۱۔ [۲۳۵] تمہید مثنوی از مولانا سالم انصاری، صفحہ ۳۰۔

قبول کیا۔ لیکن مشیت خداوندی کچھ اور ہی تھی سلطنت رانی کی مصلحتوں اور ملک گیری کی ہوسوں کا اقتضا پھر اس کے خلاف ہوگیا۔ فوجیں گجرات کو بھیجی گئیں۔ راجہ نے پھر دیوگیر کی طرف گھوڑے کی باگ موڑی۔

مرتا کیا نہ کرتا۔ جب سنگل دیو مرہٹہ نے دیول دی کے لئے پیغام بھیجا۔ رائے کرن نے مجبوراً منظور کیا۔ دیول دی رخصت کردی گئی۔ وہ ایک مختصر سے محافظ بدرقہ[۲۳۶] کے ساتھ جارہی تھی اور دیوگیر کے قریب پہنچ چکی تھی کہ یکایک شاہی عساکر[۲۳۷] کے ہراول[۲۳۸] سے مقابلہ ہوگیا۔ دونوں طرف سے عاشقان جنگ اور طالبان نام و ننگ میدان میں آگئے۔ داد مردی و مردانگی دیتے رہے۔ کسی کاردیدہ دور انداز کا آہنی دوز تیر دیول دی کے گھوڑے کے لگا۔ وہ گرا۔ دیول دی دستگیر[۲۳۹] ہوئی۔ الغ خان الماس بیگ نے دہلی روانہ کردی۔ محل سرا نے شاہی میں دلی افزا ہوئی۔ جب وقت آیا تو بادشاہ کی اجازت بلکہ مرضی و منشا سے ملکہ جہاں نے خضر خاں کے ساتھ اس کا عقد کردیا۔

ان تمام واقعات کو کم وبیش امیر خسرو نے مثنوی دول رانی خضر خاں[۲۴۰] میں، مولانا ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں، ملا عبدالقادر

---

[۲۳۶] رہبر۔ قافلہ کی رہبر جماعت۔ [۲۳۷] لشکر۔ [۲۳۸] وہ فوج جو سب سے آگے تھی۔

[۲۳۹] دست گرفت شدہ یعنی گرفتار و قیدی۔ [۲۴۰] مطبوعہ علی گڈھ ۱۳۲۶ھ۔

بدایونی نے منتخب التواریخ میں، قاضی احمد غفاری نے نسخۂ جہان آرا میں، ملا قاسم ہندو شاہ نے تاریخ فرشتہ میں، شاعرانہ و مورخانہ دونوں رنگ میں دکھا دیا ہے۔ تازہ ترین تحریرات میں پروفیسر رشید سلیم انصاری کی تالیف ہے جو مثنوی دول رانی خضر خاں کی تمہید و تنقید کے طور پر بڑی خوبی اور نہایت دلچسپ انداز سے کامل تفصیل کے ساتھ حوالۂ قلم فرمائی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مرحوم نے ان تمام فریقوں کے پیچ در پیچ تعلقات، بعض راجگان کی سلسلہ جنبانیوں، فتنہ پردازیوں اور باہمی فسادات کو طشت از بام کر دیا اور چھپکا دیا ہے۔

جہاں تک کہ علاء الدین کی ذات اور شخصیت کا تعلق ہے۔ مجھے یہی کہنا ہے کہ دیول دی کا سارا معاملہ محض کنولا دی کی محبت کے سبب سے ہوا ہے۔ دوہری محبت کی دوہری زنجیریں باہم آمادۂ پیکار تھیں۔ بادشاہ کو کنولا رانی سے عشق تھا اور کنولا کی اپنے لخت جگر، اپنی بیٹی دیول دی سے فطری و مادری محبت و کشش۔ فرشتہ اور خسرو دونوں نے اسکو خوب جانچ کر لکھا ہے۔ اس رنگ کو سنگل دیو پسر رام دیو کی بے چینی اور رشتہ کی خواہش، اور راجپوتوں اور مرہٹوں کے تفرقہ و رقابت[۲۱۱] نے اور بھی شوخ کر دیا تھا۔ اس قدر تسلیم ہے کہ علاء الدین نے ملک نائب

---

۲۱۱ نگہبانی، انتشار۔

اُلغ خاں کو لکھا تھا" رائے کرن باید کہ دیول دی دختر او را خواہ بخوشی در رضا خواہ بہ عنف [۲۴۳] وجفا [۲۴۳] بجنگ آوردہ روانہ درگاہ سازند" طبقاتِ محمود شاہی، تاریخ مبارک شاہی واقعات بابری سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ علاء الدین نے دیول دی کو فطری جاذبہ محبت سے بیٹی کی طرح بلایا اور بہو بنا کر بیاہا یا۔ اور اس پوری سرگزشت میں اس کا ذرہ بھر لگاؤ بدعملی یا سختی کا نہ تھا۔

مسٹر بیل (T.W.BEALE) نے اپنی ڈکشنری میں علاء الدین کے محاسن اور نیکیاں خاصی تفصیل مگر مناسب ایجاز و اختصار کے ساتھ شمار کرادی ہیں۔ اس کے بیست سالہ دورِ حکومت کو اچھے لفظوں میں یاد کیا اور تحسین و آفرین کی نظر ڈالی ہے۔ قلمرو دہلی کی روز افزوں وسعت، فراخی و سرسبزی، مساجد، دار العلوم، حمام، مقبرے اور ہر قسم کی عمارات جو عوام الناس کی آسائش، سیر و تفریح کی غرض سے بنائی گئی تھیں محلات اور قلعوں کا ذکر کیا ہے۔ لکھتا ہے کہ یہ تعمیرات اس قدر تیزی و شتابی و عجلت سے تیار ہو گئی تھیں گویا کہ جادو کا کارخانہ کھڑا کر دیا گیا ہے۔ علاء الدین کے ممتاز شعراء، نامور فلسفیوں اور صوفیوں، اولیاء کے باکمالوں اہلِ تنجیم کی فہرست بھی دیدی ہے۔ [۲۴۴]

---

[۲۴۴] صفحہ ۴۴۔

پروفیسر گارڈنر براون (GARDENER BROWN) لکھتے ہیں کہ علاء الدین نے منگولوں کی مدافعت میں کارہائے نمایاں انجام دئے اور حدود سلطنت کی توسیع کی اور سب سے بڑھ کر ہندؤوں سے مصالحت؟ رکھی۔ اس بنا پر اسے یقیناً مدح و تحسین کا مورد ہونا چاہئے تھا۔ لیکن تاریخوں میں اسکی حکومت کے بیان کا سب سے بڑا جزو اس کے اصولِ نظم و نسق پر نکتہ چینی سے لبریز ہوتا ہے۔ اورنگ اور اکبر تک باوجود اپنے کارناموں کے سخت و درشت نکتہ چینیوں سے محفوظ نہیں۔ ؎۲۴۵

اسی کے ساتھ پروفیسر محمد نورالحق کی تحریر بھی دیکھئے۔ فرماتے ہیں کہ "تاریخ برنی کا وہ حصہ خصوصیت سے مطالعہ کے قابل ہے جو اس نے سلطان علاء الدین کے متعلق قلمبند کیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ راستی، صدق و دیانت وغیرہ اخلاقِ حمیدہ اس طرح عود کر آئے ہیں گویا خلافتِ راشدہ کا دور ہے۔ ساتھ ہی برنی کی جا و بیجا تنقید نے اس کی قدر و قیمت اور بڑھادی ہے۔ ؎۲۴۶

مولانا شاہ عبدالحق محدث دہلوی ؎۲۴۷ نے "تاریخ حقی" میں علاء الدین خلجی کی نسبت جو رائے قائم کی ہے اس کو وقائع راجستھان سے نقل کرتا ہوں

؎۲۴۵ یوپی ہسٹاریکل سوسائٹی جورنل سنہ ۱۹۱۹ء۔ ؎۲۴۶ ماہنامہ الفرقان، صفحہ ۱۶۴، شعبان سنہ ۱۳۶۰ھ۔ ؎۲۴۷ وفات ۱۰۵۲ھ = ۱۶۴۲ء مدفن دہلی۔

بادشاہے جبار و قہار و کج رفتار و سخت گیر و زشت خوے بود"[۲۴۸]
اور شاہ صاحب کی شانِ جلالت و عظمت کے بارہ میں خود جہانگیر
شہادت دیتا ہے " مدت ہاست کہ در گوشۂ دہلی بہ وضعِ توکل و تجرید بسر
مجا بَرَد ۔ مرد گرامی ست ۔ صحبتش بے ذوقی نیست ۔ بہ انواعِ مراحم
دلنوازی کردہ رخصت فرمودم ۔"[۲۴۹]

صفحہ ۶۲ ۔ نوٹ ۳۴ ۔

"اکبر کے سامنے ایک پراچین پترا پیش ہوا کہ الہ آباد میں کمندرا
برہم چاری رحیں نے اپنا سارا بدن کاٹ کاٹ کر ہَون کر دیا تھا) اپنے
چیلوں کے لئے ایک اشلوک لکھ کر رکھ گیا تھا کہ ہم عنقریب ایک
با اقبال بادشاہ ہو کر آئیں گے ۔ اُس وقت تم بھی حاضر ہونا ۔ بہت
سے برہمن بھی اُس پترے کے ساتھ حاضر ہوئے اور عرض کی کہ جب
سے آج تک مہاراج پر دھیان گیان جمائے بیٹھے ہیں حساب کیا
تو معلوم ہوا کہ اُس کے مرنے اور اکبر کے پیدا ہونے میں صرف تین چار
مہینے کا فرق تھا ۔"[۲۵۰]

---

۲۴۸ وقائع جلد دوم صفحہ ۹۵ ۔ ۲۴۹ تو زک صفحہ ۲۸۴
۲۵۰ دربارِ اکبری صفحہ ۸۸ ۔ بدایونی جلد دوم صفحہ ۳۳۶ ۔

"ملندا بہ ہم چاری سے اوتار" اور "مہابلی مہاراج" وغیرہ تعریفات وخوشامد کی بنیاد یہ بھی ہے۔ شمس العلما آزاد دہلوی نے اسکو کئی جگہ تفصیل وصراحت کے ساتھ لکھا ہے۔ [۲۵۱]

صفحہ ۶۱ نوٹ ۳۴۔

ٹاڈ کا راجستھان، صفحہ ۳۳۴، جلد اول انگریزی میں جگت گورو کا ترجمہ THE GUARDIAN OF MANKIND کیا ہے۔ [۲۵۲]

مسلمان خوشامدیوں اور تملق[۲۵۳] پیشہ لوگوں کی ایک نظیر پیشتر لکھ چکا ہوں دوسری اب نقل کرتا ہوں۔ پہلے بزرگ مشائخ اور اہل اللہ کے زمرہ میں شمار ہوتے تھے۔ یہ دوسرے صاحب صاحب علم اور اہل قلم ہیں۔

قاضی حاجی ابراہیم سرہندی (متوفی ۹۹۴ھ = ۱۵۸۶ء) اکبر کے صدر الصدور اور مقرب خاص تھے۔ ۹۸۹ھ = ۱۵۸۱ء میں گجرات کی طرف قاضی بنا کر بھیج دئے گئے۔ مولف کتاب سیراب الصدر (؟) کا بیان ہے کہ وہاں انھوں نے لوگوں کا مال خوب جبر وستم سے لیا اور

---

[۲۵۱] قصص ہند حصہ دوم، لاہور ۱۹۲۹ء، صفحہ ۹۵۔ [۲۵۲] مطبوعہ ۱۹۲۰ء نیز صفحہ ۲۶۷۔ [۲۵۳] چاپلوسی کرنا۔

وہیں سے دکن چل دینے کا ارادہ کیا تاکہ دکن میں بھی فتنہ و فساد برپا کریں۔ انکے ظلم، بغاوت اور فساد کی خبریں مسامع بادشاہی تک پہنچیں تو گجرات سے مستقر الخلافہ کو طلب ہو کر آئے۔ ان کا معاملہ تحقیق حال اور تفتیش واقعات کے لئے حکیم عین الملک کے سپرد کیا گیا۔ تو آپ نے جھوٹ کا ایک پوٹ تیار کر دیا۔ جس میں جھوٹی باتیں اور موضوع حدیثیں بھری تھیں۔ یہ بھی لکھا تھا کہ صاحب الزمان یعنی مہدی میں وہ صفات ہوں گی جو اس رسالہ میں مرقوم ہیں اور یہ صفات سلطان اکبر میں موجود ہیں اور پائی جاتی ہیں۔ بادشاہ یہ دیکھ کر خوش ہو گیا۔ پھر اُن کا اعزاز اور تقرب اور بھی بڑھا دیا۔ اب تو حاجی صاحب شاہ فتح اللہ[۲۵۴]، شیخ ابو الفضل و حکیم ابو الفتح کا مقابلہ کرنے لگے۔ اُن سے بحث کرتے۔ یہ لوگ بڑے دربار رس اور درخور والے تھے۔ بادشاہ تک ان کی برائیاں اور خرابیاں پہنچائیں اور گوش زد کرائی گئیں۔

---

۲۵۴ عضد الدولہ شاہ فتح اللہ پسر شکر اللہ کاشانی شیرازی، اکبر کے معتمد امیر اور عالم و فاضل درباری تھے۔ فقہ و تفسیر میں متعدد یادگاریں چھوڑی ہیں۔ شوال ۹۹۷ھ (اگست ۱۵۸۹ء) میں سری نگر دار الملک کشمیر میں انتقال کیا۔ لاہور مدفن ہے۔ اکبر کو ان کی موت کا بڑا صدمہ ہوا۔ شیخ فیضی نے غم کے آنسو بہاتے ہوئے ان کے مرثیہ میں ترکیب بند لکھا۔ پہلا شعر یہ ہے

دگر ہنگام آں آمد کہ عالم از نظام افتد جہاں عقل را در نیمروز ظلم شام افتد

(از تاریخ فرشتہ، مقالہ دوم، صفحہ ۲۶۷)

قلعۂ رنتھنبور کو بھیج دئے گئے اور وہیں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مر گئے یا مار ڈالے گئے۔ شیخ عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں ان کے حالات لکھے ہیں۔ تاریخ الفی کی ترتیب و تیاری میں کچھ دن شریک و معاون رہے تھے۔[255]

مولانا آزاد دہلوی لکھتے ہیں کہ قاضی نظام بدخشی بڑا فاضل صاحب تصنیف، قاضی خاں خطاب، سجدۂ زمیں بوس کا مصنف تھا۔ ملا قائم کابلی اس پر افسوس کیا کرتا تھا کہ ہائے یہ نکتہ مجھے پہلے نہ سوجھا۔[256]

صفحہ ۴۶ نوٹ ۳۵۔

ہیمو ایک غریب خاندان کا ذات کا دھوسٹر بنیا تھا۔ سلیم شاہ سوری نے اس کو بازاروں کا داروغہ بنایا تھا۔ محمد شاہ عادل نے رتبہ وزارت پر پہنچایا۔[257] نظم و نسق مملکت کا مختار مطلق کر دیا۔ پانی پت کی فیصلہ کن لڑائی میں ہیمو کو شکست ہوئی۔ بیرم خاں اس کو گرفتار کر کے اکبر بادشاہ کے سامنے لایا۔ عرض کیا کہ اس کا سر اپنے ہی ہاتھ سے اڑا دیجئے۔ بادشاہ نو عمر پندرہ برس

---

[255] معجم المصنفین، جز رابع، صفحہ ۵۱۲ [256] قصص ہند، حصہ دوم، صفحہ ۹۸۔ [257] فرشتہ، جلد اول، صفحہ ۲۲۴

کانفا۔ بیرم خاں کے کہنے سے ہیمو کا سر اپنی تلوار سے چھو دیا۔ [258] یہ محرم ۹۶۴ھ یعنی نومبر ۱۵۵۶ء کی بات ہے۔ [259]

ہیمو کے قتل کے متعلق حاجی محمد عارف قندھاری نے اپنی تاریخ موسوم بہ "منتخب" میں لکھا ہے کہ "حضرت خاقانِ اکبر (اکبر) اول شمشیر باو رسانیدہ ملقب بہ غازی شدند و اندک رمقے ماندہ بود کہ خان خانانِ اعظم اعنی بیرم خاں نیز شمشیرے زدہ اورا بباد البوار فرستاد۔ [260]

ملا قاسم ہندو شاہ ان الفاظ میں توثیق کرتا ہے۔ "آں حضرت سیر شمشیر بفرق او رسانیدہ ملقب بہ غازی گردید۔ [261] زیادہ تفصیل یہ ہے۔ بیرم خاں التماس نمود کہ بادشاہ بقصد غزا اگر شمشیرے بریں کافر حربی رساند جہادِ اکبر خواہد شد۔ آنحضرت سر شمشیر بفرق او رسانید ملقب بہ غازی گردید۔ آنگاہ بیرم خاں بدستِ خود گردنش زدہ

---

[258] ایشری پرشاد کی تاریخ عہد مسلمانان، صفحہ ۳۱۲۔ ایلیٹ ڈوسن کی تاریخ جلد پنجم صفحات ۶۵ و ۶۶ و خود نوٹ نمبر۱۔ نیز فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۴۶۔ [259] بیل کی ڈکشنری، صفحہ ۱۰۷۔ [260] منتخب صفحات ۸۰ و ۸۱۔ [261] تاریخ فرشتہ، جلد اول، صفحہ ۲۴۶

٭ ٭ ٭

سرش را بکابل و جسدش را بدہلی فرستاد۔

ہیمو کی مردانگی و دلاوری کا اعتراف فرشتہ بھی کرتا ہے :۔

ہیموے بقال کہ کافرے شجاع بود۔ ۔ ۔۔ در دہلی خود را راجہ بکرما جیت خواندہ۔ [۲۶۲]

شیخ مرتضیٰ حسین المخاطب بہ اللہ یار عثمانی حدیقۃ الاقالیم میں لکھتے ہیں کہ سلطان محمد عادل سوری (عدلی) نے ہیموں کو بکرما جیت کا لقب دیا تھا۔ [۲۶۳]

صفحہ ۶۵ ۔مقالہ ۳۶ ۔ نوروز

اہل لغت لکھتے ہیں کہ نوروز ایرانیوں کے سال کا پہلا دن، یعنی فروردین مہینہ کا پہلا دن ہوتا ہے۔ جب آفتاب برج حمل کے پہلے نقطہ میں پہنچتا ہے۔ اسی مہینہ سے اہل فارس کا سال شروع ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اس کا زمانہ تقریباً بیساکھ سمجھا جاتا ہے۔ [۲۶۴]

فارسی شعرا نے نوروز پر طرح طرح کے رنگین قصائد لکھے [۲۶۵] اور اپنے کمال اور جودتِ طبع کی یادگار چھوڑے ہیں۔ ایک مطلع سن لیجئے

---

[۲۶۲] ایضاً، صفحہ ۲۴۵۔ [۲۶۳] صفحہ ۷۹۔ [۲۶۴] برہان ہار رشیدی۔ سروری۔ غیاث۔ مدار۔ [۲۶۵] صفحہ ۶۴، عدد ۶۸، اورینٹل کالج میگزین۔

آمدہ نوروز ماہ باگل سوری بہم
بادۂ سوری بگیر بہ گلِ سوری بجم[۲۶۶]

شیخ الشعرا حضرت سعدی فرماتے ہیں:-

علمِ دولت نوروز بہ صحرا برخاست
لشکر زحمتِ سرما ز سرِ ما برخاست

ظہیر الدین محمد بابر بھی اسکو یاد کرتا ہے:-

نوروز و نو بہار و مئے دلبراں خوش است
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

نوروز دنیا کا سب سے پرانا اور کم و بیش تمام اقوام و ممالک میں آج اور اہم تہوار منانا جاتا ہے۔ ایرانیوں اور ان کے ہمسایہ مغلوں اور تاتاریوں وغیرہ میں اس کا بڑا دور دورہ تھا۔ وہ اس کو اس شان اور آن بان سے مناتے تھے کہ اقوامِ عالم کی کوئی اور قوم ان کی برابری نہیں

---

۲۶۶ سوری۔ سین پر پیش اور واؤ معروف۔ کئی معنی ہیں۔ ایک پھول کا نام ہے جو سرخ رنگ ہوتا ہے۔ بلکہ ہر پھول اور رنگ کو جو سرخ رنگ ہو سوری کہتے ہیں۔ سور کے لفظی معنی سرخ کے ہوتے ہیں۔ نیز جشن شادی عروسی وغیرہ کچھ ایسے معنی بھی ہیں جو عربی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ایک قسم کا پیکان (تیر) بھی سوری کہلاتا ہے۔ از جہانگیری، رشیدی، منتخب ۲۶۷ صفحہ ۲۰۷، مذکور ۲۶۸ تذکرہ حسینی صفحہ ۴۴۳۔

کرسکتی تھی۔ آج کل بھی ایران میں سب سے بڑا قومی تیوہار نوروز ہی پایا جاتا اور تیرہ دن منایا جاتا ہے۔ اس کے بانی کے متعلق روایات کا اختلاف ہے۔ اکثر مورخ اس کا بانی جمشید کو لکھتے ہیں جو حقیقۃً ایک داستانی یا افسانوی شخص بتایا جاتا ہے۔ نوروز کی ابتدا اور دستورات کے متعلق مستقل کتابیں بھی موجود ہیں۔ ان میں اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال کی عالمانہ تلاش و تحقیق سے ہم کو بہت سے حوالے اور تذکرے ملے ہیں۔ ایک معتبر کتاب "نوروز نامہ" کا پتہ چلا ہے جو یقیناً فارسی کی قدیم ترین کتابوں میں سے ہے۔ فردوسی نے شاہنامہ میں بھی نوروز کے بارہ میں جا بجا لکھا ہے۔ البیرونی نے آثار الباقیہ میں اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ جرمن فاضل پروفیسر مارکوارٹ کا مقالہ نہایت لائق قدر اور قابل استفادہ ہے۔ فرانسیسی مورخین اور انشا پردازوں نے بھی خامہ فرسائی کی ہے جو لائق تحسین ہے۔

عرب کا نامور شاعر مہیار دیلمی ؎۲۷ اپنی زبان میں نیز ایران مجم کے

---

۲۶۹ صفحات ۲۱۷ و ۲۱۸۔ ؎۲۷ ہجرت کی چوتھی صدی کے آغاز اور پانچویں صدی کے شروع میں گزرا ہے۔ مورخین اس نامور شاعر و کاتب کا سال وفات ۴۲۸ ہجری قرار پایا ہے۔ پہلے مجوسی تھا۔ محمد شریف رضی بن حسین بغدادی کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوا تھا۔ ابوالحسین مہیار بن مرزویہ فارسی کے نام سے تذکروں میں یاد کیا گیا ہے۔ مہیار کا دیوان پوری صحت اور اہتمام کے ساتھ بیروت میں چھپا ہے۔

بہت سے قادرالکلام باکمال سخنور، فرخی، عنصری، منوچہری وغیرہ فارسی میں نوروز کے متعلق نئے نئے مضمون اپنے مدحیہ قصائد میں لکھ گئے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ساسانیوں کا محبوب سرکاری مذہب زرتشتی ہو گیا تھا۔ زرتشتی مذہب والے اپنے عقائد کے مطابق اس دن کو پرستش کرتے تھے اور ان ایام میں دخموں یعنی بُرجِ خموشاں اموات پر کھانا یا کھیتوں پر مُردوں کی روحوں کے لئے پرتکلف کھانوں کے خوان کھلا دیتے تھے۔

اس لئے ان کے زمانہ میں عید نوروز کی حیثیت ایک درباری جشن یا ملکی تقریب سے زیادہ مذہبی شان و عظمت رکھتی تھی اور وہ بڑے پیمانہ پر نہایت تزک و احتشام سے منایا جاتا تھا۔ عباسی خلفاء نے جب ایران کے تخت اور ان کے قلمرو پر قبضہ پایا تو ساسانیوں کے جملہ مراسم و روایات کو قائم رکھا۔ اسی ذیل میں نوروز کا جشن بھی برقرار رہا۔ زرتشتی دین میں زراعت و کاشتکاری و فلاحی کو ایک فریضۂ مذہبی قرار دیا گیا ہے۔ وہاں کاشتکاری کا کاروبار نوروز ہی سے شروع ہوتا تھا۔ یہ قدرت کے بہترین عطیہ یعنی موسم بہار کی آمد کی خوشی میں منایا جاتا تھا۔ اور اہل ایران کے سال شمسی کے آغاز سے وابستہ تھا۔ اس جشن کا

ماہ مارچ میں مقرر تھا۔ جب رات اور دن موقع اعتدال پر پہنچتے ہیں
تقویم اسلامی کے رُو سے اُسکی تاریخ ایک ہزار برس سے ۲۱ مارچ چلی
آتی ہے۔ صدیوں تک یعنی جلال الدین ملک شاہ سلجوقی کے عہد تک
نوروز کا زمانہ برابر بدلتا رہا ہے۔ اس نے اصفہان میں رصد گاہ بنوائی
تقویم ایرانی کی تجدید کی۔ تقویم جلالی ایجاد و مرتب کی، جو زیج
ملک شاہی بھی کہلاتی ہے اور جس کے حالات ڈاکٹر ہائیڈ HYDE
نے بہ تفصیل لکھے ہیں، تو ہمیشہ کے لئے ۲۱ مارچ معین کر دی گئی ۳۶۴ھ
(۹۷۵ء) میں خلیفہ وقت[۲۷۲] نے جشن نوروز کا منایا جانا ممنوع
قرار دیا لیکن لوگ باز نہ آئے تھے کہ چودھویں صدی مسیحی کے
آخر میں سلطان برقوق نے اس کا کلیتہً خاتمہ کر دیا۔ اوپر لکھ چکا ہوں
کہ پرانے لغت نویس نوروز کو ماہ فروردین کا پہلا دن لکھتے تھے
کہ جب آفتاب برج حمل سے نقطہ اول پر پہنچتا ہے۔ اور چھ دن
یعنی پہلی سے چھٹی تک منایا جاتا ہے۔ ہمارے ہندوستانی حساب سے
اس کا وقت بسنت کے قریب ہوتا ہے جو بہار کا آغاز سمجھا جاتا ہے۔[۲۷۳]

---

۲۷۱ جلوس ۴۶۵ھ مطابق دسمبر ۱۰۷۲ء۔ وفات شوال ۴۸۵ھ نومبر ۱۰۹۲ء
۲۷۲ الطائع للہ ابوبکر ۲۰ ذی القعدہ ۳۶۳ھ جولائی ۹۷۴ء میں مسند آرائے خلافت ہوا تھا۔ ۲۷۳ مثنوی میر عبدالجلیل بلگرامی صفحہ ۱۴۔ حاشیہ دوم مطبوعہ نول کشور ۱۲۹۹ھ

مگر مقبول ہیچ مداں تحقیق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ خود حکمائے ہند نے فردوسِ عالم یعنی اپنے ملک کے لئے کون سا موسم، موسمِ بہار تجویز کیا تھا؟ اور کن رعایتوں سے؟ البتہ اپنی خیرہ سری و شوریدہ خیالی کی بدولت اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ میرے لئے تو بہار کی فصل آغاز گرما ہے۔ زمستان اور برشکال دونوں کا لطف اٹھانے سے محروم رہتا ہوں۔ شاید فرانسیسیوں کے اس پرانے گیت (BALLAD) میں میرے ہی جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے اور صحیح کی گئی ہے۔ جس کو طبّاع انگریزوں نے اس طرح اپنا لیا ہے:-

GENTLE SPRING! IN SUN SHINE CLAD,

WELL DOST THOU THY POWER DISPLAY!

FOR WINTER MAKETH THE LIGHT HEART SAD;

AND THOU—THOU MAKEST THE SAD HEART GAY.

اطبّا و دانایانِ فرنگ کے تجربے اور اس فیصلے سے مجھے آگاہی ہے کہ ہندوستان میں بہار کا موسم یا ربیع کی فصل سردیوں کے بعد ہی شروع اور گرمیوں سے پہلے ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی خوش گواریاں فروری مارچ، اپریل تک قائم رہتی ہیں۔ بعض خطوات وحصص ملک میں اس کی دلفریبیوں اور لطیف نظاروں کا زمانہ وسط فروری سے وسط مئی تک

مانا جاتا ہے۔ اس موسم میں نہ زیادہ سردی ہوتی ہے۔ نہ زیادہ گرمی۔ باز آور درخت شگوفوں اور غنچوں سے لد جاتے ہیں۔ پھول نئے پھلنے ہیں۔ ہر چیز پہ بہار ہی بہار چھا جاتی ہے۔ موسم بہار کا مزاج گرم و تر ثابت ہوا ہے۔ اس میں ہضم و جذب کی استعداد بھی زیادہ ہوتی ہے۔ باز آمد۔ ولایات عجم میں بہار کی ابتدا اسی مہینہ (بیساکھ) سے ہوتی ہے۔ اس اختلاف کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایران میں موسم سرما بہت طویل اور شدید ہوتا ہے۔ بمبئی اور اس کے اطراف کی تینوں پارسی جماعتیں نوروز مناتی ہیں مگر کسی بڑے پیمانہ و طریقہ پہ بڑے اہتمام سے نہیں کرتیں۔ ترکستان (طرفان)، ایران، مصر میں بھی یہ رسم دیکھی جاتی ہے اور تقریباً وہی تمام باتیں وہاں بھی رائج ہیں جو ہمارے ہندوستان میں ہولی کے موقع اور تہوار پر منائی جاتی ہیں۔ اچھے لباس پہننا، گانا بجانا، رنگ پاشی، معانقہ، پانی پھینکنا، پچکاریاں چلانا، چہروں پر آٹا اور چونا مل کر گدھوں پہ سوار کرانا، بازاروں میں سرگشت، ٹھٹھے مذاق اور جہالت کی جتنی حرکتیں ہوتی ہیں سب ہی رائج و جائز ہیں۔ اور وہاں کا جواز بھی اور ملکوں کے رواج کی طرح قانون کا اثر اور حیثیت رکھتا ہے۔

مغلوں[1] کے دور میں اکبر نے نوروز کو ایک باقاعدہ تہوار قرار دیا۔

---

[1] منقول، صفحات ۱۰۰، ۱۰۱، اورینٹل کالج میگزین، نمبر ۱۱، بابت اگست سنہ ۱۹۳۲ء

ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں توضیح کی ہے، چونکہ بادشاہ سلامت آفتاب کی پرستش کے قائل تھے لہٰذا انھوں نے نوروز جلالی کو ایک مقدس تہوار تسلیم کیا۔ بدایونی نے بھی اس کی تصدیق کی ہے اور لکھا ہے کہ نوروز مسلسل اُنیس روز تک منایا جاتا تھا۔ یعنی یکم فروردین سے ۱۹ فروردین تک۔ انیسواں دن "روزِ شرف" کہلاتا تھا اور سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ آگرہ کے بازاروں میں آئین بندی ہوتی تھی۔ اور محلّات شاہی، دیوانِ عام اور دیوانِ خاص کو سجایا جاتا تھا۔ قیمتی پردے آویزاں کیے جاتے تھے۔ بیش بہا قالین بچھائے جاتے تھے اور دربار عام ہوتا تھا۔ سنہ ۹۹۴ھ[۲۷۵] میں جشنِ نوروز کی کیفیت کو بدایونی نے بالفاظ ذیل لکھا ہے:۔

"و پانزدہم شہر صفر این سال (سنہ ۹۹۴ھ) تحویل نوروز شروع در سال بست و ششم از جلوس روی دادہ آئین بندی ہر دو دیوان خانۂ خاص و عام بانواع قماش ہائے لطیف فرمودہ اشیائے قیمتی گوناگوں ترتیب نمودہ و پردہ ہائے فرنگی و تصویر ہائے بے نظیر گرفتند و سراپردہ ہائے اعلیٰ افراشتند و بازار آگرہ و فتحپور را نیز بایں دستور آراستہ تا ہژدہ روز و شب جشنِ عالی داشتند و انعام طوائف

۲۷۵ مطابق ۱۵۸۶ء

اہلِ نغمہ و سازِ ہندی و فارسی و ارباب طرب از مرد و زن ہزاران ہزار طلبیدہ ہر روز در ایوانِ یکے از اُمراے نامدار آمدہ و صحبت داشتہ پیشکش معتبر و اسباب مہمانی از و گرفتند۔ ۲۷۶

شاہانِ مغلیہ اپنے سالِ جلوس کی ابتدا نوروز کے دن سے شمار کرتے تھے۔ جہانگیر اپنی توزک میں ہر نئے سال کے واقعات کو جشن نوروز کی کیفیت سے شروع کرتا ہے۔ اس کے عہد میں نوروز بالکل اسی طرح منایا جاتا تھا جس طرح کہ اکبر کے زمانے میں یعنی جشن کا زمانہ یکم فروردین سے ۱۹ فروردین تک ہوتا تھا۔ پہلے دن بادشاہ زمردیں لباس پہن کر تحویل آفتاب کے وقت دربارِ عام کرتا تھا۔ اور امرا تحفے اور نذرانے پیش کرتے تھے۔ اُنیس دن تک ہر روز امرا میں سے ایک بادشاہ کی دعوت بڑی دھوم دھام سے کرتا تھا اور بیش قیمت اشیا بطور پیشکش بادشاہ کے حضور میں پیش کرتا تھا۔ ان اشیا میں عموماً ہاتھی، جواہرات، قیمتی کپڑے، خوشبوئیں، چینی کے برتن اور دوسری نادر چیزیں ہوتی تھیں۔ بادشاہ بھی اُمرا کی ضیافتیں

---

۲۷۶ صفحہ ۲۳۰ - از طبع نول کشور۔ ۲۷۷ گھوم جانا، پھر جانا۔ پھرا دینا، گھومانا۔ لازم اور متعدی دونوں طرح آتا ہے۔ اور سپرد کرنے اور حوالہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں داخل ہونے سے مراد ہے۔

کرتا تھا اور انعام و اکرام دیتا تھا۔ منصبوں میں ترقیاں دی جاتی تھیں خطاب ملتے تھے۔ اور اعلیٰ عہدے تقسیم کیے جاتے تھے۔ شاہی محلات اور بازار سجائے جاتے تھے۔ ان سب باتوں کی تفصیل توزک جہانگیری اور بادشاہ نامۂ ملّا عبدالحمید لاہوری میں مسطور ہے۔ اکبر کے بعد جہانگیر نے وہی اہتمام اور طمطراق قائم رکھا جس کی بنیاد باپ نے ڈالی تھی۔ اس کی صراحت و تفصیل بقدر ضرورت اوپر ہو چکی۔ شاہ جہاں نے اس رسم کو بالکل اٹھا دینا چاہا۔ یہ تو نہ کر سکا۔ تاہم نوروز کے جشن میں بہت سی اصلاح اور ہر نوع سے کمی ہو گئی۔ پہلا سا تجمّل اور کرّ و فر باقی نہ رہا۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ ہوتا رہا۔ اورنگ زیب عالمگیر نے جشنِ نوروز کی تقریب کو قطعاً ممنوع قرار دیا۔ اس کے بڑے بیٹے محمد معظم نے شاہزادگی کے زمانہ میں ایک سال اس کو منانا شروع کیا تھا۔ بیدار دل ہمہ آگاہ بادشاہ کو خبر پہنچی۔ فرزند سعادت توام کو بزرگانہ ملامت و سرزنش فرمائی۔ رقعاتِ عالمگیری (رقعہ ۴) میں ۲۷۸ مرقوم ہے۔ "امسال نوروز سے بطورِ اہل ایران بہ تکلف کردہ اند۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چوں ایں روز از اعیادِ مجوس ست و بہ اعتقادِ ہنود روزِ جلوس بکرماجیت و مبدارِ تاریخ سمن بعد

---

۲۷۸ صفحہ ۳، مطبعہ نول کشور، ۱۹۱۱ء۔

بہ عمل نیاید و چنیں جہالت بہ فعل مگراید"۔ اس کے عہد سے یہ جشن قطعاً غیر مشروع و منسوخ قرار پا گیا۔ عالمگیر نامہ میں منشی محمد کاظم نے اس کے متعلق شاہی احکام و ہدایات کو نقل کیا ہے۔[۲۷۹] تاہم عوام و خواص کم و بیش مناتے ہی رہے۔ شعرا بھی دل کے ولولے نکال لیتے تھے۔ میر عبدالجلیل بلگرامی نے جو اس متشرع و دیندار حکمراں کے اخیر عہد تک ایک ممتاز اہل علم و سخن سنج گزرے ہیں چار زبانوں میں یہ رباعی بصنعت متزاد لکھی تھی۔ جو مقبول اہل کمال ہو کر زبانزد عوام ہو گئی۔

جَاءَ النَّیرُوزُ بِالنَّشَاطِ الاَوْفی فِی خَیرِ قُدُومٖ
پیہو بین ڈرم پھل لہلہی بن او لہا تر ور رہی جھوم
نیکی کند و زکلدی بزی بولدی لیش قتلغ بو سوم
چوں شہپر طاؤس گل اندر صحرا آورد ہجوم

ترجمہ۔ نئے سال کا دن بڑی خوشی کے ساتھ آیا۔ نیک آنے کے ساتھ شاخیں پھولوں سے لد گئیں جنگل لہلہانے لگا۔ درخت اپنا سر ہلانے لگے سال نو کا دن آیا بیابان سر سبز ہو گیا۔ مبارک ثابت ہوا۔ مور کی پھیلی ہوئی دم کی طرح جیسے جنگل میں پھول اگ آئے ہو گئے ہیں[۲۸۰]

---

[۲۷۹] مطبوعہ کلکتہ کالج پریس، ۱۸۶۸ء صفحہ ۳۸۹۔ [۲۸۰] حیات جلیل حصہ دوم۔ صفحات ۳۷ و ۳۸، نوٹ نمبر ۲۔ مولفہ مقبول۔

نامور ڈچ مورخ ڈی لیٹ (JOANNES DE LAET) اپنی تاریخ ہندوستان یا "اوراقِ پریشاں" بزبان لاطینی مطبوعہ انٹی ورپ سال ۱۶۳۱ء میں لکھتا ہے[۲۸] دو سالانہ تیوہار تھے جن کو دربار شاہی بڑے تزک و احتشام سے مناتا تھا۔ ایک سال کا نیا دن دوسرا شہنشاہ کی سالگرہ (ولادت) کا۔ پہلا سال کے شروع ہونے کے پہلے ہلال (نئے چاند) کو دیکھ کر منایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں سال کا آغاز مارچ میں ہونا پایا جاتا ہے یہ تیوہار نوروز یا نوروز کہلاتا ہے۔ اہل ایران کی تقلید ہے۔ اس لفظ کے معنی تو ہیں "نو دن" مگر یہ تیوہار اٹھارہ دن رہتا ہے" اس کے بعد نوٹ نمبر ۳ میں لکھا ہے کہ "نوروز ایسا تیوہار تھا جو خوب منایا جاتا تھا اور لطف و انبساط سے ہوتا تھا۔ اسکو اکبر نے ایران سے لیا تھا۔ اورنگ زیب نے اٹھا دیا۔ لیکن اسکے جانشینوں نے پھر تازہ کیا۔ کتنے دن تک منایا جاتا تھا۔ ان کا شمار ہمیشہ ایک ہی نہیں رہتا تھا۔ جہانگیر انیسواں دن انتہائی اہتمام و احتشام سے مناتا تھا۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو تزک جہانگیری جلد اول، صفحات ۴۷ تا ۴۹۔ ومنرک جرنل پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی جلد اول، صفحات ۹۲ لغایتہ ۹۴"

---

[۲۸] صفحہ ۹۹، مطبوعہ ۱۹۲۸ء۔ ترجمہ انگریزی۔

اس بحث پر قلم رد کرنے سے پہلے مجھے یہ گزارش کرنا ہے کہ نوروز پر دو نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات عالمانہ و محققانہ یادداشتیں جو ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کے قلم سے اورنٹیل کالج میگزین میں نکل چکی ہیں، قابل ملاحظہ ہیں۔ (۱) نمبر ۶۲، اگست ۱۹۴۰ء صفحات ۳ تا ۱۹۔ (۲) نمبر ۶۴ فروری ۱۹۴۱ء صفحات ۶۲ تا ۷۰۔ ان میں پرانے ایرانی، پہلوی، لاطینی، یونانی و عربی مورخین کی تحقیقات اور حال کے مستشرقین کی تحریرات، روسی نیز سنسکرت وغیرہ کتابوں کے حوالوں سے موجود ہیں۔ پروفیسر مارکوآرٹ المانی کا مقالہ جو زبان جرمن "مودی میموریل" والیوم یعنی مجموعۂ مضامین بہ یادگار شمس العلما جمشید جی جیون جی مودی میں شائع ہوا ہے۔ اور موسیو انیوس ترانت زیف کا مضمون جو روسی زبان میں انکی کتاب موسوم بہ "مطالعات ساسانی"[282] میں چھپا ہے اور جس کا فارسی اور انگریزی ترجمہ مازندی کے "ارمغان نوروز" کے نام سے[283] شہرت رکھتا ہے۔ روزنامہ "کاوہ" اپریل ۱۹۲۱ء مشمولہ مودی میموریل والیوم، طبع بمبئی صفحات ۷۶۵ تا ۷۰۸ اور احیائے اسلام یعنی RENAISSANCE OF ISLAM جرمنی مولفہ ایڈم میٹس بھی توسیع معلومات کے لئے نہایت

---

[282] طبع سینٹ پیٹرزبرگ، ۱۹۰۹ء صفحہ ۸۲ [283] تتمہ، مجلۂ ایران لیگ، بمبئی۔

نفع بخش اور مفید ہیں۔ تاریخ ساسانیاں مولفہ پروفیسر کرسٹن سن
L'IRAN SONS LES SASSANIDES BY ARTHER —
CHRISTENSON. بھی قابل ذکر ہے۔[۲۸۴]

نوروز تو اس درجہ پابندی و انضباط اوقات کے ساتھ ہمیشہ ہوتا اور منایا جاتا تھا۔ مگر مینا بازار (صفحات ۵۔ تا ۸، کتاب ہذا) کی نسبت فرانسیسی سیاح ڈاکٹر برنیر DR. BERNIER اپنے وقائع سیر و سیاحت کے ذیل میں لکھتا ہے کہ یہ مینا بازار جس کی شہنشاہ اور حرم سلطانی کی خواتین، اُمرا کی بی بیاں، عالی خاندانوں کی عورتوں سے[۲۸۵] جو دکان رکھتی تھیں، معاملت و گفتگو کرتی تھیں، کبھی کبھی چھوڑ دیا جاتا ہے۔

گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ میں مرزا ہندال کی شادی کا اہتمام اور پورا احتشام تحریر کیا ہے۔ ایک فقرہ یہ بھی ہے کہ "بازار زنانہ نیز کردہ بودند"۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ اکبر کے مینا بازار کی یہی بنیاد ہے۔[۲۸۶]

---

[۲۸۴] یہ کتاب ۱۹۳۶ء میں کوپن ہاگن میں شائع ہوئی۔ پروفیسر اقبال نے "ایران درعہد ساسان" کے نام سے اس کا ترجمہ اصلی فرانسیسی سے اردو میں کر دیا ہے۔

[۲۸۵] صفحہ ۲۷۲۔ ترجمہ کرنیل ہنری مور COLONEL HENRY MOORE نیز ترجمہ اردو از خلیفہ سید محمد حسین، طبع دوم، ۱۳۲۱ھ مفید عام آگرہ۔

[۲۸۶] مقالات شبلی، صفحہ ۱۴۹۔

ملا ظہیرائے تفرشی نے شبنم شاداب میں لکھا ہے کہ جشنِ نوروز ایام جاہلیت کی رسم ہے۔ اہل اسلام کو نہ کرنا چاہئے۔ حضرت علی مرتضیٰؓ نے فرمایا ہے کہ نیروز نا کل یوم ومہرجو ننا کل یوم۔ فافہم۔[۲۸۷]

صفحہ ۶۵ نوٹ ۳۷۔

بوندی سے شادی بیاہ نہ ہونا۔ ٹاڈ صاحب اس انتشار کے اسباب عجیب وغریب بتاتے ہیں مگر ایک باضابطہ صلحنامہ میں مندرج ومحفوظ ہیں جو شہنشاہ کے ساتھ ہوا تھا۔ اور جس کی نقل ٹاڈ صاحب کے راجستھان "متعلق حالات بوندی" میں داخل وشامل ہے۔[۲۸۸]

مولوی نجم الغنی خاں لکھتے ہیں کہ ایک عہدنامہ مابین راؤ سُرجن پسر ارجن اور بہادر شاہ ۹۴۱ھ مطابق ۱۵۳۴ء اور اکبر کے بہ توسط رئیس انبیر ہوا تھا اسکی شرطوں سے ہنود کے خیالات اور منشا کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ اس صلحنامہ میں منجملہ دیگر شرائط کے یہ بھی مندرج تھا۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ بوندی کے رئیس بادشاہی حرم میں ڈولہ بھیجنے کی رسم سے کہ راجپوتوں کی ذلت کا باعث ہے مستثنیٰ

---

۲۸۷ صفحہ ۵۱، طبع سوم، نول کشور، ۱۸۸۶ء۔ ۲۸۸ صفحہ ۹۰، ۴۳، نوٹ ۲۔ صفحہ ۱۴۱۶۔

ترجمہ اُنوَق، راجستھان۔ دکورٹ جرنل آف بوندی۔ حوالہ صفحہ ۴۸۱۔

رہیں ! ... ... (۴) سردارانِ بوندی اپنی زوجگان و مستورات رشتہ داروں کو نوروز کے تہوار پر مینا بازار میں بھیجنے سے معاف رکھے جائیں۔ نمبر ۲۸۹

خان صاحب کو اِس مصالحت کے صحیح ماننے میں تامّل ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس ذلت آمیز معاہدے کا کچھ بھی وجود ہوتا تو فارسی کے مورخ جنھوں نے کوئی جزوی واقعہ بھی نہیں چھوڑا ضرور اس کا ذکر کرتے۔ یہ تمام باتیں کیبشروں کا تخیل اور انھیں کی طبع زاد ہیں اور تاریخی حقیقت کے خلاف نمبر ۲۹۰ مینا بازار یا زنانہ بازار کا تو اُس وقت شان و گمان بھی نہ تھا۔ وہ تو ۹۹۱ھ مطابق ۱۵۸۳ء سے مقرر ہوا تھا اور اُس وقت رائے مذکور راج سے دست بردار ہو چکا تھا۔ ۲۹۱ مینا بازار کے وجود سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اس کی عمارت قلعۂ آگرہ میں اب بھی موجود اور موتی مسجد کے گوشۂ جنوب و مغرب میں واقع ہے۔ مولانا سعید احمد مارہروی لکھتے ہیں کہ "یہاں زنانہ بازار لگا کرتا تھا۔ دوکانوں پر تمام عورتیں ہی عورتیں نظر آتی تھیں۔ اُمرا و شُرفا کی بی بیوں کو عام اجازت تھی کہ جو چاہے آکر تماشا دیکھے سودا

---

۲۸۹ وقائع راجستھان، جلد دوم، صفحہ ۱۳۸۔ نمبر ۲۹۰ صفحہ ۱۴۰ مذکور۔

۲۹۱ صفحہ ۱۳۹ (ج)۔

بھی زیادہ تر زنانہ ہی رکھا جاتا تھا۔ ہر مہینے میں ایک مرتبہ بازار لگا کرتا تھا۔ اُس دن کا نام خوش روز تھا۔ اس مینا بازار کے دن اکثر نسبتیں اور رشتے طے ہو جاتے تھے۔[۲۹۲] مجھے اس سے زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ تقریر ابوالفضل علامی اور آزاد شمس العلما کے بیانات کی صدائے بازگشت ہے۔ جن کو ابھی آپ پڑھ چکے۔

صفحہ ۶۶ نوٹ ۳۸۔

منشی مہاراج بہادر برق دہلوی کا ۱۹۳۶ء میں یکایک انتقال ہو گیا۔ اردو کے ایک مشّاق اور بڑے ہونہار شاعر تھے۔ محکمۂ ڈاک میں افسر تھے۔[۲۹۳] اصلاً قصبہ سکیٹ ضلع ایٹہ کے رہنے والے تھے۔ ان کا خاندان کایستھوں میں معزز و ممتاز مانا جاتا تھا۔

صفحہ ۶۶ ۔مقالہ ۳۹۔ ابوالفضل

ابوطیب مُتنبّی عرب کا ایک فصیح و بلیغ لطیف الطبع شاعر گزرا ہے۔ جس کے انتقال کو ایک ہزار برس سے زیادہ ہوا۔ پھر بھی اُس کا نام

۲۹۲۔ مرقع اکبرآباد، صفحہ ۸۱۔ ۲۹۳۔ ہندو شعرائے اردو خواجہ عشرت، صفحہ ۴۶۔

اور کلام ویسا ہی زندہ چلا آتا ہے۔ دریائے دجلہ کے کنارے سفر میں تھا کہ اس عظیم القدر شخص پر اس کے ایک زبردست مخالف فاتک اسدی نے حملہ کیا۔ متنبّی کے ساتھ صرف اُس کا بیٹا مُحسّد اور ایک غلام مفلح نام تھا دشمن کی جماعت خوب طاقتور اور زیادہ مسلح تھی۔ متنبی نے راہِ فرار اختیار کرنا چاہی۔ مفلح نے اُس کے وہ اشعار پڑھے جن میں متنبی نے اپنی شجاعت و بسالت کا دعوے کیا تھا:-

فَالْخَیْلُ وَاللَّیْلُ وَالْبَیْدَاءُ تَعْرِفُنِیْ
وَالضَّرْبُ وَالطَّعْنُ وَالْقِرْطَاسُ وَالْقَلَمُ[۲۹]

یعنی گھوڑے اور رات اور سوکھے جنگل مجھے خوب پہچانتے ہیں تلوار کی ضرب اور نیزہ اور کاغذ و قلم بھی۔ [یعنی میں صاحبِ رزم و بزم اور سفر و شجاعت اور وضاحت کا ہوں]۔
یہ بھی کہا کہ آپ بھاگیں گے تو دنیا آپ کو "جھوٹا شاعر" کہے گی۔ متنبی نے قدم وہیں جما دیئے۔ خوب جان توڑ کر لڑا اور اپنے بیٹے اور غلام کے ساتھ جان دیدی۔ اکیاون برس کی عمر تھی۔
بالکل یہی صورت شیخ ابوالفضل کو پیش آئی۔ شیخ مبارک ناگوری

[۲۹] تسہیل البیان فی شرح دیوان المتنبی۔ مطبع مجتبائی دہلی، ۱۳۱۲ھ

اپنے وقت کے جامعِ فنون عالم و فاضل مگر کسی قدر خاص عقاید کے انسان تھے۔ ان کے آٹھ لڑکے تھے۔ ابوالفضل منجھلا تھا۔ شیخ مبارک کی عمر ویسے تو جیسی گزرنی تھی گزری تھی۔ مگر آخرِ زندگی میں سعادت مند فرزندوں کا عروج دیں نعمت اور منصب وجاہ دیکھ کر اس دنیا سے بہ اطمینانِ تمام رخصت ہوئے۔" نبذے از احوالِ مصنف" کے عنوان سے ابوالفضل نے اپنے حالات آئینِ اکبری میں لکھے ہیں[۲۹۵]۔

ابوالفضل نو عمری ہی میں اکبر کا مشیر ہو گیا تھا، دبیر بھی، وزیرِ سلطنت بھی۔ بعض ممالک پر فوج کشی ہوتی تو یہ سپہ سالار بنا کر بھیجا جاتا۔ فتح دکن کے لیے سلطان مراد کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ پانچ سال بعد واپسی کا موقع اور اجازت نامہ ملا۔ آگرہ کو علاقہ نرور سے ہو کر جا رہا تھا۔ ایک چھوٹا سا بڑ رفقہ ہمرکاب تھا۔ کہ راجہ بیر سنگھ دیو بندیلہ کے پنجہ یا کمیں گاہ میں پھنس گیا۔ شاہزادہ ولی عہد سلیم "شیخ" سے مشتبہ بلکہ ناخوش رہتا تھا۔ اس کو گمان یہ تھا کہ اکبر کو سلیم کی طرف سے ابوالفضل بہکاتا اور بھڑکاتا رہتا ہے۔[۲۹۶] رفقائے سفر نے ابوالفضل کو وہاں

---

[۲۹۵] جلد سوم، صفحات ۲۰۱ تا ۲۲۱، نول کشوری۔ [۲۹۶] قتل ابوالفضل بایمائے جہانگیر۔ ملاحظہ ہو "تزک" "نیز آئین۔ جلد اول مقدمہ صفحہ ۴۲۔ دراجستھان" ٹاڈ" جلد اول" نوٹ از ولیم کروک" صفحہ ۱۴۰، مطبوعہ سنہ ۱۹۲۰ء آکسفورڈ۔

سے ہٹ جانے اور دشمن کے ہاتھ سے محفوظ رہنے کی رائے دی۔ مگر دلیر ہمت، دلیر دل نے ایک کی بھی نہ سنی۔ بڑی بہادری اور مردانگی سے طاقتور دشمن کا مقابلہ کیا اور مارا گیا۔ سر کاٹ کر شاہزادہ کے پاس الہ آباد بھیج دیا گیا۔ یہ واقعہ ربیع الاول ۱۰۱۱ھ ہجری یعنی اگست ۱۶۰۲ء کا ہے۔ [۲۹۷] مرنے والے نے ابھی زندگی کی ترپن بہاریں بھی پوری نہ دیکھی تھیں [۲۹۸]۔ ابوالفضل کے مارے جانے کی اطلاع اکبر کو اس طریق پر ملی کہ اس کا خوفزدہ سرکاری وکیل اپنے بازو پر نیلا رومال باندھ کر دربار میں حاضر ہوا [۲۹۹]۔ تخت کے پاس آیا۔ اکبر حیرت زدہ ہو گیا۔ واقعہ معلوم ہوا تو بادشاہ نے بڑا غم کیا۔ خون کے آنسو بہائے۔ دو دن اور دو راتیں خواب و خور کے بغیر گزاریں۔ [۳۰۰]

ابوالفضل نے اپنی علمی یادگاریں بھی متعدد چھوڑی تھیں۔ اور سب

---

[۲۹۷] تاریخ فرشتہ، مقالہ دوم، صفحہ ۲۷۱۔ [۲۹۸] آکس فورڈ طلبہ کی تاریخ ہندوستان از ونسنٹ اسمتھ صفحہ ۱۷۹۔ تاریخ جہانگیر از ڈاکٹر بینی پرشاد صفحات ۵۰ تا ۵۵۔ [۲۹۹] امرائے ہنود، صفحہ ۹۳۳ و تاریخ الہ آباد، پہلی جلد، صفحہ ۲۶ بحوالہ ترجمہ انگریزی۔ مآثر الامراء، از ہنری بیورج، مطبوعہ کلکتہ، ۱۹۱۱ء صفحہ ۱۲۳۔ [۳۰۰] ایشری پرشاد کی تاریخ عہد اسلامیان ہند، صفحہ ۳۵۷۔

بلند پایہ، ضخیم و عظیم الشان تھیں۔ جیسے جامع اللغات، مکاتبات علامی، عیار دانش (۹۹۶ھ=۱۵۸۸ء) رسالہ مناجات (۹۹۳ھ=۱۵۸۵ء)، اکبرنامہ (۱۰۰۴ھ=۱۵۹۵ء)، آئینِ اکبری (۹۹۸ھ=۱۵۹۰ء) وغیرہ۔ انگریزوں نے اس کی تصنیفات کی خوب قدر کی اور اپنی سلطنت کے انتظام اور کاموں میں ان سے بہت سا فائدہ اٹھایا اور مدد لی ہے۔ اسی ضرورت سے آئین کا ترجمہ کلکتہ میں فرانسس گلیڈون (FRANCIS GLADWINN) نے ۱۷۸۳ء سے نغایتہ ۸۶ لندن میں اور دوسرا ترجمہ بلاک مین BLOCHMAN نے شائع کیا۔ اکبرنامہ کا ترجمۂ انگریزی مستشرق نامور ہنری بیوریج (H. BEVERIDGE) کے قلم سے ہو چکا ہے۔[1] اور دوسرت مال اہلِ کمال ہے۔ ابوالفضل کے حالات سے تاریخ کا ادنیٰ متعلم بھی واقف ہے۔ ہر نئی پرانی کتاب میں اس کے حالات کم یا زیادہ مل جاتے ہیں۔ تفصیل سے دیکھنا ہو تو شمس العلما آزاد دہلوی کی "دربار اکبری" اور انگریزی میں ترجمہ آئین کی جلد اول میں صفحات الغائبہ ۳۴ تمہید ہی، قابل مطالعہ و استفادہ ہیں[2] ابوالفضل کی زندگی کے واقعات معاصر تاریخوں میں جس قدر ملتے ہیں اس سے کہیں

---

[1] حیات جلیل، حصہ اول، صفحہ ۲۷۔ [2] جیل کی ڈکشنری، صفحہ ۱۶۔ بحوالہ دیباچۂ آئین اکبری۔

زیادہ مفصل و مکمل یکجا طور پر شاہ نواز خاں نے مآثر الامرا میں تحریر کئے ہیں۔ حاشیہ ۳۰۳ - دائرۃ المعارف برطانوی نے بھی ابوالفضل کے متعلق ایک اچھا نوٹ حاشیہ ۳۰۴ دیا ہے۔

مسٹر بیل ابوالفضل کو سب سے بڑا ذی علم اور فصیح و لطیف لکھنے والا جو اُس وقت مشرق میں جلوہ افروز تھا۔ بتاتے ہیں حاشیہ ۳۰۵ اُس کے تحریر کردہ سوانح بادشاہی یعنی اکبر نامہ کی نسبت فرماتے ہیں کہ اُس کے وزیر ابوالفضل نے بڑی فصاحت و روانی، شستگی اور کمالِ احتیاط و صحت کے ساتھ قلمبند کئے ہیں۔ حاشیہ ۳۰۶

کرنیل ٹاڈ ابوالفضل کی قابلیت و دانش مندی کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر اس بات کی، کہ وہ ہندو قوم کا خیر طلب، مدّاح اور حامی تھا حاشیہ ۳۰۷

ابوالفضل نے عہد اکبری کے دانش اندوزانِ دولت کی تفصیل آئین میں دی ہے۔ اس میں بہت سے ہندو علماء کے نام ملتے ہیں۔

حاشیہ ۳۰۳ ترجمہ بیورتیج جلد اول صفحات ۱۱۷ لغایت ۱۲۸۔ حاشیہ ۳۰۴ صفحات ۷۹ و ۸۰ جلد اول، گیارھواں ایڈیشن۔ حاشیہ ۳۰۵ بیاگرفی کل ڈکشنری، صفحہ ۲۶۔ حاشیہ ۳۰۶ بیاگرفی کل ڈکشنری صفحہ ۱۳۱۔ حاشیہ ۳۰۷ راجستھان جلد اول مطبوعہ آکسفورڈ، ۱۹۲۰ء صفحہ ۱۴۷۰۔

جن میں سے بعض شاہزادوں اور سلاطین کی تعلیم و تربیت پر مامور تھے۔

کرنل صاحب ایک موقع پر منصفانہ لکھتے ہیں کہ ہنری چہارم اور ملکہ الیزبتھ کی طرح اکبر کے وزیر سلطنت سب روشن ضمیر، اور اراکینِ دولت بھی صاحب تدبیر تھے۔ اگر یورپ میں سلّے (SULLY) [۳۰۸] وفادار متدین تجربہ کار اور صاحبِ سیف و قلم تھا تو اکبر کے دربار کو بھی بیرم خان [۳۰۹] کی ذات سے رونق حاصل تھی۔ جس کی لیاقت اور اوصاف کا جواب دینے والے چراغ لیکر ڈھونڈنے سے بھی نہ مل سکتے تھے۔ وہاں برسلے (سر ولیم سی سِل) [۳۱۰] کی شہرت تھی تو یہاں ابوالفضل کی۔ برسلے LORD BURLEIGH میں دانائی و فراست ابوالفضل کے

---

[۳۰۸] ولادت ۱۵۶۰ء وفات ۱۶۴۱ء۔ [۳۰۹] کرنل ٹاڈ ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں کہ بیرم خاں عہدِ اکبر کا وہ شخص تھا جسے ہنری چہارم کا مثیل کہہ سکتے ہیں کہ یہ دور اندیش امیر نہایت شجاع اور تجربہ کار تھا۔ اس نے اپنے جوہر شجاعت سے صوبہ دہلی و آگرہ سر کئے۔ کالپی۔ چندیری، کالنجر، بندیل کھنڈ اور مالوہ سب کو زیرِ حکومت کر لیا تھا۔ (راجستھان، ترجمہ اُردو، صفحہ ۴۰۲، بار پنجم لاہور)

[۳۱۰] SIR WILLIAM CECIL AFTER WARDS LORD BURLEIGH = ELIZABIETH'S CHIEF MINISTER انسائیکلو پیڈیا میں بہ نام BURGHBY لکھا ہے۔

برابر تھی، لیکن دلی نیکیوں اور فیاضیوں کا وصف بوبچلے میں ابوالفضل کا عشر عشیر بھی نہ تھا۔ [۳۱۱] [پروفیسر رابرٹس اپنی تاریخ ہند برطانوی (صفحہ ۱۱) میں لکھتے ہیں کہ اکبر ٹھیک طور پر انگلستان کی ملکہ ایلزبتھ کا معاصر تھا، اسی طرح جہانگیر جیمس اول کا۔]

ابوالفضل کا زمانہ ولادت محرم ۹۵۷ھ یعنی جنوری ۱۵۵۰ء ہے۔ [۳۱۲]

ابوالفضل کی تحریرات اور تحقیقات کے متعلق تمام مورخ اور تذکرہ نگار یکساں اور مضبوط رائے رکھتے ہیں۔ تاہم کچھ ایسے بھی ہیں جو بے جانے بوجھے اختلاف اور تعریض [۳۱۳] فرماتے ہیں۔ جیسا کہ ترجمہ آئینِ اکبری جلد دوم کی تمہید نوشتہ جیرٹ (JARRE T) صاحب سے واضح ہوگا۔ ڈاکٹر کروک ایک حاشیے میں اس کی تردید فرماتے ہیں "اگرچہ ابوالفضل کی تاریخیں اور وقت بعض جگہ مطابق نہیں ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ کہہ دینا یا باور کر لینا بھی دشواری سے خالی نہیں کہ کوئی بات جس کو وہ واقعہ کہہ رہا ہو محض طبع زاد ہے۔ [۳۱۴]

---

[۳۱۱] ترجمہ تاریخ ٹاڈ، صفحہ ۶۴۶۔ اس کا تذکرہ ڈاڈویل اور ہارٹین کی "تواریخ برطانوی کے بنیادی نقوش" میں بھی ملتا ہے، صفحات ۳۱۰ و ۳۱۲۔ طبع لندن ۱۹۳۸ء اڈیشن سوم۔ [۳۱۲] حیاتِ جلیل، حصہ اول، صفحہ ۲۶، نوٹ ۳۳۔ ۳۔ بیل کی ڈکشنری صفحہ ۱۶۔
[۳۱۳] کنایہ کے ساتھ بات کرنا یا سامنے لانا۔ [۳۱۴] حاشیہ ۲، صفحہ ۳۷۸۔ بحوالہ صفحہ ۸۱، مغلِ اعظم اکبر از اسمتھ۔

ابوالفضل علّامی کے اکبر نامہ (مطبوعہ ۱۸۸۶ء) اور اُس کے انگریزی ترجمہ کا جو مسٹر بیوریج (BEVERIDGE) نے کیا اور ۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۹ء تک شائع ہوتا رہا، نیز آئین اکبری کا، معاصر اہل قلم زیادہ تر حوالہ دیتے ہیں۔ مجھے بھی اُن کا تذکرہ کرنا پڑا ہے۔ لیکن میری نگاہ اُنھی نسخوں پر رہی ہے جو بسلسلۂ BIBLIOTHECA INDICA SERIES شائع ہو رہے ہیں۔ خواہ اکبر نامہ کے ہوں خواہ آئین کے۔ البتہ یہ ملحوظ خاطر رہے کہ آئینِ اکبری جو بجائے خود تین جلدوں میں چھاپی گئی ہے۔ حقیقتاً وہ اکبر نامہ ہی کی تیسری اور آخری جلد ہے، جیسا کہ بلاک مین (BLOCHMANN) نے اپنے دیباچہ PREFACE مشمولۂ ترجمہ جلد اول آئین اکبری، مترجمہ و مرتبہ و مطبوعہ، فلاٹ (PHILLOTT) ، صفحہ پنجم، ۱۹۳۹ء میں تحریر کیا ہے۔

ہماری جماعت کے ایک فرد کامل، مسلمان مورخ، پروفیسر ڈاکٹر سید اطہر علی نے اپنے مقالہ "تاریخ محمد عارف قندھاری" کی تفصیل و تشریح و تبیین [۳۱۵] کے سلسلہ میں ابوالفضل مبارک کو طنزیہ طور پر "دانش پژدہ آگاہ دل" کہہ کر یاد فرمایا ہے۔ [۳۱۶] اس سے پیشتر اس سے

---

۳۱۵ بیان کرنا۔ آشکارا کرنا۔ ۳۱۶ روئیداد دائرۂ معارفِ اسلامیہ، اجلاس دوم، ۱۹۳۶ء، صفحہ ۳۱۸۔

بھی زیادہ صاف اور صریح کلمات میں اُس کی ستایش فرما چکے تھے یعنی "سرآمدِ چاپلوسانِ یاوہ گو" [۳۱۷] ایک تیسری جگہ لکھ چکے تھے کہ محمد عارف نے اپنے مربی کے عیوب کی پردہ پوشی کی ہے۔ اُن کو دیکھنا چاہو تو ابوالفضل مبارک کے خامۂ آسمان خرام کی صناعی میں اکبرنامہ کے عرش پر دیکھو [۳۱۸]۔

ذی علم ڈاکٹر نے اپنے اسی مضمون میں [۳۱۹] اسی تاریخ کے حوالے سے اکبر کی بہت سی اچھی بُری باتیں دبی زبان سے کہہ ڈالی ہیں۔ اکبر کے مداحو اور ثنا خوانوں کی زبان، حافظ شیراز کی زبان سے یہ کہلا کر بند کر دی ہے۔

واعظِ شہر کہ مردم ملکش می خوانند
قولِ ما نیز ہمین است کہ او مردم نیست [۳۲۰]

اس تحریر کے جستہ جستہ حصے یہ ہیں (۱) ابوالفضل نے اکبر کے عیوب پر جو پردہ ڈالا ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ ابوالفضل نے نہ اس کی افیون کھانے کی عادت کا ذکر کیا نہ شراب خواری کا۔ افیون کے شغل کا مورخ فرشتہ گواہ ہے [۳۲۱]۔ یہ شب عاشور کو اکبر کی مے نوشی اور سرمستی اور شُربِ مدام کے مُلّائے بدایونی شاہد ہیں [۳۲۲]۔ البتہ اُس کے یہاں جہانگیری کا دور چلتا تھا۔ دیسی ڈھرے کی بو بھی نہ آنے پاتی تھی۔ عارف نے

---

[۳۱۷] ایضاً صفحہ ۳۰۷۔ [۳۱۸] ایضاً صفحہ ۳۱۲۔ [۳۱۹] روئیداد۔ اجلاس دوم ادارہ معارف اسلامیہ لاہور صفحات ۲۹۶ لغایت ۳۲۲۔ [۳۲۰] صفحہ ۳۱۰ [۳۲۱] ہندو شاہ فرشتہ تاریخ [۳۲۲] منتخب التواریخ، جلد دوم۔

بھی اس کا حال اپنی کتاب "مقطع" میں لکھا ہے۔ (۲) اکبر نے اپنے چچا زاد
بھائی مرزا ابوالقاسم ابن کامران کو درحالیکہ وہ گوالیار کے شاہی قید خانہ
میں محبوس تھا" اپنا اندیشہ دور کر دینے کے لئے دنیا سے رخصت کر دیا۔
راجہ بہارا مل والی امیر کے بیٹوں میں سے ایک (غالباً راجہ بھگوان داس) ۳۲۳
نے اس کا خون بہا کر سرخروئی حاصل کی اور ابوالفضل نے پردہ پوشی کر کے

(۳) ابوالفضل نے اکبر کے عادات و خصائل میں دشمنوں کی جان بخشی کو
بہت سراہا ہے۔ اور دوسرے مورخین خاص کر آج کل کے مؤلفین نے
بھی اس کی اس صفت کو بہت کچھ بڑھا چڑھا کر دکھایا ہے۔ مگر عارف کی تالیف
سے اسکی تائید نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکبر طبعاً نہیں بلکہ مصلحتاً
دشمنوں کے ساتھ رحم کا برتاؤ کرتا تھا۔ بلکہ بعض اوقات عزت دار قیدیوں
کو سر دربار زدو کوب کرا کر اچھی طرح ان کی بے عزتی کر لیتا تھا۔ اور
اپنے عزیزوں اور قریبی رشتہ داروں میں سے تو کسی کو اس نے بخشا
ہی نہیں ۳۲۴

صفحہ ۳۰۷ - نوٹ ۴۰ - پرتھی راج

"پرتھی راج" والی بیکانیر کا چھوٹا بھائی تھا۔ یہ ریاست حال ہی میں

۳۲۳ تواریخ منتخب الکلام - قلمی، نوشتہ ۱۲۱۲ھ ۳۲۴ مقطع، صفحات ۱۵۹-
۱۶۰-

بنی تھی۔ مارواڑ کے راٹھوروں نے قائم کی تھی۔ جنگل اور ریگ زار میں واقع ہوئی تھی۔ کرنیل ٹاڈ پر تھی راج کی بڑی تحسین و ستائش کرتے ہیں کہ وہ اپنے وقت کے بڑے سے بڑے بہادر سورماؤں میں سے تھا۔ قلم اور شمشیر کا یکساں دھنی تھا۔ شاعر تھا۔ تاہم ایسی طاقت نہ تھی کہ اپنے بڑے بھائی مال دیو کی نظیر پیش کر سکتا اور مقابلہ و مزاحمت کرتا۔ اس پر اکبر کا بڑا اثر تھا۔[۳۲۵]

صفحہ ۳۷، نوٹ ۱۴

سکتا، رانا اودے سنگھ بانی اودے پورہ یا اودے پور کا بیٹا تھا۔ میواڑ کا قبیلہ سکتاوت اسی کی اولاد، اسی سے منتسب ہے۔[۳۲۶] سکتا کی ماں، بائی جی راج بیوہ مہارانی میواڑ کی تھی۔ اب سکتاوت کی بڑی شاخ کی مائیں "مائی جی راج" کہلاتی ہیں۔[۳۲۷]

صفحہ ۳۷، نوٹ ۲۴

تاریخ ایک اور شجاع رانی کا ذکر کرتی ہے جو پرتھوی راج کی عورت تھی۔ مگر وہ میواڑ کا والی تھا۔ تارا بائی نے اپنی زندگی میں ایسے بہت سے کام بہادری اور دلاوری کے کر دکھائے تھے، جن کے

---

[۳۲۵] راجستھان انگریزی، مطبوعہ ۱۹۲۰ء، صفحات ۳۱۷ و ۳۹۹۔ [۳۲۶] راجستھان مطبوعہ ۱۸۳۰ء، مدراس، صفحہ ۱۳۳ نوٹ۔ و صفحہ ۷۵، مطبوعہ ۱۹۲۰ء۔ آکسفورڈ۔

[۳۲۷] صفحہ ۳۹۵ نوٹ ۲۔ ترجمہ۔

مقابلے میں مردوں اور سالونتوں کی بہادریاں بھی شرما جاتی ہیں۔

صفحہ ۳۰۷ نوٹ ۴۳ رام سنگھ

اصل انگریزی میں رائے سنگھ لکھا ہے نٹ ۳۲۸۔ یہ بیکانیر کا راجا تھا اور جودھ پور سے قطع تعلق کر کے خود مختار ہو چکا تھا۔ اسی کو اکبر نے مالاکوٹ اور ناگور کے قلعے اور قطعے بعد فتح دے ڈالے تھے۔ نٹ ۳۲۹ اور اسے راٹھور کا پیشوا بنادیا تھا نٹ ۳۳۰ رائے سنگھ کی حسین رانی اکبر کی سگی سالی تھی ۳۳۱

یہ رائے رائے سنگھ والی بیکانیر پنج ہزاری منصب دار تھا۔ اس کا باپ کلیان مل راٹھور اور مورث راؤ بیکا تھا۔ رائے سنگھ اور اس کے باپ نے سالہا سال تک اکبر کے عہد میں کارہائے نمایاں کیے۔ راجپوت امرا میں بھی رائے سنگھ کا مرتبہ نہایت بلند تھا۔ اپریل ۱۶۰۷ء سے اس کے تعلقات شہنشاہی ارکان و خاندان سے بگڑ گئے تھے۔ آگرہ کے مقام سے بیگمات شاہی کو پنجاب پہنچا دینے کا حکم ملا۔ تو رائے سنگھ بیکانیر چل دیا۔ اور اطراف ناگور میں علم بغاوت بلند کیا۔ ۳۳۲۔ کچھ روز یہ اور

نٹ ۳۲۸ صفحہ ۲۹۱، جلد اول۔ نٹ ۳۲۹ صفحہ ۲۷، جلد دوم۔ نٹ ۳۳۰ صفحہ ۲۷۔ مذکورہ۔ نٹ ۳۳۱ صفحہ ۱۳۳، جلد دوم۔ نٹ ۳۳۲ ترجمہ تزک جہانگیری از راجرس بیوریج جلد اول صفحات ۷۶، ۷۸، ۱۳۰ و ۱۳۱۔ بلاک مین صفحات ۳۵۷ لغایت ۳۵۹۔

(بقیہ صفحہ آئندہ پر)

اس کا بیٹا دلپت رائے ان اطراف میں کوسِ لمن الملکی بجاتے رہے۔ بالآخر گرفتار ہوئے۔ پھر عفوِ جرائم ہوا۔ مراتب و جاگیر واپس ملی۔ رائے سنگھ نے ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ء) میں کشمکشِ دنیا سے مخلصی پائی۔[۲۳۳]

بھائی پرمانند جن کے نام سے پہلے "دیوتا سروپ" لکھا جاتا ہے۔ تاریخ راجستھان میں تحریر کرتے ہیں کہ بہت سے راجپوت جب اکبر کے ساتھ مل گئے تھے اس کے دربار میں بڑی عزت سے رہتے تھے۔ ان کے لئے ایک محلہ جدا آباد کیا گیا تھا۔ اکبر ان کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آتا تھا۔ تاکہ انھیں اس کی ماتحتی بہت بُری نہ معلوم ہو۔ بیکانیر کے سرداروں میں سے دو بھائی رائے سنگھ اور پرتھوی راج انہی میں سے تھے۔ دونوں کو دربار میں اعلیٰ رتبہ حاصل تھا۔ اکبر نے رائے سنگھ کی لڑکی سے شہزادہ سلیم کی شادی کر دی تھی۔۔۔۔ پرتھی راج نے پرتاب کے بھائی سکت کی لڑکی سے شادی کی تھی۔[۲۳۴]

اسی رائے سنگھ والی بیکانیر کی بیٹی جودھا بائی جہانگیر سے منسوب تھی۔ اس نے سفارش کر کے جگت سنگھ برادرِ مان سنگھ کے پوتے جے سنگھ کو مسندِ آمیر دلا دی۔ جس پر نور جہاں کو گونہ کبیدگی بھی ہوئی

(بقیہ صفحہ گزشتہ) و ۳۸۷۔ گلیڈون، صفحہ ۱۲۔ بینی پرشاد جہانگیر، صفحہ ۱۵۱۔ تاریخ

[۲۳۳] مآثر صفحات ۳۹۹ و ۵۸۰ و ۱۱۳۲۔ امرائے ہنود، صفحہ ۲۱۵۔

[۲۳۴] صفحہ ۳۶۹

تھی۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ اور جودہ بائی محل شاہی کے برآمدے پر رونق افروز تھے۔ جب گفتگو ہو چکی تو بادشاہ نے جے سنگھ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔ "راجکماری آمیر کا راج مبارک۔ آپ جودھا بائی کو مجرا عرض کرو۔" جے سنگھ نے عرض کیا کہ "راجپوت ہو کر میں جودھا بائی کو سلام نہیں کر سکتا اور جس بیگم کو کہئے آداب بجا لاؤں"۔ جودھا بائی ہندی زبان میں بولی کہ "اچھا نہ سہی، میں نے تو امبیر کا راج دیدیا۔"[۳۴۵]

صفحہ ۷۵، نوٹ ۴۴

یہ مونچھوں کا معاملہ کبھی دلچسپی، نزاکت، واقعات اور طنز سے خالی نہیں پایا گیا ہے۔ راجپوتوں کے مختلف طبقوں اور جماعتوں میں بھی ایک دوسرے پر چوٹیں ہوتی رہی ہیں۔ ایک مرتبہ راٹھوروں کے کسی خوشامدی بھاٹ نے دوہا بنایا تھا اور کہا تھا کہ "راٹھوروں نے جے پور والوں کی ڈوبی ہوئی ناؤ کو بچایا ہے"۔ اتفاقاً پھر کوئی ایسا معرکہ پیش آگیا جس میں کچھواہوں نے سندھیا کی مدد کی۔ راٹھور مقابلہ پر آئے۔ شکست کھا کر (پاٹن سے) بھاگے۔ راستہ میں زمینداروں اور باشندوں نے اُن کی سواریاں اور کل سامان چھین لیا۔ لوٹا مارا۔ اب جے پور والوں کا داؤ تھا۔ بھاٹوں نے خوب خبر لی۔ اور شاعرانہ مدح سرائی

---

[۳۴۵] ٹاڈ کا راجستھان، ترجمہ اردو۔ صفحہ ۱۵۶۹۔

(ہجو!) کی کہ "راٹھور لوگ گھوڑا جوڑا، پگڑی، مونچھیں اور تلوار بھاری سمجھ کر میدان میں چھوڑ بھاگتے ہیں۔" [۳۳۶]

مونچھوں پر تاؤ دے کر ہنس دینا یا کچھ کہہ ٹوالنا امیرانہ رعونت [۳۳۷] والے بے نیازی کی وہ ادا تھی جس کے اکثر بڑے آدمی اُس زمانہ میں خوگر تھے۔ [۳۳۸]

ہندو اہلِ قلم لکھتے ہیں کہ پرتھوی راج کی یہی مونچھیں تھیں جنھوں نے سنجوگتا رانی (SANYUKTA) کو اپنے دام میں پھانس لیا تھا۔ یہی مونچھیں تھیں رانا پرتاب کی جن سے اکبر ہمیشہ خوف کھاتا رہا۔ گویا کہ اگلے وقتوں میں راجپوتوں کی طاقت کا اصلی اور صحیح معیار انھیں کو سمجھا جاتا تھا۔ [۳۳۹]

ہمارے ملک کی تاریخ ایک اور بڑے شخص کی یاد دلاتی ہے۔ محمود بیگڑہ والی گجرات (جلوس ۸۶۳ھ = ۱۴۵۸ء۔ وفات ۹۱۷ھ = ۱۵۱۱ء) کی مونچھیں اتنی بڑی اور لمبی تھیں کہ وہ ان کو اپنے سر سے لپیٹ لیتا تھا، یا بالفاظِ پادیانِ انگریزی باندھ لیتا تھا۔ داڑھی کی لمبائی بھی اسی

---

[۳۳۶] مختصر تاریخ راجپوتانہ از مولوی عبدالرحمان خاں، صفحات ۷۱ و ۷۲۔ [۳۳۷] سرکشی خود آرائی زینت۔ [۳۳۸] تاریخ راجستھان، از بھائی پرمانند، صفحہ ۲۹۰

[۳۳۹] کانیا کبج انٹر کالج میگزین۔ نمبر ۱، جلد دوم۔ نومبر ۱۹۴۰ء

اسی مناسبت سے تھی، گو سے تجاوز کر گئی تھی۔ اس نے نصف صدی سے زیادہ حکمرانی کی۔ اس کے اعمالِ نیک اور انتظاماتِ ستودہ کی شہرت کے ساتھ ساتھ اس کی داڑھی مونچھ کا شہرہ بھی فرنگستان پہنچ گیا تھا۔ جیسا کہ پروفیسر ایشری پرشاد نے اپنی کتاب کے صفحہ ۳۹۸ نوٹ ۴۳ میں قلم بند فرمایا ہے۔

مولانا سید ابوظفر ندوی نے معارف (نمبر ۲، ماہ فروری ۱۹۴۵ء، صفحہ ۱۴۷) میں تحریر فرمایا تھا کہ یہ سلطان محمود اعظم، سلطان احمد بانی احمد آباد کا پوتا تھا۔ عام طور سے اسکو گجرات میں محمود بیگڑہ (بیگڑہ) کہتے ہیں۔ بیگڑہ کا صحیح ترین ترجمہ ذوالقرنین ہے، یعنی بیلوں کے سینگو کی طرح لمبی لمبی دو مونچھوں والا۔

داڑھیوں کی کانٹ چھانٹ یا بقاو فنا کی شکایت کیا ہے شکایت کیوں؟ مونچھوں کی نگہداشت اور رکھ رکھاؤ کا معاملہ ہمیشہ پیچیدہ و دشوار رہا ہے۔ اور ان کی وضع و قطع اور طرز تزئین طرح طرح سے مختلف دیکھی گئی ہے۔ یہاں زیادہ تفصیل و بیان کی ضرورت نہیں۔ اس سے پہلے بھی ان کے متعلق کچھ لکھ چکا ہوں۔ اس قدر اور تحریر کر دینے کی ضرورت ہے کہ ہمارے زمانہ کا بے نظیر محقق و مکتشف عقلیات و طبعیات کا ماہر اعظم پروفیسر آئنسٹائن (EINSTEIN)

اور بے نظیر سیاس و مدبر مارشل یوسف اسٹالن JOSEPH STALIN با ہمہ عظمت و جبروت مونچھوں کی خیر و عافیت مناتے رہتے ہیں۔ اطبا و حکما کی تشخیص و تجویز یہ ہے کہ مونچھوں اور گل مچھوں کے رکھنے سے دانتوں کا درد ستانے نہیں پاتا۔ چہرہ کی اعصابی (رگ پٹھے کی) بیماریوں سے انسان محفوظ رہتا ہے۔ بقول کسی ہندو نوخیز فلسفی کے اگر اس گندہ و مکروہ کونچی (برش) سے کوئی نفع یا خالقِ حقیقی کی مصلحت مرکوز نہ ہوتی تو ایک بیکار و بیہودہ چیز اضافہ ہی کیوں کی جاتی! [۲۴۶]

ان فوائد و منافع کو تسلیم کیجئے یا نہ کیجئے، یہ چیز چہروں کو مردانہ رعب و رونق بخشنے والی (مونچھ) اب خود بخود کم ہوتی جاتی ہے۔ شریعت اسلامی کے علم بردار "احفوا الشارب" والی حدیث رسولِ پاکؐ اور مسئلہ فقہی کی پیروی میں اس کو باریک سے باریک بلکہ رخصت کرتے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے ہونہار فرزند یعنی نئی پود کے انگریزی تعلیم یافتہ بھی اہلِ فرنگ کے اتباع و تقلید میں خیرباد کہتے جا رہے ہیں۔

صفحہ ۸۶۔ نوٹ ۵۴

سنسکرت کی اصل کتاب میری نظر سے نہیں گزری نہ میں اس زبان

---

[۲۴۶] قنوجی برہمنوں کے کالج کا رسالہ بابتہ نومبر ۱۹۴۳ء نمبر ۱ جلد دوم کانپور

کو جانتا ہوں۔ لیکن کرنل ٹاڈ کی تاریخ راجستھان سے پایا جاتا ہے کہ کوئی راج ترنگنی اور بھی ہے، جس کا نام راجاولی کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ تاریخیں پنڈت وِدّیا دھر اور پنڈت رگھوناتھ کی تصنیف ہیں اور راجگانِ ہند اُن کو مستند جانتے ہیں[۳۴۱] یہ مہاراجہ جے سنگھ والی امبیر کے پیشِ نظر حوالۂ قلم ہوئی تھیں۔[۳۴۲] تاریخِ کشمیر مترجمۂ منشی اشرف علی سے بھی تحریرات بالا کی توثیق ہوتی ہے۔[۳۴۳]

اصل یہ ہے کہ سنسکرت آج کل مردہ زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ عرصہ سے اس کا استعمال متروک ہے۔ ایک مدت دراز سے خود ہندو بھی اس زبان میں تصنیف و تالیف نہیں کرتے تھے۔ اب قومیت نواز قدامت پرست فضلائے ہند کی ایک جماعت اسکو تازہ زندگی بخشنے میں مصروف ہے۔ کوششیں کر رہی ہے۔

جیسا کہ معلوم عام ہے پرانے زمانہ میں سنسکرت ہی درباری زبان تھی۔ سلطنت کے تمام کاروبار اسی زبان میں ہوتے تھے۔ یہی

---

۳۴۱ ترجمہ افق، صفحہ ۱۶۰۔ ۳۴۲ اصل تاریخ انگریزی صفحہ ۴۲۔ ۳۴۳ صفحات ۹۵ و ۱۰۶ و ۱۰۸ و ۱۱۰ و ۱۱۲۔ یہ "تاریخ کشمیر" خواجہ محمد اعظم کی "واقعاتِ کشمیر" ۱۱۵۹ھ (۱۷۴۶ء) کا ترجمہ ہے۔ مطبوعہ ۱۸۴۶ء مطبع العلوم، مدرسہ دہلی۔

سنسکرت سارے ہندوستان کے عالموں اور تصنیف کرنے والوں کی زبان تھی۔ اس لئے پورے کشور ہند پر چھائی ہوئی تھی۔[۳۴۴] سنسکرت کا ادب اور ذخیرۂ علم بہت وسیع تھا۔ حسن و عشق، شجاعت و جانبازی، فصاحت و بلاغت، ظرافت و لطافت کے اچھے سے اچھے نمونے اس میں نظر آتے تھے۔ چینیوں کی مقدس آسمانی تحریرات بھی اس میں موجود تھیں۔[۳۴۵]

ڈاکٹر عبدالحق اپنی "تنقیدات" میں فرماتے ہیں کہ آریاؤں کی ایک شاخ کابل سے ہوتی ہوئی شمالی ہند پہنچی تھی۔ اسے آنے اور بسنے میں ایک مدت لگی۔ یہی انڈو ایرین (ہند آریائی) کہلائی۔ ان کی زبان کو ادبی شان عرصۂ دراز کے بعد نصیب ہوئی۔ یہی زبان سنسکرت ہے، جس کے معنے "شستہ" کے ہیں۔ لیکن یہ علما اور اہل الثیا کی زبان تھی۔[۳۴۶]

(۱) سنسکرت لٹریچر پر میکڈانیل (MAC DONNEL) کا آرٹیکل امپیریل گزیٹیر، جلد دوم، صفحہ ۲۴۲ میں (۲) کیتھ (KEITH) کا سنسکرت ڈراما پر (۳) موصوف کی تصنیف قدیم سنسکرت ادب و انشا پر

[۳۴۴] مقالاتِ شبلی۔ صفحہ ۱۷۔ برج بھاشا زبان۔ [۳۴۵] قرونِ وسطےٰ میں ہندوستانی تہذیب، صفحہ ۸۳۔ [۳۴۶] صفحہ ۲۴۔

(CLASSICAL SANSKRIT LITERATURE ہندوستان کی میراث کے سلسلہ میں) ملاحظہ طلب ہیں۔

صفحہ ۸۷، نوٹ ۴۶

کلہن پنڈت نے جس وجہ سے یہ رائے قائم کی ہوگی تاریخ کا طالب علم اس سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ غالباً وہ یونانی مورخ اسٹربو (STRABO) کے ہم خیال ہیں۔ وہ فرماتا ہے کہ اس مشتبہ توقع یا آرزو میں کہ اب کوئی جوان خاوند مل جائے گا یہ عورتیں بوڑھے شوہر کو زہر دیدیتیں، مار ڈالتی تھیں۔ حقیقتہً اسی خطرہ کے انسداد کے لئے ستی کی رسم کی بنیاد پڑی تھی لوگوں کا اس وقت اعتقاد یہ تھا کہ مرنے کے بعد روح طبقاتِ علیین میں چلی جاتی ہے اس لئے دنیا شعار شنیک کردار پرستار (بیوی) کا ہمراہ رہنا لازم ہے۔ بے شبہ اس سے بڑے آدمیوں اور راجہ مہاراجہ کی زندگی کی کسی قدر حفاظت ہوگئی تھی۔ اطمینان سا رہنے لگا تھا۔ ان کی رانیاں سازشوں کا شکار ہوکر شوہروں کو زہر نہ دے سکتی تھیں۔

صفحہ ۸۸، نوٹ ۴۸ ۔ صابونجی

ہو
صابنجی

دوشیزہ کیا البیرونی الصابنجی کے باپ کا نام یعقوب

تھا اور وطن شہر "اُرفا" [۳۴۷] ان کا قبیلہ علم و فضل اور فلاح و فراغ میں ہمیشہ سے ممتاز رہا ہے۔ خود ان کا مسقط الراس یا ولادت گاہ "جزیرۃ العشاق" تھا جو عراق میں دجلہ و فرات کے درمیان واقع ہے۔ دملن اور

[۳۴۷] احمد زکی بک اپنی کتاب "قاموس الجغرافیۃ القدیمہ" میں لکھتے ہیں کہ "الرُّھا" دیار جزیرہ میں مشہور شہر ہے۔ فرنگیوں کے یہاں اس کا نام (EDESSE) ہے۔ اس زمانہ میں ترک اس کو "اورفا" کہتے ہیں۔ (صفحات ۴۲ و ۱۷ و ۶۹)

لوئیس بک اس مقام کو آباد و بارونق بتاتے ہیں۔ اسی اُرفا یا سرزمین جزیرہ دوآبہ میں آدم و حوا علیہما السلام سکونت گزیں رہے تھے۔ حضرت نوح بھی اپنی کشتی سے اسی جگہ اُترے تھے۔ ابراہیم خلیل اللہ کا مولد و مسقط الراس بھی یہی خاک پاک ہے۔ شیخ کمال الدین سمرقندی اپنی تاریخ مطلع السعدین (صفحہ ۸۳۸ جلد ۲ جزو ۲) میں اس مقام کا نام خلیل الرحمٰن بارک اللہ فیہا شرفاً و عزاً لکھتے ہیں۔ معجم البلدان (جلد ثانی صفحہ ۴۶۸) میں اس موضع کو الخلیل اور بیت المقدس سے ایک دن کی مسافت پر لکھا ہے۔ یہاں خلیل ابراھیمؑ کی قبر مبارک بھی ہے۔ اس کا اصلی نام حبرون تھا۔ فرنگستان کے سب سے بڑے گڑے مردے اکھاڑنے والے سر لیونارڈ وولی (SIR LEONARD WOOLLEY) نے مناسب تفصیل کے ساتھ اپنے کارنامہ "کلدانیوں کا اُر" "UR OF THE CHALDIES" میں حوالۂ قلم کیے ہیں۔ میرے نزدیک "اُر" اور "اورفا" کے مابین فرق و امتیاز کرنا دشوار ہے۔ احمد زکی پاشا اس کا موجودہ نام "ام قیر" بتاتے ہیں۔

گھر بار کم سنی میں چھوڑا۔ تحصیلِ علوم اور کسبِ فنون باہر کرتے رہے۔ ابھی گہوارہ سے نکلے تھے کہ شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ ان کا ۱۸۵۲ء یا عہد طفلی کا کہا ہوا پہلا شعر ان کے دیوان میں موجود ہے۔[۳۴۸] انھوں نے بہت کچھ کہا ہے اور سب موجودہ زمانہ کے رنگ میں اور اچھے اسلوب سے کہا ہے۔ ان کا دیوان عربی "شعر النحلہ (المنظوم فی خلال الرحلہ)" سے موسوم، خاصا ضخیم (۵۰۰ صفحات کا) اسکندریہ میں پرنسس الکسندرا افیر ینوہ کی توجہ و عنایت سے ۱۹۰۱ء میں پورے اہتمام اور تکلف سے طبع ہوا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ فن و مشرب[۳۴۹] کی حیثیت سے نہیں بلکہ محض لہو و لعب یا ہزل[۳۵۰] و خلاعت[۳۵۱] کی خاطر شعر کہتے رہے ہیں۔ وہ زیادہ تر شعر سفر و سیاحت کی حالت میں کہتے تھے۔ کرۂ زمین کی گردش تو مشہور ہی ہے لیکن انھوں نے بھی پورے کرۂ ارض اور تمام اقالیم کا دورہ کیا تھا۔ ہمارے ہندوستان کی خاکِ پاک نے بھی ان کے قدم چومے تھے۔ "جبال حملایا" (کوہ ہمالہ) اور انکی حقیقی یا فرضی معشوقہ کسی ہندوستانی امیرزادی "لالا" کی شان میں بھی اشعار موجود ہیں[۳۵۲] دنیا کی دو چوٹی کی علمی انجمنوں یعنی رومۃ الکبریٰ کی اکیڈیمیہ ارکادی اور

---

[۳۴۸] صفحہ ۳۳۰۔ [۳۴۹] آئین۔ نفع اٹھانا۔ [۳۵۰] بے ہودگی۔ مسخرہ پن۔

[۳۵۱] عنم کھانا۔ دل بہلانا۔ [۳۵۲] صفحہ ۳۳۷۔

برطانیہ عظمیٰ کی رائل ایشیاٹیک سوسائٹی کے رکن رکین[۳۵۳] تھے[۳۵۴]۔ آٹھ زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ یعنی کلدانی، سریانی، عربی، ترکی، لاتینی، ایتالوی فرانسیسی اور انگریزی[۳۵۵]

شاہزادہ ولی عہد پرنس آف ویلیس کی طرف سے، جو بعد کو بادشاہ اڈورڈ ہفتم ہوگئے تھے، "دارالفنون" "امپیریل انسٹی ٹیوٹ" لندن میں لغاتِ شرقی کی تعلیم پر مامور تھے۔ سلطان عبدالحمید خانِ ثانی نے ان کو شاہزادگانِ عالی نژاد اور امرا و نجبا کی اولاد کو علوم تاریخی سکھانے کے لیے مقرر کیا تھا۔ ۱۸۹۰ء میں سلطان نے انگریزی، عربی، فرانسیسی اور ایتالیاقی۔ زبانوں سے ترکی میں ترجمہ کرنے کی خدمت بھی انکو تفویض فرمائی۔ "مترجم خاص" کا منصب عالی عطا ہوا۔[۳۵۶]

جب تک زندہ و آزاد رہے، جامع اوراق (مقبول) کو اپنے نتائج کرائم سے یاد و شاد فرماتے رہے۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را! دیوان ابھی زیر طبع تھا کہ مجھے اس کی بشارت دی تھی۔ اور اپنے ملاطفۂ گرامی مرقومۂ ۲۴ تشرین اول ۱۹۱۰ء میں تحریر فرمایا تھا:۔

"آخر اثر من آثاری الادبیۃ ھو دیوان شعر ادبی، تاریخی، کیمیائی، فلکی، صناعی، غزلی، فلسفی ولاھوتی۔ وھو الآن تحت الطبع بمصر

---

۳۵۳ محکم استوار۔ ۳۵۴ دیباچۂ دیوان۔ ۳۵۵ صفحہ ۱۸۔ ۳۵۶ دیباچہ از سیدہ ایجز نیئر

یہ ادبی یادگاروں میں سب سے آخری نقش میرے اشعار کا دیوان ہے۔ اس میں ادبی کلام بھی ہے تاریخی بھی کیمیائی بھی آسمانوں کے متعلق بھی صنعتوں کے بارہ میں بھی۔ اس میں غزلیت بھی ہے فلسفہ (حکمت) بھی۔ الٰہیات (ذات باری کے عالم) کی نسبت بھی۔ یہ آج کل مصر میں زیر طبع ہے۔ سب نے تسلیم کیا ہے کہ یہ دیوان واقعی نہایت مکمل، جامع اور دلچسپ چیز ہے۔ اس کی خوبیوں اور جامعیت کے تناسب اور مبالغات بالکل کنائے میں مبالغہ کا شائبہ بھی میں نے نہیں پایا۔ بعض رثائیہ نظمیں جیسے مثلاً رثا ابیہ[357] قصائد بھی مناجاتیں (توبہ و تجوی) خضوع و خشوع کے تجرید و تفرد سے بھری ہوئی ایسی بھی ہیں[359] جن کا اہل دل پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ ایک کا مطلع و مقطع یہ ہے:-

عودی ندوی حبیبی ھوی عمری ارتحل

دھری انقضی وقتی مضی نجمی افل

میری خوشبو ختم ہو گئی۔ میری توانائی گزر گئی۔ میری عمر کوچ کر چکی۔ میرا زمانہ ختم ہو چکا۔ میرا وقت چلا گیا۔ میرا ستارہ ڈوب گیا۔

لا تقتضی ربی قصدتک تائبا

قلبی اختشی صوتی اختفی دمعی ھطل[360]

---

۳۵۷ ماتمی مرثیے کے طور پر۔ ۳۵۸ خدا پرستانہ۔ ۳۵۹ صفحات ۴۵۹، ۴۶۸، ۵۰۰ و ۵۰۴۔ ۳۶۰ صفحات ۴۹۵ و ۴۹۶۔

میرے پروردگار! (اپنے جوارِ رحمت سے) مجھے دور نہ کرنا۔ میں توبہ کرتا ہوا تیری بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں۔ میرا دل خوف زدہ ہے۔ میری آواز بیٹھ گئی ہے۔ میرے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔

ہر نظم سے پہلے اُس کی تخصیصی کیفیت 'داعیات [۳۶۱]' 'اسبابِ تحریر' اور ضرورت موقع کو بھی حوالۂ قلم کر دیا ہے۔ بعض تمہیدیں آمدہ رفتہ تحقیقات و فاضلانہ انکشافات کی جامع، فلسفیانہ دلائل و براہین سے مضبوط کئی کئی ورق پر پھیلی گئی ہیں۔

صفحہ ۵۹ نوٹ ۳۶۳۔

ٹیورنیر (TAVERNIER) ایک بڑا ہوشیار سیاح [۳۶۴] اور دہلی میں جواہرات کا سوداگر تھا۔ اس کا پہلا بحری سفر ۱۶۳۱ء میں شروع ہوا۔ وہ قسطنطنیہ سے اصفہان (فارس) تک سیاحت کرتا ہوا آیا تھا۔ ۱۶۳۳ء میں اپنے وطن فرانس کو لوٹ گیا۔ اُس کا ہندوستان کا سفر چوتھا سفر تھا جس کا زمانہ ۱۶۵۱ء سے ۱۶۵۵ء تک شمار ہوتا ہے۔ وہ ۱۶۵۳ء میں اسی ملک میں تھا [۳۶۲]۔ اس کے سیاحت نامہ کا اردو ترجمہ سلسلۂ آصفیہ دکن کی پہلی جلد ہے۔ آگرہ سے

---

[۳۶۱] طلب کرنے والے، اقتضا کرنے والے، خواہندہ۔ [۳۶۲] "تاریخ تاج انگریزی" از منشی معین الدین، صفحہ ۸۲"۔

۱۸۹۶ء میں شائع ہوا۔ منوچی نے اس شخص کا احوال بلکہ کچا چٹھا اپنی کتاب کے پانچویں حصہ (صفحات ۴۱ لغایتہ ۴۴) میں لکھ ڈالا ہے۔ ایک واقعہ نقل کر دینا کافی ہے۔

ٹیوڈنیر نے جب اپنے محسن اور عنایت فرما ہم قوم ڈاکٹر سے ساز باز کیا۔ فرانس میں شہنشاہ کی قدر شناسی کی امید دلائی۔ نئی نویلی حسین وجمیل دلھن کے مل جانے کا بھروسا ظاہر کیا تو ڈاکٹر صاحب پھولے نہ سمائے۔ اپنی بیوی کو زہر دلا دینے پر آمادہ ہو گئے۔ انتظام کر لیا۔ وہ ایک پرتگیز فرانسکو ڈی ساوزا FRANCISCO DE SOUZA کی لڑکی تھی۔ نیک بخت بوڑھی ماما کو رحم آ گیا۔ اس نے صلہ و انعام کی توقعات سے دستکش ہو کر وہ پوڑیا بیوی کے حوالہ کر دی' اور تمام باتوں سے خبردار کر دیا۔ بیوی شوہر کی حرکات ناشایستہ سے پہلے ہی سے بیزار رہتی تھی خاوند کی بدنیتی اور بدخواہی کے ساتھ ساتھ اُس کے اس فعلِ بد کا سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ اُسے یہ بھی خیال آیا کہ وہ اِسے سال بھر میں صرف ایک بار گرجا جانے کی اجازت دیتا ہے اور بھائی بہنوں اور رشتہ داروں سے ملنے بھی نہیں دیتا۔ اس نے سارا واقعہ اپنی پھوپھی میریا ڈی ٹیڈیہ کو لکھ بھیجا جو علی مردان خاں کی نومسلم بیوی تھی۔ زیادہ تفصیل یا بعد کے حالات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں

کہ ڈاکٹر صاحب پر کیا گزری۔ زنداں کو چلے گل پھل کرتے جیل خانے کیسے پہنچے
آل اولاد کے لئے کیا انتظام ہوا۔ اسی کتاب کے صفحات ۲۴۲ و
۲۴۳ شاہد ہیں۔

صفحہ ۹۰۔ نوٹ ۹۴

ہنری ٹامس کول بروک (COLE BROOKE) نے بیس
سال کی عمر میں سنسکرت پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ پندرہ سال بعد "مجموعہ قوانین
ہنود" کی تکمیل کی جس کا آغاز سر ولیم جونس نے کیا تھا۔ ۱۷۹۶ء میں
ایک دوسری کتاب "مضامین بر رسوم مذہبی ہنود" شائع فرمائی۔ بڑا
وسیع النظر مستشرق تھا۔[۳۶۳] ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے پہلے دہلی میں
ریزیڈنٹ رہا تھا۔[۳۶۴]

صفحہ ۹۴۔ نوٹ ۹۵۔ جوہر

راجپوت سپاہی جب دشمن کا غلبہ دیکھتے اور اپنی فتح سے ناامید
ہو جاتے تھے تو سب سے پہلے بچوں کو بے دریغ تہ تیغ کرتے۔ پھر عورتوں
کو زیور و لباس سے آراستہ و پیراستہ کر کے آگ کے کنڈ میں جھونک دیتے
تھے۔ پھر خود شمشیر بکف بڑھتے اور دشمن پر ٹوٹ پڑتے تھے۔[۳۶۵]

---

[۳۶۳] ویدک ہند، ترجمہ صفحات ۳۲ و ۶۱۔ [۳۶۴] یادگار غالب صفحہ ۱۰۔ الہ آباد۔ [۳۶۵] کرنل ٹاڈ
کی تاریخ راجستھان جلد اول صفحہ ۸ مقدمہ مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۲۰ء (باقی صفحہ آئندہ پر)

آج کل کی شائستگی اور تہذیب اس "جوہر" اس آخری قربانی کو" ایک نہایت
وحشیانہ رسم" سے تعبیر فرماتی ہے۔

بھائی پرمانند تاریخ راجستھان میں لکھتے ہیں کہ سبکتگین و محمود کو جے پال
نے کہلا بھیجا تھا کہ "ہم راجپوتوں کا قاعدہ یہ ہے کہ جب کبھی ایسا موقع آپڑتا
ہے ہم پہلے اپنے بال بچوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کر ڈالتے ہیں۔ مال اور دولت
کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اور پھر ایک دوسرے کے گلے لگ، تلواریں کھینچ
دشمن پر جا پڑتے ہیں ... ..."[366]

راجستھان کی تاریخ، محاصرۂ چتوڑ کے سلسلہ میں ایک بڑے اور زبردست
جوہر کا ذکر کرتی ہے۔ جس میں اکبر اور جے مل[367] مد مقابل تھے۔ اس جوہر میں کیا
کیا ہوا۔ "آٹھ ہزار راجپوتوں نے پان کے بیڑے منھ میں رکھ کر کیسری[368]
بانا پہن لیا۔ قلعے کے دروازے کھول کر سارے کے سارے دشمن کے
اوپر جا پڑے۔ حسب معمول عورتوں کے لئے چتا تیار کی گئی۔ فوراً رانیاں، اُن کی
پانچ لڑکیاں، دو شیر خوار بچے اور تمام بڑے بڑے سرداروں کی

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ایضاً، جلد اول، مطبوعہ ۱۸۷۳ء صفحہ ۲۲۲۔ خزانۂ عامرہ، نول کشوری،
صفحہ ۳۵۰۔ رسالہ ادب لکھنؤ دسمبر ۱۹۳۱ء، صفحہ ۳۶۔ [366] صفحہ ۱۸۸۔ [367] راجپوتوں
کی تاریخ میں "بہادروں کا بہادر" کر کے مشہور ہے۔ چتوڑ کی راجدھانی کی حفاظت میں ۱۵۶۸ء
میں خود اکبر کے ہاتھ سے مارا گیا۔ [368] زعفرانی لباس۔

استریاں آگے آگے بڑھ بڑھ کر چتا میں قدم رکھتی جاتی تھیں۔ اور بے عزتی کی زندگی پر موت کو ترجیح دیکر اپنے آپ کو بھسم کر رہی تھیں"۔ ۳۶۹

بھائی پرمانند "فتح چتوڑ" کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ اکبر کے دل میں اُس وقت تک وہ مذہبی فراخ دلی پیدا نہیں ہوئی تھی جو کہ اُسکی زندگی کے آخری حصہ میں دکھائی دیتی ہے۔ پچھلے سالوں میں جس جنیو کی اتنی عزت کرنے لگا تھا کہ برہمنوں کے ہاتھ سے خود پہنا کرتا تھا، اُسو قت اُس نے اپنی کامیابی کا وزن راجپوتوں کی گردنوں کے جنیو اُتار کر کیا۔ جو ساڑھے چوہتر من تول میں ہوئے۔ ایک من چار سیر کا تھا۔ تب ہی سے ۷۴ ½ کا ہندسہ میواڑ میں بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ ۳۷۰

میر غلام علی بلگرامی اس لفظ (جوہر) کے معنے "ضرورت عمل یعنی دشمن سے مغلوب ہوتے وقت اپنے اہل و عیال کو اپنے ہاتھ سے مار ڈالنا" اور اسکی غرض ہتک حرمت اور پردہ دری سے بچنا بچانا لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں جوہر جیم کے زیر سے مشہور ہے۔ برہان قاطع کا مؤلف جیم پر پیش بتاتا ہے۔ ۳۷۱

یہ جیوہر اپنے ہی لئے نہیں بلکہ غیروں اور بیگانوں کے لئے بھی کیا

---

۳۶۹ بھائی پرمانند، صفحہ ۳۵۱، بحوالہ کرنیل ٹاڈ۔ ۳۷۰ تاریخ راجستھان، صفحہ ۳۵۲۔
۳۷۱ خزانہ عامرہ، صفحہ ۳۵۰۔

جاتا ہے۔ ایک واقعہ پیش نظر ہے "کمپلی کے راجہ کے یہاں جب محمد تغلق کے بھتیجے بہاء الدین نے بغاوت کے بعد پناہ لی اور بادشاہ نے فوج بھیجی۔ وہ قلعہ میں پناہ گزیں ہوا۔ محاصرہ نے طول کھینچا۔ سامانِ رسد ختم ہوگیا۔ ایک سچے راجپوت کی طرح راجہ نے مرنے کا ارادہ کرلیا تو ایک بڑی بھاری چتا تیار کی گئی۔ اس میں اس کی رانیاں اور سرداروں کی بیویاں گر گر کر جل جل کر راکھ ہوگئیں" ۳۷۲ صفحہ ۹۵، نوٹ ۵۱

سلطان مرزا دانیال، اکبر کا منجھلا بیٹا ایک رانی کے بطن سے تھا۔ اجمیر میں ایک مشہور درویش شیخ دانیال کے گھر میں ۱۰ ستمبر ۱۵۷۲ء کو پیدا ہوا ۸ اپریل ۱۶۰۵ء یعنی یکم ذی الحجہ ۱۰۱۳ھ کو برہان پور میں انتقال کیا۔ مسٹر بیل اسکی ماں کو راجہ بھاری مل کچواہہ کی بیٹی بتاتے ہیں۔ ۳۷۳ تزک جہانگیری کے ترجمہ میں اُس کو "کنیز" لکھا ہے۔ دانیال کے مردانہ حسن وجمال اور شہ سواری کی بڑی تعریف کی جاتی ہے۔ خود جہانگیر نے بدرجۂ کمال سراہا ہے۔ وہ ہندی موسیقی اور سرود کا بڑا شائق و قدرداں تھا۔ کبھی کبھی خود بھی ہندی کے گیت موزوں کرتا اور اشعار کہہ لیتا تھا۔ مسٹر بیوریج کو تسلیم ہے کہ اس زبان سے کسی حد تک بیگانہ ہونے کے باوجود

---

۳۷۲ تاریخ مہاراشٹر، صفحہ ۶۸ ۳۷۳ ڈکشنری، صفحہ ۸۰۔

وہ زبان و محاورات میں غلطی نہیں کرتا تھا۔ اس کا کلام برا نہیں ہوتا تھا[۳۷۴]
جہانگیر کے الفاظ یہ ہیں "بہ نغمۂ ہندی مائل بود۔ گاہے بہ زبان اہل ہند
و بہ اصطلاح ایشاں شعرے می گفت' بد نہ بودے"[۳۷۵] اس کا فارسی
کلام بھی متین اور اچھا ہے۔

مولانا شبلی اس تحریر اور رائے سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جہانگیر خود
بھی برج بھاشا جانتا تھا اور اچھے برے کلام کے پہچاننے کی تمیز رکھتا
تھا۔[۳۷۶]

عبدالرحیم خان' خانِ خاناں کی لڑکی جانی بیگم اس کو بیاہی تھی۔

صفحہ ۹۷۔ نوٹ ۔ ۵۲

جان ملٹن UOHN MILTON ولادت ۱۶۰۸ء ۔ وفات
۱۶۷۴ء۔ "فردوسِ گم گشتہ و بازیافتہ" "PARADISE LOST AND
REGAINED" کا مشہور مصنف اور اپنے فن کا بے مثال استاد شہرۂ
آفاق ماہر۔ حاسد ناقدوں[۳۷۷] نے کسی وقت اس بد نصیب کو بھی (شاید
باکمال تو سب ہی بد نصیب ہوتے ہیں!) ہدفِ ملامت بنانا اور اسکے
کلام پر توارد و سرقہ کا داغ لگانا چاہا تھا۔ لیکن منصف مزاج اہل نظر

---

[۳۷۴] ترجمہ راجرس بیورنج مطبوعہ ۱۹۰۹ء' صفحہ ۳۰۶۔ [۳۷۵] تزک جہانگیری' صفحہ ۱۷' نول کشور۔ [۳۷۶] مقالات شبلی صفحہ ۱۹' برج بھاشا زبان۔ [۳۷۷] خالص اور اچھے برے کا پارکھنے والا۔

نے فیصلہ کیا کہ چند اشعار میں اس قسم کا سقم نکل آنے سے اُس کی بے مثل سخن سنجی اور اُسکی خوبیوں پر خاک نہیں ڈالی جا سکتی۔ جرمنی کے فیلسوف شاعر گوئٹے (GOETHE) کا فتوے ہے کہ کائنات میں کسی چیز پر بالکل نئی اور اچھوتی ہونے کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ سر والٹر ریلے[۳۷۸] (SIR WALTER RALEIGH) نے ایسی بحث یا دار و گیر کو "بہی کھاتہ والوں" کی نقادی سے تعبیر فرمایا ہے۔ مقبول خیرہ سر نے بھی اپنے ذکی الحس[۳۷۹] دوستوں سے ہمیشہ یہی عرض کیا ہے کہ ایسی موشگافیوں اور ہنگامہ آرائیوں سے اس کو بے لطف بنانا زیبا نہیں۔ یہ مخلوق و خالق اور عبد و معبود کے باہمی نازک مگر وسیع تعلقات کی لطیف و دلکش داستان ہے۔

اس کامیاب سخنور ملٹن اور اٹالیہ کے نامور شاعر دانتے DANTE نے دوزخ کی جو تصویر کھینچی ہے، اُس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس کے دروازہ پر کندہ ہے کہ جو شخص اس میں داخل ہو امید کو باہر چھوڑ آئے۔ ملٹن نے اس طویل فردوسی نظم میں اسی طرح کے اور بھی بہت سے سنجیدہ، عجیب و غریب، قابل غور خیالات موزوں کئے ہیں۔ ملٹن کا خاتمہ تنگدستی، فلاکت و عسرت میں ہوا۔ اس کے جیتے جی

---

۳۱۸ مورخ و شاعر۔ وِلادت ۱۵۵۲ء وفات ۱۶۱۸ء ۳۱۹ تیز طبع زیرک، دانش مند۔

"فردوس گم شدہ" اُس کے کام نہ آیا۔ سیّاح عالم شاعر عرب لوئیس بک الصابنجی نے ایک قصیدہ میں اُس کے حال پرخوں کے آنسو بہائے ہیں۔

فکان فرید العصر "ملتن" یشتکی   من الجوع والافلاس فی کل لیلۃ
وضیع فردوسا" وباع قریضۃ   باحقر اسعار واَبخس فضۃ
ومات ضریراً بالبلایا مکبلاً   وخلد ذکراً لایموت بجفنۃ [۳۸۰]

(ترجمہ) ملٹن یکتائے روزگار تھا۔ بھوک کا اور پیسہ کوڑی پاس نہ ہونے کا ہر شب گلہ کیا کرتا تھا۔

اس نے فردوس کو گم کردیا۔ اور اپنے اشعار کو حقیر ترین نرخ اور تھوڑی سی چاندی کے بدلے بیچ ڈالا۔

اور نابینا مرا، بلاؤں میں جکڑا ہوا۔ اُسکی یاد ہمیشہ رہے گی سالہا سال گزر جانے پر بھی نہیں مرے گی۔

ملٹن چارلیس دوم (CHARLES II) کے عہد کا ایک ممتاز رتن تھا۔ "فردوسِ مفقود" کے بعد اُس نے اپنا دوسرا جواہر پارہ "سیمسن" (SAMSON) شائع کیا۔ پھر تو اس پر مذہبی سودا اس درجہ غالب آگیا کہ جو کچھ ارادے تھے سب ختم ہو گئے اور اس نے اپنی تمام تجویزوں کو بھلا دیا۔ وہ مذہبی منظومات و تنظیمات میں مشغول

---

[۳۸۰] دیوان شعر النخلہ، اسکندریہ، سنہ ۱۹۰۱ء، صفحہ ۲۸۶۔

ومنہمک ہو گیا۔ ملٹن انگلستان کا پیوریٹن شاعر (THE PURITON POET OF ENGLAND) کہلاتا ہے۔ [۳۸۱]

انگلستان کے زبردست نامور شاعر کاؤپر (COWPER) کے مقبولِ عام خطوط میں ۴ر فروری ۱۷۹۳ء کا لکھا ہوا ایک خط ولیم ہیلی (WILLIAM HAYLEY) کے نام پر ہے۔ لکھنے والے نے اس کی سرخی رکھی تھی "ملٹن کا خواب" (A DREAM OF MILTON) اس میں اس کے گم گشتۂ فردوس پر بھی نگاہ ڈالی ہے۔ اور ذکر کیا ہے۔ ورڈسورتھ (WORDSWORTH) [۳۸۲] نے ملٹن کے اس دنیا سے اٹھ جانے پر جو تعلق کیا تھا اور غم والم کے آنسو بہائے تھے، ایک رثائیہ نظم (مرثیہ) میں ہنوز محفوظ ہیں۔ یہ صدائے درد لندن سے ۱۸۰۲ء میں بلند ہوئی تھی۔ اسی باکمال نے اپنے دیگر اشعار اور تحریرات میں بھی ملٹن کو یاد کیا ہے۔ وہ کرب واندوہ سے بے اختیار و بے قابو نظر آتا ہے۔

---

۳۸۱ پیوریٹن۔ ملکہ الزبتھ اور پہلے دونوں اسٹوارٹ بادشاہوں کے عہد میں انگلستان کے گرجا کے منکروں کا یہی نام رکھ لیا گیا تھا۔ وجہ تسمیہ (طنزیہ و تمسخریہ) یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ لوگ اپنی انتہائی پاکیزگی اور اپنے اصول کی بلندیوں کے قائل اور مدعی تھے۔

۳۸۲ پیدائش ۷ر اپریل ۱۷۷۰ء۔ موت ۲۳ر مارچ ۱۸۵۰ء WORDSWORTH AND HIS POETRY PAGE 157, LONDON, 1921, BY W.H. HUDSON.

ملٹن کی رثائیہ نظم لاسی ڈس " LYCIDAS " بڑی قدر و تحسین کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔

ہمارے دانش آموز و دور اندیش اکبر الہ آبادی نے بھی اپنے طنزیہ و ظریفانہ رنگ میں ملٹن کو یاد کیا ہے:-

فخریہ میں نے جو اشعار پڑھے سعدی کے فخریہ وہ بھی سنانے لگے نظم ملٹن

شیخ سعدی تو بزرگوں میں ہیں تھے اے دوست
آپ کے کون تھے ملٹن، میں سنوں حضرتِ من

صفحہ ۱۰۱۔ نوٹ ۵۳۔ مرزا غازی بیگ ترخاں

مرزا جانی والی ٹھٹہ کا بیٹا تھا۔ مرزا جانی سنہ ۱۰۰۱ھ (۱۵۹۲ء) میں دربار اکبری میں پہنچایا گیا۔ پھر کبھی ہندوستان سے سندھ آنا اس کو نصیب نہیں ہوا۔ جانی نے غازی کو ٹھٹہ میں چھوڑا تھا۔ اکبر نے جب ٹھٹہ مرزا جانی کے حوالہ کیا تو مرزا غازی کو نیابت عطا کی۔ جانی نے سنہ ۱۰۰۸ھ (۱۵۹۹ء) میں برہان پور میں انتقال کیا تو بادشاہ نے مرزا غازی پر الطاف شاہی بدستور مرعی و مبذول رکھے اور ولایت سندھ اس کے حق میں پھر چھوڑ دی۔ ۳۸۳ سنہ ۱۰۱۱ھ (۱۶۰۲ء) میں سعید خانِ چغتا انتزاع

---

۳۸۳ مآثر الامرا، جلد سوم صفحہ ۳۴۵۔ خزانۂ عامرہ، آزاد بلگرامی، صفحہ ۲۵۹۔ تاریخ فرشتہ مقالہ ہشتم، صفحات ۳۲۲، ۲۶۸۔

سندھ کے لئے مامور ہوا۔ مرزا غازی نے حلقۂ اطاعت آویزۂ گوش کیا جگر تک گیا اور سعید خان کا استقبال کیا۔ اُس کے ساتھ درگاہِ اکبر میں پہنچا۔ بادشاہ نے ملکِ سندھ کی حکومت پر بحال کر دیا۔ عہدِ جہانگیر میں ملتان بھی مرحمت ہوگیا۔ آخر میں صوبہ داری قندہار پر بھی سرفراز رہا تھا۔ وہیں پچیس ۲۵ برس کی عمر میں سنہ ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ء) میں پیمانۂ حیات لبریز ہوگیا۔ زہر دیا گیا تھا۔ مرزا غازی شاعر بھی تھا۔ "وقاری" تخلص کرتا تھا۔ سنہ ۳۸۴

مرزا جانی اور اکبر کے محاربات اور مصالحت اوراقِ تاریخ پر تفصیلاً مندرج ہیں۔ شعرائے ان کو اور بھی چمکا دیا تھا۔

ترخان کے بارہ میں پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب "سیاحت روس" میں لکھتے ہیں کہ "ترکھان" روس کی یونین میں اب بھی ایک اہم جزو رکھے جاتے ہیں۔ اگرچہ کان کن یا مستریوں سے ان کی عزت کچھ زیادہ نہیں۔

چراغ ہدایت میں تحریر ہے کہ ترخان کا منصب سلاطین ترک سے ملتا تھا۔ اس کا عہدہ دار نوکری کے تمام تکلفات سے آزاد و معاف رکھا جاتا تھا۔ اس سے کوئی پرسش نہیں ہوتی تھی۔ صرف چند ایسی تقصیرات

---

۳۸۴ سروِ آزاد، صفحہ ۴۰ ۔ و تاریخ طاہری از میر طاہر محمد نسیانی، قلمی ۔ تاریخ فرشتہ مقالۂ ہشتم، صفحہ ۳۲۲

تھیں جن کے ارتکاب پر پاداشِ جرم میں شخص ماخوذ واجب القتل ہوجاتا تھا۔ [۳۸۵]

مرأۃ الاعلام فی ماثر الکرام میں بحوالہ تاریخ بخارا (انگریزی) مصنفہ آرمینس وامبری (A. VAMBERY مطبوعہ لندن) تحریر ہے کہ 'ترخان' ایک پرانا ترکی لقب اعزازی ہے۔ اس خطاب کے لوگ ادائے ٹیکس سے معاف تھے۔ پرانے ترکی کاغذات میں لفظ 'ترگو' کے معنی امان نامہ و سند امارت کے ہیں۔ اور زبان منگولین میں ترخالاکہو کے معنی کسی شخص کو کسی قسم کا استحقاق عطا کرنے کے ہیں۔ [۳۸۶]

مولانا سید سلیمان ندوی لغاتِ جدیدہ (صفحہ ۱۰۵) میں لکھتے ہیں کہ "طرخان" افسر، رئیس یا شہزادہ کو کہتے ہیں۔ یہ ترکی لفظ ہے۔ اس کی جمع عربی وزن پر طراخنہ آتی ہے۔

آزاد دہلوی نے دربار اکبری میں تحریر کیا ہے کہ تیموری خاندان کے باغی شاہزادے "مرزا" کہلاتے تھے [۳۸۷]

مرزا غازی اور اس کے باپ کی قبر ٹھٹھ کے قریب مکلی پہاڑی کے دامن میں واقع ہے۔ بعض اور مرزایان بھی وہیں دفن ہیں۔ [۳۸۸] تعمیر ۱۰۹۵ھ ۱۶۸۴ء

---

[۳۸۵] صفحہ ۵۳۔ [۳۸۶] معروف بہ تذکرۂ مشاہیر کاکوری صفحہ ۹۶۔ [۳۸۷] حیاتِ جلیل، حصہ دوم صفحہ ۱۲۵ نوٹ ۱۰۱۔ [۳۸۸] سرگذشت لطف اللہ انگریزی صفحہ ۱۹۔۳

مرزا جانی خود بھی بڑا با کمال امیر اور قدر دانِ اہل کمال تھا۔ مرزا نے مصالح ملکی و ذاتی پر نظر ڈال کر خانِ خاناں سے صلح کر لی تھی۔ اپنی ریاست شاہی کار پردازوں کے حوالہ کر کے خانِ خاناں کے ہمرکاب دربار اکبری کو چلا۔ یہاں پہنچا تو اُس کی قدر و منزلت کی گئی۔ خانِ خاناں کے مقبول و محبوب شاعر مُلّا شکیبی (محمد رضا) اصفہانی نے اس فتح کی خوشی اور اعلانِ مسرت میں ایک مثنوی لکھی۔ جس کا ایک شعر یہ تھا:۔

ہمائے کہ بر چرخ کردے خرام گرفتی و آزاد کردی ز دام

خانِ خاناں نے اس کے صلہ میں ایک ہزار اشرفیاں مُلّا کو عطا کیں۔ اور مرزا نے بھی ایک ہزار دیں۔ اور کہا کہ تم پر خدا کی رحمت ہو تم نے مجھے ہُما کہا۔ اگر شغال (گیدڑ) کہہ دیتے تو تمہاری زبان کون پکڑ سکتا تھا۔[۳۸۹]

آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ ہمارے وقت میں ایک ہزار اشرفیاں پندرہ ہزار روپیہ کے برابر ہوئیں۔

مرزا غازی کی تعلیم و تربیت بڑے سلیقہ سے کی گئی تھی۔ وہ شروع عمر ہی سے علوم و فنون میں کمال حاصل کر چکا تھا۔ جوانی میں اور بھی

---

۳۸۹ خزانۂ عامرہ، صفحات ۲۵۹ و ۲۶۰ نول کشور۔

ترقیاں نصیب ہوئیں۔ قلم اور تلوار دونوں پر قادر تھا۔ بڑا شاعر زبردست سپاہی تھا۔ ہنرمند سپہ سالار۔ دوراندیش۔ مشیر اور تجربہ کار منتظم و مدبر تھا۔[۳۹۰] کسی عالی مرتبت انسان کے لئے جو الفاظ توصیفی استعمال ہو سکتے ہیں، ڈاکٹر بینی پرشاد نے تاریخ جہانگیری میں اس کے لئے ان سب کا استعمال کرنے سے دریغ نہیں فرمایا۔

اسکو علوم تاریخیہ سے بڑی دلچسپی تھی شغف تھا۔ روم کے لوگوں کے مشہور و معروف فلسفی اور بلیغ و فصیح خطیب سسرو (CICE-RO) کی طرح یہ بھی کہا کرتا تھا التاریخ ابو العلوم (تمام علموں کا باپ تاریخ ہی کا علم ہے۔)

صفحہ ۱۰۵ نوٹ ۸۴ - مصوری

بقول مہامہو پادھیائے اوجھا "ہندوستانی اور مغربی فن تصویر کے رنگ بھی جدا جدا ہیں۔ مغربی فن تصویر کا معیار حسن ہے۔ ہندوستانی فن تصویر کا محسوسات باطن۔ ہمارے اہل کمال حسن ظاہر کے نازبردار نہیں۔ وہ اس کی باطنی کیفیات کا اظہار کرنا ہی اپنے فن کی معراج سمجھتے ہیں"[۳۹۱] مسٹر ای۔ بی۔ ہیول (E.B. HAVELL) لکھتے ہیں "یورپ کی تصویریں پژمردہ سی معلوم ہوتی ہیں کیونکہ اہل یورپ

---

[۳۹۰] صفحہ ۱۷۰۔ [۳۹۱] صفحہ ۴۳ "قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب"۔

صرف حُسنِ مادّی ہی کے شیدا تھے۔ ہندوستانی فنِ تصویر حقیقی کیفیات اور ملکوتی جذبات کا ترجمان ہے" [۳۹۲]

مولوی عبدالباری آسی نے شرح دیوانِ غالب میں تحریر کیا ہے:۔

"ان مصوروں کا کمال مرئی اور مادّی چیزوں تک منحصر اور محدود ہے۔ غیر مرئی چیزوں کی تصویر اگر مصور کھینچے گا تو وہ بھی ایسی کہ جس کے دیکھنے سے اس کی حالت پر پورا پورا عبور غیر ممکن ہو۔ اس سے مراد جذبات ہیں۔ یعنی فرض کر لیجئے کہ غصہ، تمکنت، غرور، سادگی، متانت، اجڑے ہوئے کھنڈروں کے نقشے، ہرے بھرے باغوں کی سرسبزی اور رواں بہتے ہوئے چشمے کی روانی وغیرہ کو ایک چابک دست مصور کھینچ سکے تو یہ کیسے ممکن ہو کہ غصہ، تمکنت، غرور، سادگی کے وجوہات بشاشت و قلق کے اسباب اور ان کے اجڑ جانے کے اوقات، دریا کی روانی کے ساتھ ساتھ اس کے عمق وغیرہ کو بھی دکھا سکے۔ [۳۹۳]

صفحہ ۱۰۶۔ نوٹ ۵۵

شمس الدین التمش حافظہ بھی عجیب و غریب رکھتا تھا۔ ملا قاسم ہندو شاہ اپنی تاریخ (فرشتہ) میں نقل کرتا ہے کہ "ایک شاعر ناصری

---

[۳۹۲] انڈین اسکلپچرس اینڈ پینٹنگس، صفحہ ۸۸ INDIAN SCULPTURES AND PAINTINGS.

[۳۹۳] صفحہ ۲۰۔

تخلص ماوراء النہر سے دہلی میں آن کر خواجہ قطب الدین (بختیار کاکیؒ)
کے مکان پر وارد ہوا اور عرض کیا کہ میں نے ایک قصیدہ شمس الدین
کی مدح میں کہا ہے امید وار دعا ہوں کہ اس کا صلہ خوب پاؤں۔ خواجہ نے
سورۂ فاتحہ پڑھ کے فرمایا انشاء اللہ تعالے انعام پاؤ گے۔ ناصری نے دربار
میں جا کر وہ قصیدہ پڑھنا شروع کیا جس کا مطلع یہ ہے :-

اے فتنہ از نہیب تو زنہار خواستہ   تیغ تو مال و فیل ز کفار خواستہ

شمس الدین التمش اُس وقت دوسری طرف متوجہ تھا۔ ناصری نے
مضطرب ہو کر خواجہ کو شفیع لا کر ہمت چاہی۔ فوراً بادشاہ ناصری کی
طرف متوجہ ہو گیا اور فرمایا "ہاں پڑھو۔"

اے فتنہ از نہیب تو زنہار خواستہ   تیغ تو مال و فیل ز کفار خواستہ

ناصری نے جب دیکھا کہ باوجود مشغولی کے شاہ نے ایک ہی بار
مطلع سن کر یاد رکھا تو پھر تمام قصیدہ پڑھ ڈالا۔ شمس الدین نے فرمایا کہ
ایک بار اسے اور پڑھ دو۔ پھر ترپن ہزار تنکۂ نقرہ ناصری کو
مرحمت کئے۔ [۳۹۴]

نہیب۔ ہناب کا امالہ۔ اس عربی لفظ کے معنی ہیبت، ڈر، بیم اور عظمت کے
ہوتے ہیں۔ ہیب آواز اور لوٹ مار کو بھی کہتے ہیں۔ [۳۹۴] ترجمۂ نول کشوری، بار چہارم،
۱۹۱۴ء، صفحات ۵۸۱ و ۵۸۲۔

شمس الدین کا نام ہندوستان کے خود مختار سلاطین کے ذیل میں آتا ہے۔ اسی نے ہندوستان کی مملکت کو ایک مستقل سلطنت کے قالب میں ڈھالا تھا۔ خلیفۂ عباسی بغداد نے اس کے لئے خلعت بھیجا تھا۔ اس نے اپنا لقب ناصر امیر المومنین یعنی "امیر المومنین کا مددگار" اختیار کیا تھا۔ یہی لقب سکّوں پر بھی نقش کرا دیا تھا۔ [۳۹۵]

ابو المظفر شمس الدین التمش کے عہد امارت کی متعدد عمارتیں اب بھی ہمارے سامنے موجود ہیں۔ بدایوں کی جامع مسجد کو لیجئے جو ۶۲۰ھ (۱۲۲۳ء) کی تعمیر ہے۔ اسی کے پیچھے مدرسہ معزی تھا۔ جو سلطان معز الدین محمد سام سے منسوب ہے۔ [۳۹۶] پھاٹک کا اضافہ بعہد ابو المجاہد محمد بن تغلق شاہ ۷۲۶ھ (۱۳۲۵ء) میں ہوا۔

اکبر اعظم کے عہد میں شہر بدایوں میں عظیم آتش زدگی ہو گئی تھی جس کا ماتم ملا عبد القادر بدایونی نے ایک نظم میں فرمایا تھا۔ سر آغاز یہ ہے:۔

چہ پرسی از بداؤن و ز احوال پریشانش
کہ آیاتِ عذاب النار نازل گشتہ در شانش

اس کا اثر مسجد کی عمارت پر بھی پڑا تھا۔ گر درستی و اصلاح جلد سے جلد ہو گئی۔

---

۳۹۵ معارف نمبر ۶ جلد ۶ ماہ دسمبر ۱۹۲۰ء۔ ۳۹۶ تاریخ فرشتہ، نول کشوری، جلد اول صفحہ ۶۵

صفحہ ۱۰۹ - نوٹ ۵۹

منشی دوارکا پرشاد کا بالمیکی کی رامائن کا اردو ترجمہ ایک قافیہ کی تمیوست کے ساتھ ایک لاجواب کارنامہ ہے۔ اسی طرح مہا بھارت کی جلدیں بھی۔ ستمبر ۱۹۱۳ء میں باون سال کی عمر میں انتقال کیا۔^۳۹۶ افق خاندانی شاعر تھے۔ دادا منشی ایشری پرشاد "شاقی" تخلص کرتے تھے۔ باپ منشی پورن چند کا تخلص "ذرہ" تھا۔ ان کی فارسی غزلوں پر مرزا ہرگوپال تفتہ (شاگرد رشید حضرت غالب) نے متعدد دو غزلے لکھے ہیں۔^۳۹۸ منشی دوارکا پرشاد کے بھائی منشی رام سہائے "تمنا" اپنی خدمات علمی و تعلیمی و ادبی اور تصانیف و اخبارات کے باعث نہایت مشہور و نامور گزرے ہیں۔^۳۹۹ افق کے باکمال صاحبزادے منشی بشیشور پرشاد "منور" نے بھی خاصی شہرت حاصل کی ہے۔ "نذرانہ" اور "نسیم عرفان" یعنی بھگوت گیتا منظوم ان کی یادگار ہے۔

ع - ایں خانہ تمام آفتاب است

---

^۳۹۷ ہندو شعراء خواجہ عشرت صفحات ۱۶، ۱۷، ۱۱۰۔ ^۳۹۸ دیوانِ تفتہ صفحات ۴۵۴، ۱۴۱، ۵۔ ^۳۹۹ ہندو شعراء صفحہ ۳۹۔

صفحہ ۱۱۳ - استدراک

"تدارک[1] مافات کے طور پر سینہ بند کے بارہ میں دو چار باکمالوں کی تحقیق یا خیال (جو کچھ اس وقت مستحضر ہے) یہاں حوالۂ قلم کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

۱- پروفیسر حیدر یار جنگ طبا طبائی جو ایک خوش فکر، نفاست پسند اور محتاط ناقد تھے "آتش کے اسی شعر "کسی کی محرمِ آب رواں" کے متعلق "شرح دیوانِ غالب اردو" (مطبوعہ انوار المطابع لکھنؤ) میں لکھتے ہیں۔ گو لفظ محرم ہندی نہیں ہے لیکن انگیا کے معنی پر ہندی ہی۔ پھر اسے اضافت فارسی کیوں دی؟ حالانکہ محرم کے لئے فارسی اور عربی میں کوئی لفظ نہیں ہی۔ شا با کچہ و دِرع[2] و مجول[3] اور وضع کے لباس ہیں کہ ان کی وضع میں اور محرم میں ضرور فرق ہی۔ اور محرمِ فصحا کا بنایا ہوا لفظ ہی۔" موصوف نے مرزا غالب کی مشہور اور عام پسند غزل (پھر کچھ اس دل کو بے قراری ہی)

پر توجہ کرتے وقت عدالت و فوجداری و سر رشتہ داری وغیرہ پر اعتراض کیا تھا کہ یہ اصطلاحیں ابھی تک فصحا کی زبان پر مکروہ ہیں۔ ان کا قوام[تھی]

---

[1] تدارک۔ ضائع شدہ کو پالینا۔ سینہ ا لنا۔ [2] دِرع۔ پیراہن زنان۔ (صراح)۔

[3] مجول۔ بالکسر۔ ایک قسم کا کپڑا جس کو صدرہ کہتے ہیں۔ سا ما کچہ صدرۃ۔ سینہ پوش، صدری، ویسٹ کوٹ، چھوٹا کرتا۔

درست نہیں ہوا۔ عدالت اور فوجداری کی نسبت فرماتے ہیں کہ ان معنی کے لئے دارالقضا و احتساب موجود ہیں اور فصحا کے بنائے یہ الفاظ ہیں۔

(۲) مولانا اوحدالدین بلگرامی (متوفی ۱۲۵۳ھ) نفائس اللغات[لہ] میں فرماتے ہیں۔ انگیا بفتح اول، وہ کپڑا ہوتا ہے جس کو عورتیں سینہ پر باندھتی ہیں اور ہندوستان میں اسکی تیاری میں طرح طرح کے تکلفات کام میں لائے جاتے ہیں۔ عربی میں اس کا کوئی نام نہیں ہے۔ اس لئے کہ عرب میں یہ لباس ہی نہیں ہوتا۔ فارسی میں اسکو ساماکچہ (سین پر زبر) اور ساماخ (سین معجمہ کے ساتھ) اور شاماکچہ ہے (کاف عربی کے ساتھ جو خاصہ معجمہ کی بجائے ہے) اور شاماکی بروزن چالاکی کہتے ہیں۔ یہ برہندہ و سینہ بند بھی کہلاتا ہے۔ بازبک (زائے معجمہ کے ساتھ) بھی۔ حکیم صادق گیلانی کا شعر ملاحظہ ہو۔

زجنبشِ نفس ہزیمت چہ باشی در رزم
ترا زخود و سپر سینہ بند و مغجر بہ

[لہ] تصنیف ۱۲۵۳ھ مطبوعہ ۱۲۸۱ھ مطبع مصطفائی صفحہ ۲۵۔ ہے ساماکچہ اور شاماخچہ، صراح، برہان، غیاث وغیرہ میں سینہ بند زنان کے معنی میں لکھا ہے۔ ہے مغجر۔ مقنعہ و ردو پوشش زنان۔

(۳) شیخ غلام ہمدانی مصحفی جو چوتھے دور کے مایۂ افتخار شعرا اور کثیر التلامذہ اساتذہ میں سے تھے، امروہہ میں پیدا ہوئے۔ آغاز جوانی سے دلی میں رہے۔ اسی اجڑے دیار کو اپنا گھر بتلاتے ہیں۔ بقیہ عمر لکھنؤ میں گزاری۔ وہیں (۱۲۴۰ھ میں) فوت اور پیوند خاک ہوئے۔ فرماتے ہیں :-

نہ ترے حسن کے دن اور نہ بہاریں وہ رہیں
نہ وہ چالیں نہ وہ تحرم نہ ادائیں وہ رہیں

(۴) صاحب غیاث نے صُدرہ کو بالضم بمعنی سینہ پوش و بمعنی کرتہ خورد و پیراہن نیم تنہ وغیرہ آں لکھا ہے۔ صراح اللغات میں بجول بالکسر و صُدرہ، سرسینہ و شانچہ تحریر ہے۔ اس بارہ میں کچھ پتا نہ چلا میں اب یہ لباس ہوتا ہے اور اس کا کوئی نام مقرر ہے؟ تحقیق و تجسس کی گئی۔ دریافت ہوا کہ لڑآباد ہندوستانی بی بیاں تو اپنی پرانی وضع اور ملکی پوشاک پر قائم رہتی ہیں اور اس کپڑے کا استعمال کرتی ہیں۔ ورنہ عرب العربا خواتین اس کی جگہ با اس ضرورت کے واسطے صرف ایک شلوکہ پہنتی ہیں۔ وہی پستان پوش ہو جاتا ہے۔

(۵) تیرہ چودہ سو برس سے ایک سادہ وضع کا نادوختہ کپڑا

ماخذ آب حیات۔ صفحات ۲۵۱ و ۲۲۵۔

مسلمان عورتوں کے کفن یعنی آخری پنج گانہ لباس کے ایک جزو لازمی کے طور پر چلا آتا ہے جس کو بعض محدثین کرام اور فقہائے عظام نے "خرقہ" سے موسوم فرمایا ہے۔ یہی عجم میں عموماً کفن کے "سینہ بند" سے معروف ہے۔ ایسا بے سلا ہوا ٹکڑا احرام کی تعریف میں نہیں آتا نہ اُس کا مماثل ہو سکتا ہے۔ بالخصوص اس حال میں کہ یہ پانچواں جزو کفن بروایت صحاح یشد بہا الفخذین والورکین تحت الدرع یعنی زیر پیراہن زن دونوں رانیں اور دونوں سرین استوار کر دینے کے کام آتا ہے۔ البتہ فقہی کتابوں میں ہے کہ خرقہ سے میت کی دونوں چھاتیاں باندھی جاتی ہیں۔ یربط بہا ثدیاہا۔ اہل لغت نے خرقہ کی تعریف بھی یہی کی ہے۔ " پارہ و جامۂ پارہ زدہ "

صفحہ ۱۲۲۔ نوٹ ۷۵۔ جیحون

پرانے جغرافیہ نویسوں کی تحریر کے موافق یہ دریا خراسان اور ماوراء النہر کے درمیان، بلخ کے قریب بہتا تھا۔ اہل لغت تائید کرتے ہیں۔ احمد زکی پاشا مصری "قاموس الجغرافیۃ القدیمہ" میں بحوالہ کتاب "المشترک" یاقوت کے "اسکو سیحان" یا "سیحون" لکھتے ہیں۔ (صفحات ۱۵۱ و ۲۰۷) کچھ حالات تاریخ ماوراء النہر مولفہ محمد تقی خاں

حکم" مطبوعہ بمبئی ۱۲۱۰ھ میں بھی ملتے ہیں۔

صفحہ ۱۲۲ - نوٹ ۵۸ "ایران"

ایران ہمیشہ سے غیر اقوام کا جولاں گاہ چلا آیا ہے۔
آج کل بھی اہل فرنگ کی کشاکش اور ترکتاز سے محفوظ نہیں۔ اسکندر مقدونی کی لشکر کشی اور دارا سے ایران دیار کا معرکہ بھی تاریخ پڑھنے والوں کو یاد ہو گا۔ پھر بھی، بیرونی حملہ آوروں اور ان کی حکومتوں کے ہوتے ہوئے ایرانیوں نے اپنے ملکی تمدن و تہذیب میں کبھی فرق نہیں آنے دیا۔ اپنے آریائی طور طریقوں پر مضبوطی اور آن بان سے قائم رہے۔ اس پر مسلمانوں کا قبضہ خلافتِ راشدہ کے دسویں سال میں ہو گیا تھا۔ اس کے بعد مسلم حکمرانوں کا دارالحکومت تو بغداد بنا اور رہا۔ لیکن عربی زبان اور عربی تمدن نت۲۳ و ثقافت ۱۰۱ کا ملک پر پورا اثر پڑ گیا تھا۔ بغداد کے زوال کے بعد ایک ترکی قبیلہ نے ایران پر قبضہ کیا۔ پھر غزنوی خاندان نے۔ ان کی جگہ سلاجقہ نے لی۔ جو ڈیڑھ سو برس تک قابض رہے۔ پھر خوارزم والے آگئے۔ ان کو چنگیز خاں ۲۰۲ نے

نت۲۳ شہر کا انتظام کرنا۔ ۱۰۱ دانا ہونا۔ استوار ہونا، چست ہونا۔ ۲۰۲ ولادت ۵۴۹ھ (۱۱۵۴ء) وفات رمضان ۶۲۴ھ (اگست ۱۲۲۷ء)۔

تباہ کیا۔ آخری بربادی ہلاکو[۱] کے ہاتھوں ہوئی۔

سولھویں صدی مسیحی کے آغاز میں ایرانی قومیت نے اپنا جھنڈا بلند کیا۔ غیر ملکی حکومتوں کو صاف کر دیا۔ صفویوں کا خاندان، جو ساتویں امام حضرت موسیٰ کاظمؑ کی نسل اور شیخ صفی الدین اردبیلی (ایک درویش) کی اولاد سے تھا، ۹۰۸ھ (۱۵۰۲ء) سے ۱۱۳۷ھ (۱۷۲۴ء) تک برسر حکومت رہا۔ یہ بادشاہ فنِ تعمیر کے بھی بادشاہ تھے۔ شاہ عباس نے اپنے دارالسلطنت اصفہان کو اپنے پیش نظر از سرِ نو آباد کیا تھا۔

ع۔ رہے نام باقی بس اللہ کا

افغانوں نے بغاوت کی۔ ان کے ہاتھ سے صفوی خاندان بھی رخصت ہو گیا۔ ایک صدی تک طوائف الملوکی کا زور شور رہا۔ بدیسی قومیں اور حکومتیں بھی غافل نہیں بیٹھی تھیں۔ ہر ایک ایران میں قدم جمانے اور اپنا سکہ چلانے کی کوششوں میں مصروف رہی۔

[صفوی خاندان کے عروج کے لئے کرنیل سائیکس SYKES کی تاریخ ایران جلد دوم صفحات ۲۳۰ لغایۃ ۲۵۵ اور شاہ عباس کے احوال کے واسطے جلد مذکور صفحات ۲۵۶ لغایۃ ۲۹۵ ملاحظہ طلب ہیں]

---

[۱] دوسرا نام انجان تھا۔ تاتاری چنگیز خاں کا پوتا اور چوتھا جانشین تھا۔ اسکے افعال و اعمال و احوال ایک مستقل مقالہ میں بھی نہیں آ سکتے۔ وفات به ماه ربیع الثانی ۶۶۳ھ یعنی فروری ۱۲۶۵ء۔

صفحہ ۱۲۳ - نوٹ ۵۹

اس بدنام اور وحشی قوم "تاتاری" نے علوم و فنون ادب و انشا کی اشاعت میں جو حصہ لیا ہے اس کی ایک اور نئے شاہد مشہور مستشرق پروفیسر ای۔جی براؤن (E.G. BROWNE) کی کتاب "تاتاری عہد حکومت میں ادبیات ایران کی تاریخ" ہے۔ جو کیمبرج یونیورسٹی نے چھاپی ہے۔ تاریخ کہ وہ تاتاری سیلاب یاد ہے جس نے کبھی تمام ممالک اسلام کو کم و بیش زیر و زبر کر ڈالا تھا جس کی لہریں سواحل شام تک پہنچی تھیں۔ اور با لفاظ مورخین "ان تاتاریوں نے پچاس لاکھ فرزندانِ توحید کا خون کیا تھا۔ بحیرۂ خوارزم شاہ (یورال سی) سے دجلہ تک" ۳۰۴ ؎

مولانا شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے "فتوح الغیب" کی شرح میں شیخ ابوالمعالی ۳۰۵ ؎ کی ایک غزل نقل فرمائی ہے۔ میں اس کا یہ شعر

---

۳۰۴ ؎ سیرت امام ابن تیمیہ غلام رسول مہر لاہور صفحہ ۲۸ - نفائس الفنون میں ہلاکو کے قبضہ اور تباہی بغداد کا سال ۶۵۶ھ لکھا ہے۔ ۳۰۵ ؎ ابوالمعالی محمد صدرالدین کی نسبت ترکوں کا دعویٰ ہے کہ وہ ہمارے شعرا میں سب سے پہلے تھے۔ ان کے بعد یعنی دوسرے نمبر پر عاشق پاشا تھا جو ان سے بھی بڑھ گیا اور بڑی شہرت حاصل کی۔ ابوالمعالی کا کلام ان کی زبان ترکی کے سوا عربی میں بھی موجود ہے اور خوب ہے یہ فارسی میں (باقی صفحہ ۳۲۹ پر)

حسب حال پاتا ہوں۔ شاید یہی واقعہ عظیم اُس وقت زیر نظر ہے۔

آں ترکِ عجم چوں زپئے حسن طرب کرد
بر پشت سمند آمدہ و صیدِ عرب کرد
چوں کاکلِ ترکانہ برانداخت ز مستی
غارت گریِ کوفہ و بغداد و حلب کرد

آج بھی تاتاری مسلمان ہمارے ہندوستان کے مسلمان بھائیوں سے کہیں زیادہ جاہل، متعصب اور تقلید پرست ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۳۲۸) ناصر الدین کے مقابل و حریف سمجھے جاتے ہیں۔ مولانا جلال الدین رومی اور ان کے باکمال فرزند مولانا ولد علیہما الرحمتہ ان کے معاصر تھے۔ ابو المعالی نے ۶۶۹ھ (۱۲۷۰ء) کے قریب وفات پائی۔ جرمنی کا وسیع المطالعہ تذکرہ نگار بیرن فان ہیمر (BARON VON HAMMER) لکھتا ہے کہ ابو المعالی کے اہل وطن ان کو خالص ترکی شاعر نہیں مانتے لیکن جو متصوفانہ رنگ و طرز انھوں نے اختیار کیا اور فارسی ادبیات سے فائدہ اٹھایا اور جس کا اثر ان کے ملک و قوم تیرہ زبان پر پڑا اس سے انکی اولیت اور تفوق اور عظمت جو ان کو دی جاتی ہے بخوبی ثابت ہے۔ ان کے مذاق شعری اور جودت و کمال پر ان کی تصانیف کثیرہ دال ہیں۔ البتہ ان کے طرز تحریر (عبارت) اور اظہار خیال میں کچھ گنجلک اور الجھن کہیں کہیں پیدا ہو جاتی ہے۔ تاہم ان کے کلام اور اشعار میں بڑی روانی، خوبی اور لطافت اسی کے ساتھ سادگی نمایاں ہے۔

(صفحہ ۱۸۱ اوزجلیل ڈکشنری اڈیلیل)۔

عربی لغات میں صُراح نے تَتَر (دونوں تے پر زبر) کو ایک گروہ کا نام لکھا ہے جسکی سرحد ترکوں کی سرحد سے ملی ہوئی تھی۔ فارسی لغت نویس "تتر" کو تاتار کا مخفف بتاتے ہیں جو ترکستان میں ایک ملک ہے کسی زمانہ میں یہاں کے رہنے والے کافر تھے۔
فضلائے فرنگ کی تحقیق یہ ہے کہ "تاتار" کا نام "تار یا منگولس" سے نکلا ہے۔ [نوٹ ۱]

صفحہ ۱۲۳ - مقالہ ۶۰ - تُرک

اس جلیل القدر و عظیم الشان قوم کے تعارف کے لئے میری مدح سرائی اور خامہ فرسائی کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ترکوں کی شجاعت و بہادری کی داستانوں سے تاریخوں کے دفتر بھرے پڑے ہیں [نوٹ ۲]۔ کبھی ان کی فتح مندیاں چار دانگ عالم پر چھائی ہوئی تھیں۔ ان کا منبع و معدن تو ایشیائے کبریٰ کا وہ دلکش و دلفریب وسیع خطہ تھا جو ترکستان کے نام سے شہرت رکھتا ہے۔ مگر ان کی بسالت [نوٹ ۳] و دلیری

نوٹ ۱ صفحہ ۱۳۲ تاریخ راجستھان جلد اول آکسفورڈ ۱۹۲۰ء ٹوٹ دو سرا از ولیم کروک بحوالہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۲۶ صفحہ ۴۴۰۔ نوٹ ۲ ترکوں کی عام تاریخ مغلوں اور تاتاریوں کے دو جلدوں میں مطبوعہ ۳۰-۱۸۲۹ء لندن مولفہ ابوالغازی۔
نوٹ ۳ بہادری۔

کی بدولت دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوٹا تھا جس کو ان لوگوں نے پامال نہ کیا ہو۔ ان کے حسن و جمال کے تذکرے افسانے نہیں حقیقت و واقعیت کے سدا بہار و شاداب لالہ زار ہیں جن کی ایشیا کے شاعروں نے آب یاری کی۔ سخنوران ایران نے ان کے پھولوں کے گلدستے سجائے۔ ان کے متبع و مقلد (نقال) نہ کہئے گا۔ سحر کارانِ ہند نے اُن کی خوشبو دور دور پھیلائی اور دور دور سے اُن کی شانِ استغنا اور بے نیازی و استغنا نے داد حاصل کی۔ ع۔ ترکِ سیاہ چشم کو سرمہ فروش سے غرض؟ بلبلِ شیراز کو دیکھئے[۹] کبھی اپنے شیرازی ترک کو والہانہ انداز سے یاد کرتا ہے اور کبھی ان ہی ترکوں کے خوانِ یغما کو اڑائے جانے کی فریاد۔ خواجہ کے نامدار بزرگ کو دیکھئے جو فطرت الٰہیہ کے اس عطیۂ عظمیٰ کی

---

[۹] خواجہ شمس الدین محمد اصلی نام تھا۔ عہد آل مظفر میں شیراز میں پیدا ہوئے۔ امیر تیمور کی فتحیابی اور شاہ منصور کی شکست بھی دیکھی۔ "لسان الغیب" بھی لقب ہے۔ اشعار میں شاہد شراب کی کثرت کی وجہ سے بعض شرق نواز ان کو فارس کا اناکرنیان THE ANA-CREEONOF PERSIA کہتے ہیں۔ ۷۹۱ھ (۱۳۸۹ء) میں وفات پائی۔ شیراز میں خاکِ مصلیٰ" دفن ہے۔ ان کا دیوان ان کی وفات کے بعد ملا قاسم انوار نے مرتب کیا تھا جس کے انگریزی میں بھی متعدد ترجمے ہو چکے ہیں۔ مولانا اسلم جیراجپوری کی "حیات حافظ" ملاحظہ ہو۔

نسبت آدھی بیت میں سب کچھ کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔

ع۔ سعدیا[1] روزِ ازل حسن بہ ترکاں دادند

اور اب تو یہ سنتا ہوں کہ گلزار ہائے فرنگ کے نگہبان و حدیقہ بند بھی انھیں اہلِ فارس کے ہم نوا و ہم آہنگ ہوتے جاتے ہیں۔

ترکی قوم ہنر و دستکاری اور صناعیوں کی ہمیشہ قدرداں رہی ہے۔ ترکی منسوجات (بنی ہوئی چیزوں) میں ترکی قالین نہایت شہرت و نام سے بے نیاز ستایش ہیں۔ یار و اغیار سب انکی تحسین کرتے ہیں۔ اور ان کو بروسیلز (بلجیم) BRU-SSELS کے قالینوں سے بہتر اور خوش نما بتاتے ہیں۔ ترکی نَشَقَہ یعنی تولیا بھی بہت پسند کی جاتی ہے اور دیرپا ہوتی ہے۔ ترکوں کا ذخیرۂ ادب و انشا دنیائے علم میں ممتاز رہا ہے۔ ہماری زبان میں بھی اسکے بعض علوم و فنون زیادہ تر افسانوں کی کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں اور دلچسپی و توجہ کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔ ترکوں کو اپنی زبان کے ساتھ بڑی محبت ہے اپنے اہل قوم

---

[1] امام شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی۔ ولادت ۵۷۱ھ (۱۱۷۵ء) شیراز میں وفات ۶۹۱ھ (۱۲۹۲ء) بعمر ۱۲۰ سال۔ مفصل حالات مولانا حالیؒ کی "حیات سعدی" میں ملیں گے۔ مسٹر بیل نے ڈکشنری کے صفحہ ۲۲۸ پر بھی کافی طور پر لکھے ہیں۔ ان کی تمام تصنیفات اور ان کے انگریزی ترجمہ کنندگان کے نام بھی دیئے ہیں۔

کے ساتھ اس سے بھی زیادہ۔ مولانا مسعود عالم ندوی نے ایک تحریر میں ان کی برادر نوازی اور زبان پرستی کو یوں بے نقاب فرمایا تھا۔ عثمانی ترکوں نے حجاز پر صدیوں حکمرانی کی۔ لاکھوں کروڑوں کے چڑھاوے چڑھائے مصر کے خراج کا بیشتر حصہ "حرمین" کی خدمت کے لئے وقف رہا۔ مجاوروں اور متولیوں کے لئے بیش قرار وظیفے مقرر کئے پر عرب کی ادبی بنجر زمین میں کبھی علم کا چشمہ جاری نہ ہوا۔ دفتروں کی زبان ترکی رہی ــ اللہ اکبر خلیفۃ المسلمین کی حکومت اور مہبط وحی میں غیر قرآنی زبان کا چلن۔ مختصر یہ کہ سرکاری زبان ترکی رہی۔ افسر ترکی رہے"[۴۱۲]

یہ شکوہ کوئی تازہ شکوہ نہیں۔ آج مولانا ندوی ہی کو پیدا نہیں ہوا پینتالیس برس ہوئے امیر القلم لوئیس بک صابونجی[۴۱۳] نے مجھے لکھا تھا لان الآستانۃ ھی بند ل طبع الکتب الترکیۃ ولیس العربیۃ وبعد موت صاحب الجوائب لم تطبع کتب عربیۃ (۲۴ تشرین اول ۱۹۱۰ء)۔ (ترجمہ) آستانہ (قسطنطنیہ) صرف ترکی کتابوں کے چھاپنے کی جگہ ہے۔ عربی کی نہیں۔ صاحب اخبار الجوائب کے مرنے

---

[۴۱۲] رسالہ معارف۔ مئی ۱۹۴۱ء نمبر ۵ جلد ۴۷ صفحات ۳۶۳ و ۳۶۴۔ [۴۱۳] صفحہ ۸۸ پر نوٹ ۳۷ ملاحظہ ہو۔ [۴۱۴] احمد فارس الشدیاق۔ ادیب لغوی نحوی۔ ایڈیٹر الجوائب و مصنف کتب متعددہ۔ وفات ۱۳۰۵ھ ۸۸۔۱۸۸۷ء قسطنطنیہ۔

کے بعد عربی کتابیں چھپنا بند ہوگئیں۔

ترکوں اور اُن کے مرز و بوم کے متعلق سب سے پرانی اور نہایت مستند کتاب "تاریخ ترکستان" مولفہ ملا مجدالدین محمد بن عدنان سُرخکتی ہے۔ جو اب تک حلیۂ طباعت سے محروم اور اس لیے کمیاب ہے۔

ترکوں اور تاتاریوں کی ایک کتاب انساب "شجرۃ الاتراک" سے موسوم ہے۔ دانشوران فرنگ میں بڑے اعتماد و استناد کے ساتھ دیکھی جاتی ہے۔ ایک صدی سے زیادہ ہوا کرنیل مائلیس COL. MILES نے اسکی تلخیص فرماکر انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ ۱۸۳۹ء میں مع ایک نقشہ کے چھپوایا تھا۔ فاضل بار تھولڈ کی تالیف "ترکستان" بھی جامع و معتبر تاریخ ہے۔

ان قوموں کے مختلف و متعدد واقعات اور حالات ہیں جو تلفیق الاخبار و تلقیح الآثار فی وقائع قزان و بلغار و ملوک التتار میں مندرج ہیں۔ یہ کتاب دو جلدوں میں شہر اورنبورغ ORENBURG مملکت روسیہ میں طبع ہوئی ہے اور علامہ م۔ م رمزی کی تصنیف [۲۱۵] ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ترکوں میں بہت سے گروہ ہیں۔ تتار۔ باشقرد۔ تپتر میشروعہ۔ سرما بتا وغیرہ۔ ایک گروہ

---

[۲۱۵] مطبوعہ ۱۳۲۵ھ مطبعہ کریمیہ اورن برغ صفحات ۵۱ و ۲۱۳۔

قرلق سے موسوم ہے۔

قازان انگریزی میں (KA-ZAN) اصل میں (KASAN) اور ترکی میں کازان تھا جو عربی میں قازان بن گیا۔ آج روسی ممالک میں داخل و شامل ہے۔ اور تاتار کا ایک حصہ ہے۔

ہمارے ملک میں کبھی جب ترکی قوم کا زیادہ اثر اور رسوخ رہا تھا، وہ "قلماق" تھی۔ اس قوم کی عورتیں اُمرا اور بادشاہوں کی محل سراؤں میں چوکی پہرہ کا کام دیتی تھیں اور محلاتی زبان میں "قلماقنیاں" کہلاتی تھیں ۲۱۶؎ ان عورتوں کی مردانگی و شجاعت کی بہت سی مثالیں ہندی تاریخ پر ثبت ہیں۔ مسٹر آرروین اپنی کتاب "مغل متاخرین" LATER MUGHALS میں ایک قلماق عورت شادماں نام رائے مان خطاب کا ذکر کرتے ہیں جو حرم سرا کی خدمت پر متعین اور ملازمہ بارگاہ خاص تھی۔ اس نے جہاندار شاہ کی بڑی اعانت کی تھی۔ ۲۱۷؎ سید ابوالاعلیٰ مودودی فرماتے

۲۱۶؎ سیاحت نامہ ڈاکٹر برنیر جلد اول صفحہ ۱۱۴ - نواب نصیر حسین خاں خیال "مغل اور اردو" میں لکھتے ہیں کہ قلماقنیاں اور اردا بیگنیاں تاتاری و ترکی ہتھیار بند عورتیں قلعہ کے محلوں میں پہرہ دیتی تھیں۔ (صفحہ ۴۹ نوٹ)۔ ۲۱۷؎ صفحہ ۲۸۱ مطبوعہ کلکتہ جلد اول مرتبہ سر جدو ناتھ سرکار۔

٭ ٭ ٭

ایک بار ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے جہاندار کے قتل کے لیے سازش کی۔ اس عورت نے وقت پر شور مچا کر محل والوں کو بیدار کر دیا۔ اور لوگوں کے آنے تک حملہ آوروں سے تنہا لڑتی رہی۔ بادشاہ نے اسکو "رضا بہادر رستم ہند" کا خطاب اور پنج ہزاری منصب دیا تھا۔ [۲۱۸]

دہلی کے دولاکھ بے گناہوں کا خون کس بنا پر ہوا۔ بعض فکر شریروں نے یہ شوشہ چھوڑ دیا تھا کہ محمد شاہ کے اشارہ سے قلعہ میں ایک قلماقنی نے نادر شاہ کا کام تمام کر دیا ہے۔ ایسا عظیم الشان اور پرخطر کام اور ایک قلماقنی کی ہمت! ایک فرنگی مصنف ہانوی (HANWAY) نے بھی اس شہرت و واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ [۲۱۹]

جدید عربی زبان میں ترکی بنا لینے یا ترکی قومیت کے رنگ میں رنگ دینے کو تتریک کہتے ہیں۔ [۲۲۰] ترکان، ترک کی جمع بھی ہے۔ اور بیگم اور بی بی کی طرح عورتوں کا لقب بھی ہوتا ہے۔ نسل و نژاد کا پتہ چلانے والے لکھتے ہیں کہ ترک "قوم ترک" فرزند نوح علیہ السلام سے منسوب ہے۔

ترکان خاتون کرمانی کی مدح میں شیخ شیراز کے قصائد کا ذکر مولانا حالی نے فرمایا ہے۔ [۲۲۱]

---

[۲۱۸] دکن کی سیاسی تاریخ، صفحہ ۵۹۔ لاہور۔ [۲۱۹] دکن کی سیاسی تاریخ صفحہ ۲۶۴۔

[۲۲۰] لغات جدیدہ، صفحہ ۳۲۔ [۲۲۱] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۸۵۔

صفحہ ۱۲۳ نوٹ ۶۱۔

برہان، غیاث اور لغات ترکی سے پایا جاتا ہے کہ "ترکمان" ترکوں ہی کی ایک قوم ہے۔ صاحب سراج لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کا پایہ اصلی ترکوں سے کمتر ہوتا تھا۔ اس لئے یہ نام رکھ دیا گیا تھا۔ یعنی ترکوں کے مانند۔ بعض علمائے فن کا خیال ہے کہ یہ لفظ مرکب نہیں ہے۔ اہل فرنگ کی تحقیق یہ ہے کہ ترکمان ایشیا کے چند در چند خانہ بدوش تاتاریوں میں کی ایک جماعت ہے۔ اُس علاقہ پر جو بحیرۂ خزر کے پورب اور جنوب و مشرق میں واقع ہے یہ لوگ قابض ہیں۔

اس قوم کا دباؤ اور رسوخ ہندستان میں سلطنت اور دار السلطنت پر کتنا تھا؟ شاہ جہان آباد اور اس کے ترکمان دروازہ کا نام اور اُس کی زندہ اور بولتی ہوئی تاریخیں اس کا جواب دیں گی۔

صفحہ ۱۲۳ ۔ نوٹ ۶۲

مجر MAGHYAR یا MAG'YAR ہنگری HUNGARY کے رہنے والے۔ انگریزی تلفظ تو "میگ یار" ہے لیکن خود اُس ملک کے رہنے والے "موڈیور" بولتے ہیں۔ یہ لوگ ہنگری کی اُس ایشیائی نسل سے چلے آتے ہیں جو ترکوں اور فن لینڈ کے باشندوں کی ہے۔ ان ہنگری والوں کی زبان کا تعلق تورانی نوع کی

زبانوں سے ہے۔[۴۲۲] پرانی دنیا کا زبردست محقق اور تاریخ نویس فلپ اسمتھ PHILIP SMITH بھی یہی لکھتا ہے کہ یہ لوگ ئوگرین UGRIAN (یا فن لینڈ کی) نسل سے ہیں۔ ہنگری کا لفظ ہنگ وری (HUNG - VARI) سے نکلا ہے۔ یعنی ہُنس HUNS کی قوم۔ اوگرین نو آبادکاروں نے جو دورِ حاضر کے مجّر لوگوں کے اجداد تھے ہنگری کو سب سے پہلے ۸۸۹ء میں زیرِ قیادت ارپد ARPAD کے فتح کیا تھا۔[۴۲۳]

بعض اشخاص کی زبان پر اس لفظ کا تلفظ "میگیار" رہا ہے۔ اُس سے بحث نہیں۔ لیکن جو لوگ "گ" کو "ج" سے بدلتے اور "مجّر" بولتے ہیں وہ "مجّر" کے متعلق زبانوں اور لغتوں کی آرنیش یا ستم ظریفی ملاحظہ کریں۔ "مجر" آج کل کی عربی زبان میں باشندۂ ہنگری کو کہتے ہیں۔[۴۲۴] قدیم عربی میں مجّر کے معنے تشنہ ہونے (عطش۔ پیاس) کے ہیں۔[۴۲۵] لیکن آج کل انگریزی زبان میں HUNGRY اور HUNGER بھوکا اور بھوکے کو کہتے ہیں۔[۴۲۶]

---

۴۲۲ اسٹنڈرڈ ڈکشنری، صفحات ۶۷۸، ۸۱۰۔ ۴۲۳ ترجمہ تاریخ سمرن کی کتاب، صفحہ ۲۰۱۔ ۴۲۴ جلد سوم، صفحہ ۸۳۸۔ ۴۲۴ لغات فیروزی، صفحہ ۶۲۴۔ ۴۲۵ صراح باب الراء، صفحہ ۲۱۳۔ جغرافیہ قدیم۔ ۴۲۶ اسٹنڈرڈ ڈکشنری، صفحہ ۳۳۵۔

کسی زمانہ میں جرمنی کو اپنی دشمن یعنی اس مگیار قوم سے لڑائیاں پیش آئی تھیں۔ یہ جنگ جو بھی خانہ بدوش تھے اور وسط ایشیا کے تاتاریوں کی طرح جدال و قتال ان کا مشغلۂ زندگی تھا۔ اب انھوں نے بہت آدمیت اختیار کر لی ہے اور باقاعدہ آباد ہو کر شہریت و تمدن کے لطف و فیوض سے آشنا ہو گئے ہیں۔ ان کی نسلیں "کراکویہ" جنوب گلیشیا، مشرقی ہنگری کے علاقوں میں متعدد شاخوں میں آباد ہیں [۴۲۷]۔

مورخین وارنر WARNER اور مارٹن MARTIN لکھتے ہیں کہ ہیگیار ہنگری میں رہتے ہیں۔ جنگ عظیم کے مبادی اور بنیادی کاموں میں ان کا بھی حصہ تھا۔ [۴۲۸]

صفحہ ۱۲۳۔ مقالہ ۶۳۔ قرغز [۴۲۹]

روسی اسٹیپ STEPPS کے باشندے کہلاتے اور انگریزی میں کھرگز KHIRGIS لکھے جاتے ہیں [۴۳۰]۔ اسٹیپ وہ بے آب و گیاہ بڑے بڑے وسیع میدان، جو یورپی روس کے جنوب و مشرق میں بحیرہ

---

[۴۲۷] صفحہ ۱۲۔ [۴۲۸] برطانوی تواریخ کے بنیادی نقوش، صفحہ ۲۳، مطبوعہ لندن ۱۹۳۸ء، جزو سوم۔ [۴۲۹] تاریخ مغول از ہاورتھ HOWORTH'S HISTORY OF THE MANGOLS, VOL I [۴۳۰] صفحہ ۲۰۱، بیتوبل معلومات عامہ و اجمالات دفتری، از ترپو راری مہرن سری واستو۔

خزر اور بحیرہ آرال سے پورب کی طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ سائبیریا کی نشیبی آراضیات پر بھی محیط ہیں۔ یہاں بارش نہیں ہوتی۔ نہ درخت ہیں نہ سبزہ۔ موسم گرما میں نہایت درجہ گرم اور سرما میں بشدت سرد ہو جاتے ہیں[۴۳۱]۔

ان کا امیر الامرا اور سپہ سالار (ترکی زبان میں) بیگلر بیگ قراغز کہلاتا تھا۔ (قرا۔ سیاہ رنگ۔ غز، ترکوں کی وہ شاخ جس نے سلطان سنجر کے زمانہ میں خراسان کو تباہ و غارت کر دیا تھا)۔ اسی نام یا لقب کے ساتھ اناطولیا کے ایک حکمراں نے خاص شہرت پائی تھی۔ جس کو انگریز اہل قلم CARAGOSSA لکھتے ہیں۔ ترکوں کے بادشاہ بایزید دوم کے عہد میں قرا حصار کے قریب اس سردار کو شاہ قلی نے سولی دیدی تھی[۴۳۲]۔

[۴۳۳] جغرافیہ نویسوں کی تازہ ترین تحقیقات و تحریرات کا خلاصہ یہ ہے۔ (۱) یہ ایک آوارہ گرد منگولی تاتار قوم ہے۔ (۲) "قرغز" روسی اسٹیٹ کی

---

۴۳۱ صفحہ ۱۷۵۔ کتاب مذکور۔ صفحہ ۶۴۴، اسٹڈیل کی انگریزی ڈکشنری مطبوعہ لندن ۱۹۰۴ء۔ ۴۳۲ اور ٹیل ڈکشنری صفحہ ۱۴۲۔ ۴۳۳ پیرس سائیکلوپیڈیا صفحہ ۲۳۸۔ PEARS' CYCLOPAEDIA۔ دی نیو اسٹینڈرڈ انسائیکلوپیڈیا مطبوعہ THE NEW STANDARD ETC. ۱۹۲۵ء، صفحہ ۲۹۔

رہنے والے۔ (۳) سوویت کی جمہوریت میں اِن لوگوں کا ایک ضلع بحیرہ آرال کے گرداگرد، سرحد سے پورب کو، مابین ایشیا اور یورپ کے واقع ہے۔ یہ تقسیم درمیان قرا قلپاکیا اور فرغونہ کے ہے۔ اس کا رقبہ بچاس نوے ہزار میل مربع اور آبادی ساڑھے نینا نوے ہزار یا ایک لاکھ کے قریب نفوس کی ہے۔ ان کی جمہوریت ۱۹۲۷ء میں قائم ہوئی تھی اور ماسکو سے منسلک ہے۔ یہ قیرغز اُس منگول قوم کے نام سے منسوب ہے۔ جو مدت دراز سے ایشیا کے اس حصہ میں رہتی تھی[۴۳۴]۔

ایک اور واقف الاحوال باکمال کی تحریر سے پایا جاتا ہے کہ روسی علاقے میں "تیرگیز" (ایک دو حرفوں کو بدل کر بہ تغیر تلفظ) لوگوں کے قافلے جابجا نظر آتے ہیں۔ سردیوں کے بعد یہ لوگ اپنے مویشیوں کے گلّے لے کر کوسوں تک چراگاہوں کی تلاش میں پھرا کرتے ہیں۔ یہ دشت نورد لوگ مسلمان ہوتے ہیں۔ خانہ بدوشی کی حالت میں ملک کے ایک حصّے سے دوسرے حصے یعنی بحر اخضر کے کنارے تک جو پانی کا خطرناک حصہ ہے ان کی جولاں گاہ ہے۔[۴۳۵] ان کے ہمسایہ علامہ م۔ م۔ رمزی

---

[۴۳۴] ایضاً صفحہ ۴۷۔ [۴۳۵] ہماری زبان، نمبر ۳، جلد ۳، صفحہ ۶، بحوالہ نبی بخش کی کہانی، از عبدالرحمٰن صدیقی، سابق میر کلکتہ۔

لکھتے ہیں کہ قرغز کی زبان ترکی ہے۔ موصوف نے کچھ رجزیہ اشعار بطل قرغز فاری ہونے کے بھی دئے ہیں۔ [۴۳۶]

تبلیغی اور رصدی ضرورتوں کے وقت یہی خط کام آتا ہے۔ ستمبر ۱۹۴۱ء میں جب سورج گرہن (کسوف) پڑا ہے تو یہی قطعہ مشاہدات وتجربات کے لئے انتخاب کیا گیا تھا۔ جو مُہم ان کاموں کے لیے بھیجی گئی تھی، اُس نے روس کی عملداری میں ۷۵۰ میل تک کفِ دست میدان کاکیشس (قوقاز) کے شمال سے قرغزتان [۴۳۷] KIRGHIZTAN تک کا پسند کیا۔ اور وہیں سے دیکھا بھالا جو کچھ کہ دیکھنا تھا۔ یہ سرزمین KAZILORDA اور KASAKHSTAN بھی کہلاتی ہے [۴۳۸]

سر لوکس کنگ LUCAS KING "تاریخ بابر" میں لکھتے ہیں کہ آج کل کے قبائل قرغز KIRGHIS اپنے کو "صحرا قزاق" یا "جنگل کے ٹھگ" کہتے ہیں۔ اور تاشقند کے گرد دشت و بیابان پہ متصرف ہیں۔ انگریزی کا COSSACK اسی لفظ کی تحریف ہے۔ [۴۳۹]

---

[۴۳۶] تلفیق الاخبار، صفحہ ۵۲۶۔ [۴۳۷] بغیر حرف سین۔ [۴۳۸] اخبار لیڈر یکشنبہ، ۲۲ ستمبر ۱۹۴۱ء۔ [۴۳۹] صفحہ ۲۰ نوٹ ۴۔ MEMOIRS OF ZEHIR-ED-DIN MUHAMMAD BABUR - TRANSLATED BY LEYDEN & ERSKINE - OXFORD. 1921.

اہل لغت قِرغز کو بکسرۂ قاف کسی ترک کا نام بتاتے ہیں جس کا مدرسہ غزنہ میں تھا۔ (صراح)

موجودہ زمانہ میں عربی کے اطلس (نقشے) جو مصر و بیروت وغیرہ میں چھپے ہیں۔ ان میں صحراء القرغیز، صحراء الترکمان، نہر اورال، بحر اورال، جبالِ اورال، نہرِ سیحون کے نام اور مقامات ممتاز دکھائے گئے ہیں۔

صفحہ ۱۲۴ - نوٹ ۱۴۴ -

ہیروڈوٹس HERODOTUS یونان کا مشہور مورخ گزرا ہے۔ تاریخ کا ابو الآبار FATHER OF HISTORY کہلاتا ہے۔ سیاحت بہت کی تھی۔ مصر کی سیر کو سن عیسوی سے چار سو برس پہلے آیا تھا۔ ایران لیڈیا LYDIA اور مصر کی تاریخ لکھی ہے۔ اُس منازعت و کشاکش کی خاص کر تفصیل کی ہے جو اہلِ یونان اور ایرانیوں کے مابین رہتی تھی۔[۱۴۰] اُسقف جی رالنسن (REV. GEO. RAWLINSON) نے اس کے سوانح حیات ایک مستقل کتاب میں جمع کر دئے ہیں[۱۴۱] جو بہت مقبول ہوئی اور چار جلدوں میں چھپی ہے۔

محققِ عصر احمد زکی پاشا لکھتے ہیں کہ یہ شخص ایشیائے کوچک کے

نوٹ ۱۴۰ صفحہ ۱۶، ترجمہ اردو سہرن کی معلومات عامہ ۱۴۱ مطبوعہ لندن ۱۸۷۵ء

اس مورخ کا سال پیدائش ۱۸۱۵ء ہے، وفات ۱۹۰۲ء میں پائی۔

ایک پرانے شہر ہالیکرناس HALICARNASSE کا باشندہ تھا۔ اس موضع کو آج کل ترک بودرم اور افرنجی BOUDROUM کہتے ہیں[۴۴۲]

صفحہ ۱۲۵ نوٹ ۶۵۔ طہمورث

صحیح انگریزی تلفظ ٹامی رِس TOMY-RIS ہے۔ یہ ماس سیگی ٹائی MAS-SAGE-TAE قوم کی بڑی بہادر جنگ آزما عورت تھی۔ یہ قوم سائیتھین لوگوں کی ایک شاخ بتائی جاتی ہے۔ جو اس مسطح عظیم الشان میدان بلکہ حقیقتہً صحرا میں آباد تھی جو بحیرۂ خزر کے پورب واقع ہے۔ جب اس خاتون کے علاقہ پر کسرے CYRUS نے حضرت مسیحؑ سے تقریباً ۵۳۰ سال قبل حملہ کیا تو اس نے کسرے کو اعلانِ جنگ کا جواب یہ دیا تھا کہ مجھ سے نبرد و پیکار کے لئے آپ اپنی ہی عملداری انتخاب فرمالیں۔[۴۴۳] فارسی تاریخوں اور شاہنامہ سے بھی اسکی تصدیق ہوتی ہے۔

صفحہ ۱۲۷ نوٹ ۶۶۔

فریسین PHARISEE یہودیوں کا ایک فرقہ۔ رسوم و مراسم قدیمہ کی سختی کے ساتھ پابندی، اپنے بزرگوں کی روایات کی پیروی

---

[۴۴۲] صفحہ ۸۱ "قاموس الجغرافیۃ القدیمہ" مطبوعہ مصر۔ [۴۴۳] تاریخ فلپ اسمتھ، جلد اول، صفحہ ۲۸۲۔

جس کی شان امتیاز تھی۔ جو اور یہودیوں کے مقابلے میں اپنے کو
زیادہ نیک شعار و نیکوکار سمجھتا تھا۔ انگریز لغت نویس اس کی نسبت
لکھتے ہیں " ظاہری ہیئت مذہبی یا رسوم کا نہایت پابند و متبع"
جس میں دین کی روح نہ ہو یعنی ریاکار و منافق۔[۴۴۴]
عہد نامجات مقدسہ میں بھی فریسیون کا ذکر آیا ہے۔[۴۴۵]

صفحہ ۱۲۷ ۔ مقالہ ۶۷ ۔ لینگو بارڈی LANGOBARDI

لینگو بارڈی کو دی لانگ بیرڈس THE LONG BEARDS
(دراز ریش) * کا مترادف کہنا چاہیے۔ اس جماعت کا صدر مقام چینسی
(CHANCI) کے اوپر ایلب لینڈ برنزوک (ELBLAND -
BRUNSWICK) کے ابین تھا۔ ٹےسی ٹس TACITUS کے زمانہ میں
ان لوگوں کی شجاعت و بسالت نے بڑی شہرت پائی تھی جس کا نمایاں کارنامہ
یہ تھا کہ مسلسل جنگ و جدال میں ایسی چھوٹی سی قوم ہمیشہ فتح یاب رہی۔
اور جس نے آگے چل کر بہت زیادہ شہرت و ناموری لومبارڈز (مدن)
LOMBARDS کے نام سے حاصل کی[۴۴۶]

* اوراق تاریخ بتاتے ہیں کہ عصر قدیم میں ایسی وضعوں یا خارجی

---

[۴۴۴] لغات فیروزی عربی صفحہ ۳۵۶۔ [۴۴۵] باب ۲۳ - آخر اصحاح ۴۲ - [۴۴۶] از تاریخ
خلیب امۃ، جلد سوم، صفحہ ۲۴۰ - د ترجمہ مصطفےٰ صفحہ ۲۲۶ (باقی صفحہ آئندہ پر)

و نمایشی پیرزوں سے منسوب ہو کر قبائل کے نام پڑ جاتے تھے۔ مثلاً فرانس خاص میں جو قومیں رہتی تھیں ان میں سے ایک بریکائی BAR-GAE۔ کہلاتی تھی۔ یہ لوگ فراخ فراخ پاجامے پہنتے تھے۔ دوسری ٹوگانی TOGATED یا ان کی پوشش ڈھیلی ڈھالی سر سے پاؤں تک قدیم رومہ والوں کی طرح ہوتی تھی۔ غالباً یہ لقب ٹوگا TOGA سے منسوب ہو جس کے معنی گون یا چوغہ کے ہیں۔ یہ بیرونی یا اوپر کا لباس ہوتا تھا۔ پرانے رومن مرد اسی کو زیب بدن فرماتے تھے۔[۴۴۷]

شاید داڑھی اور سر کے بالوں کا بڑھانا پرانے وقتوں میں اچھا سمجھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر ٹیلر کی اسی تاریخ قدیم[۴۴۸] سے پایا جاتا ہے کہ فرانس خاص میں جو اقوام آباد تھیں ان میں ایک کوماٹی FRANCHE COMTE کہلاتی تھی جو لمبے لمبے بال رکھتی تھی۔ لاطینی زبان میں کوماٹ (COMATE) جھبڑوں اور بال دار کو کہتے ہیں۔

بنی نوع انسان، جنس بارش و لحیانی، داڑھی کو ہمیشہ عزت و

(بقیہ صفحہ گزشتہ) HISTORY OF THE ANCIENT WORLD

BY PHILIP SMITH ; VOL. III, P. 340

[۴۴۷] مصطفےٰ از ٹیلر، صفحہ ۲۰۱۔ [۴۴۸] ترجمہ، صفحہ ۲۰۱

واحترام کی نگاہ سے دیکھتی رہی ہے۔ مونچھوں کا شمار اب یا کبھی پہلے دنیا کی ساری کی ساری قوموں میں طاقت وقوت کی علامت اور مردانہ پن کے زیور کے طور پہ ہوتا تھا۔ کہہ سکتا ہوں کہ وہ متبرک بھی سمجھی جاتی تھیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کو داڑھی منڈانے سے منع کر دیا تھا۔ گورو گوبند سنگھ نے اپنے متبعین اور پیروؤں کو مشورت وہدایت کی تھی کہ ۔ .. .. .. داڑھیاں اور لمبی لمبی مونچھیں رکھیں۔ آل فادر زوس ALL FATHER, ZEUS [۴۴۹] اور اور انبیا سے کرام بھی داڑھیاں رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ مونچھیں بھی۔ اب امتوں اور قوموں کو بھی ایسا ہی بتا گئے ہیں۔

فرنگستان اور ہندوستان کے شاہی خاندان اور حکمراں ارکان اکثر وبیشتر داڑھیاں کم از کم گل مچھے (WHISKERS) رکھتے تھے اسی رواں صدی کے فرماں روایان انگلینڈ ایڈورڈ ہفتم اور اُن کے خلف رشید جارج پنجم کی بھی داڑھیاں تھیں۔ ایڈورڈ ہشتم کو داڑھی کا زحمت کرہ بنا راس نہ آیا اور تخت وتاج سے دست بردار ہونا پڑا۔ سیواجی بھی ایک لمبی اور گھنی داڑھی کا مالک و محافظ تھا۔ ڈاکٹر

---

[۴۴۹] زوس یونانیوں کی الٰہیات اور معبودوں میں سب سے بلند و برتر۔ جو عام طور پر رومانیوں کے جوپیٹر (JUPITER) (مشتری) کے مرادف ومساوی مانا جاتا ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور، آنجہانی اور مسٹر جارج برنارڈ شا BERNARD SHAW ہمارے زمانہ کے بڑے بڑے آدمی ہیں جنھوں نے اپنی داڑھیاں ہمیشہ سلامت رکھیں۔

اہل قلم لکھتے اور ہم تاریخوں میں پڑھتے ہیں کہ ملکہ الیزابتھ۔ ELIZABETH اپنی مدمقابل جنس (مردوں) کی داڑھیوں کی بڑی حریف رقیب تھی۔ اس نے تین شلنگ چار پنس سالانہ کا ٹیکس کبھی ایسی داڑھی پر لگا دیا تھا جو پندرہ روز سے زیادہ کی بڑھی ہوئی ہو۔ روس کے زار پیٹر (PETER) نے یہ خراج (محصول) IMPOST قائم رکھا اور اس قاعدہ پر عمل کرتا رہا۔ حتیٰ کہ لوگوں کو منڈانے پر مجبور کر دیا تھا۔ سن رسیدہ لوگوں نے جو اپنی داڑھیوں سے محبت و الفت رکھتے تھے۔ مستقل مزاجی سے اپنی وضع و شان کو ہاتھ سے دینا گوارا نہ کیا۔ پیٹر بھی اپنے احکام پر سختی سے کاربند و عمل پیرا رہا۔ یہ ستم کیش جن لوگوں کے چہرے پر داڑھیاں دیکھتا تھا یا تو ان کو جڑ سے اکھڑوا لیتا تھا یا کسی کند استرے سے منڈوا دیتا تھا۔

ہندوستان۔ اکبر کی ماں مریم مکانی حمیدہ بانو نے جب انتقال کیا تو اکبر نے بھدرا کرایا۔ اس کے ساتھ بہت سے امرائے دربار و مقربین بارگاہ سلطانی نے بھی داڑھی مونچھ اور سر کے

بالوں کو خیر باد کہا۔ اگلے پچھلے تاریخ نویس ان کی تعداد کم سے کم پندرہ ہزار بتاتے ہیں۔[۴۵۰] اسی کے ساتھ داڑھی کا رواج اٹھ گیا اور بعض زبردست اور ضدی بوڑھوں کے سوا جیسا کہ خانِ اعظم مرزا کوکہ تھا اکثر بارسوخ درباری اُسکی تقلید و پیروی کرنے لگے۔ بعد کو انھوں نے سرِ طاعت خم کر دیا۔ کرنیل می لیسن اسکی توجیہ کرتے ہیں کہ "ہندوستان گرم ملک ہے۔ یہاں استرے کے استعمال کے فوائد روشن اور بدیہی ہیں۔ بحث کی ضرورت نہیں۔ ریش تراشی یعنی داڑھی منڈانے سے ——— مسلمان چنداں برا بھی نہیں مانتے "[۴۵۱]

اوراقِ تاریخ گواہ ہیں کہ بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے بہت سے باکمال اپنی جودتِ طبع کا اظہار کرتے اور داڑھی منڈانے کے فوائد اور خوبیوں کو چمکا کر دکھاتے تھے۔ غیوری حصاری کا یہ قطعہ ابوالفضل نے نقل کیا ہے۔

---

[۴۵۰] صفحہ ۱۰۶، نگارستان فارس، لاہور ۱۹۲۲ء۔ و۔ صفحہ ۹۶ قصصِ ہند حصہ دوم۔ سیر المتاخرین میں ہے کہ دو سال جلوس ۹۶۴ھ مریم مکانی نقابِ اجل بر رو کشید۔ اکبر بہ آئینِ ہندوان برائے خویش سر و ریش تراشیدہ لباس ماتمی پوشید۔ و نعش والدہ خود بر دوش گرفتہ قدمے چند مشایعت نمود و روانہ دہلی کرد۔ (منتخب، صفحہ ۱۹۳)۔

[۴۵۱] صفحہ ۱۶۷، اکبر اور سلطنت مغلیہ کا عروج، اکسفورڈ، ۱۹۱۷ء

بردرِ شاہِ اکبرِ غازی | کہ بہشتے است پُر ز آسایش
ریش خود را اگر تراشیدم | نزپے زینت ست و آرایش
کہ چو جرم از سیاہ رُوئی نیست | ریش را در بہشت گنجایش[۴۵۲]

شیخ مرتضیٰ حسین الہٰ یار خانی بلگرامی حدیقۃ الاقالیم (صفحہ ۱۲۹) میں ایک اور شاہی حکم و ہدایت کا ذکر کرتے ہیں۔ بہادر شاہ جب لاہور واپس پہنچا تو حکم دیا کہ ہندو سر کے بال کٹوایا کریں۔ کیونکہ سکھ لوگ بڑی بڑی داڑھیاں رکھتے ہیں۔ اُس زمانہ میں تو اوراور ہندو بھی خاصکر ضلع لاہور میں داڑھی رکھتے تھے۔ اور ہندو مسلمان کی یک بہ یک پہچان اور تفریق نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے تمام ممالک محروسہ کے اندر ہندوؤں کے داڑھی منڈانے کے لئے فرمان نافذ و جاری ہو گئے۔

نیو یارک کے بشپ ڈاکٹر پاٹر POTTER کی ایک دل خوش کن حکایت سن لیجئے۔ ایک ذوق و شوق والی خاتون نے اُن سے سوال کیا کیا بات ہے کہ تصویروں اور مجسموں میں فرشتے ہمیشہ عورتوں یا نوخیز امردوں کی طرح دکھلائے جاتے ہیں جو داڑھی مونچھ کے جنجال سے

---

۴۵۲ آئینِ اکبری در مدحِ اکبر شاہ ؟۔ صفحہ ۱۸۲، جلد اول، از غیوری حصاری۔

آزاد ہوتے ہیں۔ کہا پادری صاحب نے جواب دیا" ہر شخص جانتا ہے کہ عورتیں قطرتاً "آسمان کی بازیافت" کی وارث ہیں۔ لیکن مردوں کو یہ نعمت و دولت اُسی وقت نصیب ہو سکے گی جب بالکل صفا چٹ VERY CLOSE SHAVE نظر آئیں گے"

اس دنیا میں ایسے لمبی بڑی بڑی داڑھی والے موجود ہیں جو بجائے خود ایک اُعجوبہ مانے جاتے ہیں۔ کچھ زمانہ ہوا ہماری بمبئی کی بندرگاہ سے ایک شخص شکاگو کی بے نظیر نمائش (ورلڈفیر) جانے کے لئے جہاز پہ سوار ہوا تھا جس کی مونچھیں آٹھ فیٹ آٹھ انچہ لمبی تھیں۔ اُس زمانہ کے ہندوستانی اور انگریزی اخبارات میں مدتوں اس کا چرچا رہا۔ یہ تسلیم ہے کہ ایسی لمبی داڑھیاں اب کم رہ گئی ہیں۔ خال خال نظر آجاتی ہیں۔ تاہم دنیا اس کے قدردانوں اور خدمت گزاروں سے خالی نہیں۔ دیکھنے والے اب بھی ان پر حیرت نہیں کرتے۔ زیادہ دن کی بات نہیں۔ دارا گنج شہر الہ آباد کے قبرستان کے حقّار (گورکن) حسینی فقیر کی داڑھی پا بوس نہیں زمین بوس و خاک بوس تھی۔ بہ نظرِ احترام وہ کبھی بالوں کو لپیٹے رہتا تھا۔ ریلوے اسٹیشن مغل سرائے کے ریفریشمنٹ روم کا ستر برس کا بوڑھا خادم ایک عجیب بھاری اور گھنی داڑھی کا مالک و محافظ

تھا۔ جسکو وہ گردن کے ایک طرف چادر کی طرح ڈال لیتا تھا۔ رکی رہتی تھی جنبو۔کے سے گرتی نہ تھی۔ داڑھی کی درازی اس کے قد کے برابر تھی۔

باز آمد۔ یہ ہی مذکورہ بالا' از یاد رفتہ و فراموش شدہ امتیں اور جماعتیں مٹی ہوئی تو میں' عصرِ حاضر کی ترقی یافتہ اور طبلِ بلند بانگ ملتوں اور گروہا گروہ انسانوں کی مائیں تھیں۔ اس لئے اسی سلسلہ میں موجودگان کے معمولات و دستورات کا بھی مختصراً ذکر کر دینا دشتِ فنا کے مجہ بھٹکے ہوئے مسافر (مقبول نامقبول) کے نزدیک دخل بیجا متصور نہ ہوگا۔

آدمِ ثانی نوح علیہ السلام کے دلبند فرزند جنابِ سام علیہ التحیات کی آل و عترت اور انبیائے بنی اسرائیل کے نام لیوا اور حلقہ بگوش خاصکر حضرتِ موسیٰ کی آتشیں شریعت کے پیرو اور جنابِ مسیح کے حوادین کے اخلاف و ذریت اب بھی اسی داڑھی مونچھ والی مردانہ عظمت و شوکت کے ساتھ جلوہ افزا نظر آتے ہیں۔ عربوں کی نسل اور امتِ اسلامی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ارکانِ امجاد نے خواہ کسی سرزمین پر ہوں' اب بھی اپنی آبائی وضع کو قائم رکھا ہے۔ متنفر نجانہ[۴۵۳] ادعائی یا خود افترائی[۴۵۴] شان پر قربان نہیں کیا ہے۔

---

[۴۵۳] مقلد یہ رب۔ [۴۵۴] ادعا۔ دعوی کرنا۔ آرزو کرنا۔ افترا۔ بہتان باندھنا۔ کسی پر جھوٹ لگانا۔

تقلیدی مسلمان ہوں۔ مذہبی حیثیت سے ریش و بروت کے معاملہ میں میری آگاہی چنداں وسیع نہیں۔ اعتراف ہے کہ صرف اہل سنت وجماعت کے مسائل تک محدود ہے۔ میں نے اس بارہ میں شیخ الاسلام شمس الدین ابن قیم محدث کے فوائد اور نواب صدیق حسن خاں کی تصانیف (اتحاف النبلاء وغیرہ) پر نظر ڈالی اور کسی قدر تفصیل سے لکھنا چاہا تھا۔ لیکن المنار المصریہ کے مجلدات میں ایک مستند جامع و مانع تحریر دستیاب ہوگئی۔ اس پر قناعت کرتا اور ترجمہ اردو مع اصل عربی کے پیش کرتا ہوں۔

بیروت (ایشیا کے دار العلوم والفنون) کے ایک پیر صالح عبد الحفیظ ابراہیم لاذقی نے علامہ سید رشید رضا طاب ثراہ سے سوال کیا تھا کہ آیا مرد کے لئے مونچھوں اور داڑھی کا منڈانا حلال ہے۔ یا ایسا کرنا فسوق (برے کام) اور گمراہی میں داخل ہے۔ اور آیا ایسے شخص کی شہادت (گواہی) اور نماز میں امامت وغیرہ قبول کی جاسکتی ہے یا نہیں۔ تو علامہ مغفور نے یہ جواب دیا تھا:۔

"ریش و بروت کے منڈانے کے بارہ میں: داڑھی کا منڈانا مکروہ ہے۔ حدیث صحیح میں اس کے اعفاء (بالوں کو انبوہ کرنے) کا حکم موجود ہے۔ مونچھوں کا منڈانا اسکو بھی بعض علماء نے مکروہ بتایا ہے۔ افضل

یہ ہے کہ ان کو کتروا دیتے اور اسکی اصل بھی یہی حدیث شریف ہے وا حفوا الشارب واعفوا اللحیٰ (مونچھوں کو باریک کر اور اور داڑھی کو چھوڑ دو) ۔ بخاری اور مسلم دونوں نے حضرت ابن عمر سے اسکو مرفوعاً روایت کیا ہے۔ یہ دونوں چیزیں فطرۃ کے خصائل (خوے نیک) اور زینت وحُسنِ ہیئت (شکل وصورت کی خوبی) سے تعلق رکھتی ہیں۔ تَعَبُّد (بندگی و عبادت) سے وابستہ نہیں۔ "اعفاء" کے معنے ترک یعنی چھوڑ دینے کے ہیں۔ "احفاء" سے مقصود مونچھوں کے کتروانے میں مبالغہ کرنا ہے۔ اوسط یہ ہے کہ مونچھوں سے اُس قدر کو کٹوا دیا جائے جس سے دونوں لب چھپنے لگے ہوں۔ اور سلف سے بھی ایسا ہی مشہور چلا آتا ہے۔ ان بزرگوں (سلف) میں سے بعض نے اس میں بھی مبالغہ کیا ہے۔ اور بعض نے منڈوایا ہے۔ لیکن امام مالک فرماتے ہیں کہ مونچھوں کا مُنڈانا بدعت ہے جو لوگوں میں پھیل گیا ہے۔ "اعفاء لحیہ" سے صریحاً داڑھی کو اُسکی حالت پر چھوڑ دینا مراد ہے۔ اور بعض کا قول ہے کہ ہاتھ کی ایک موٹھی (قبضۂ دست) سے جتنی بڑھ جائے اُس کا کٹوا دینا مستحب ہے۔ یہ ہی بعض سلف سے منقول ہے۔ انھوں نے صراحت فرمائی ہے کہ داڑھی کا منڈانا مکروہ ہے۔ امام احمد نے فرمایا ہے کہ داڑھی کا وہ حصہ جو حلق کے نیچے

ہوا اُس کے منڈا دینے میں مضائقہ نہیں۔ اسی وجہ سے آپ حنبلیوں کی جماعت کثیر کو دیکھتے ہوں گے جو (ذقن) کے نیچے (اسفل) کو پورا پورا منڈا دیتے ہیں۔ اُن کا عمل اسی روایت پر ہے۔ لیکن حلق باہر (خارج) کی طرف سے ذبح کرنے کا محل ہے اور اندر (داخل) سے کھانے کے نگلنے اور سانس کے نکلنے کی جگہ ہے۔ اس لئے حلق سے اوپر یعنی ذقن کے نیچے جو کچھ ہے اُس کا منڈا دینا اس روایت کے معنے میں نہیں آتا اور نہ اس سے داڑھی کی خوش نمائی میں نقص واقع ہوتا ہے۔

علامہ مبرور کی عبارت یہ ہے:—

حلق اللحیۃ والشارب = حلق اللحیۃ مکروہ للامر باعفائھا فی الحدیث الصحیح۔ واما حلق الشاربین فکرھہ بعض العلماء والافضل قصھما۔ والاصل فی ذٰلک حدیث "احفوا الشارب واعفوا اللحی" رواہ البخاری ومسلم من حدیث ابن عمرؓ مرفوعًا وھذا من خصال الفطرۃ المتعلقۃ بالزینۃ وحسن الھیئۃ لا التعبد۔ والاعفاء الترک، والاحفاء المبالغۃ فی القص، واوسطہ ان یقص منھما ما یغطی الشفتین وھو المشھور عن السلف، ومنھم من بالغ فی ذٰلک ومن حلقہ، ولکن

قال الامام مالك حلق الشارب بدعة ظهرت في الناس
والظاهر من اعفاء اللحية تركها على حالها - وقال بعضهم
بل يستحب قص ما زاد منها على قبضة اليد - ونقلوه عن
بعض السلف و صرحوا بان حلقها مكروه - وقال الامام
احمد لا باس بحلق ما تحت حلقه من لحيته - فترى كثيرا
من الحنابلة في هذا العصر يحلقون ما اسفل الذقن كله عملا
بهذه الرواية ولكن الحلق من الخارج مثل الذبح ومن
الداخل مساغ الطعام ومخرج النفس - فحلق ما فوق الحلق
وهو اسفل الذقن كله لا يدخل في معنى هذه الرواية
وهو ينقص من جمال اللحية عه

عصر حاضر کی اسی بزرگ ہستی کو دنیائے اسلام "السید الامام حکیم
الاسلام المصلح العظیم والمرشد الحکیم سیف اللہ المنتضی العلامۃ السید
محمد رشید رضا" کہہ کر یاد کرتی ہے۔ اللّٰھم اغفر لہ۔

صفحہ ۱۳۷ ۔ مقالہ ۲۸ - گوتھ اور وزی گوتھ

اہل علم کے طبقوں میں گوتھ GOTH اور وزی گوتھ VISI -
GOTH - دونوں کافی شہرت رکھتے ہیں۔ تاہم بعض قدر افسر

عہ المنار المصریہ - جزء سادس المجلد ۳۱ - شعبان ۱۳۴۹ھ جنوری ۱۹۳۱ء

قارئین کی آگاہی کے واسطے بقدر تفصیل لکھ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ زیادہ تفصیل و معلومات کا شوق ہو تو نسیپ اسمتھ کی ضخیم و مبسوط "تاریخ دنیائے قدیم"[۳۵۵] HISTORY OF ANCIENT WORLD ملاحظہ کی جائے یہ آگاہی دونوں جماعتوں کے متعلق یکساں کارآمد اور دلچسپ ثابت ہوگی۔ میں نے مختلف زبانوں کے متعدد لغات اور فرہنگوں نیز ڈاکٹر ٹیلر (DR. W. COOKE TAYLOR'S ANCIENT HISTORY) اور پروفیسر غلام مصطفیٰ کی تواریخ متقدمین[۳۵۶] پر نظر ڈالی اور ان سے استفادہ کیا ہے۔ ڈاکٹر چارلس اینندیل ANNANDALE کی جامع لغت[۳۵۷] سے بھی بالخصوص نفع اٹھایا ہے۔

روم الکبریٰ کے شہنشاہ ڈی سی اس (ڈی شی اس[۳۵۸]) DE-CIUS کو اپنے تخت پر کچھ ہی عرصے فراغت و سکون کے نصیب ہوئے تھے کہ اسکو دریائے ڈینوب (DANUBE) کی طرف جانا پڑا۔ گوتھ لوگوں نے لشکر کشی کی تھی۔ استعمال لا بد[۳۵۹] ہوا۔ یہ ۲۵۰ء کا واقعہ ہے۔ مگر انجام یہ ہوا کہ بڑے کشت و خون کے بعد گوتھوں نے اپنے مخالفین کو ایسی حقارت آمیز و ذلت بخش شرطوں کے قبول کرنے

---

[۳۵۵] تیسری جلد صفحہ ۲۲۰۔ [۳۵۶] مطبوعہ ۱۸۷۷ء لاہور۔ [۳۵۷] صفحات ۲۲ و ۳۱ و ۱۵۶۔ [۳۵۸] صفحہ ۳۶۷ خاتمہ مقالہ ہذا۔ [۳۵۹] ناچارہ۔ ناگزیر۔ بالضرورہ۔

اور صلح کر لینے پر مجبور کیا، جنھوں نے سلطنت کی عزت و شان کو خاک میں ملا دیا۔ مشہور مورخ ایڈورڈ گبن (GIBBON) [۴۶] فرماتا ہے کہ "یہی سب سے پہلا اور قابل لحاظ موقع ہے کہ جب اس عظیم الشان قوم کا تذکرہ صفحاتِ تاریخ پر نظر آتا ہے، جس نے بعد کو اہل روما کی قوت کو پارہ پارہ کر دیا، دار السلطنت کو غارت و تباہ کر ڈالا تھا" گال (GAUL) (پرانا فرانس یا گالیا (GALLIA) و بلجیم یا گلیشیا جس کو تین صدی قبل مسیح کے قوم گال نے یہاں آ کر بسایا تھا) اسپین (اندلس) اور اطالیہ میں اپنی طاقت و حکومت کے ڈنکے بجا دئے [۴۷]۔ فرمانروائی کرنے لگے۔ سلطنت مغربی (ویسٹرن ایمپائر) کے انقلاب و بربادی میں انھوں نے جو حصہ لیا، جس طرح عمل کیا، اوراقِ زمانہ پر ثبت چلا آتا ہے۔ یہ اسی ہنگامہ آرائی و پیکار کا ثمرہ و نتیجہ ہے کہ گوتھوں کا نام اکثر و بیشتر (مگر ناواجب و بیجا طور پر) جاہل وحشی، جنگ جو، بے رحم و سنگ دل کے اضافہ یا لقب کے ساتھ عام طور پر مستعمل ہوتا ہے"۔ اہل لغت بھی، کمال بیدردی سے اسی طرح

---

[۴۶] ولادت ۱۷۳۷ء۔ وفات ۱۷۹۴ء "عروج و زوالِ سلطنتِ روما کی تاریخ" اس وسیع النظر انگریز کی بہترین یادگار ہے۔ [۴۷] مصنفہٗ صفحات ۲۲، ۱۳۰۔

۞ ۞ ۞

باور کرنے اور دوسروں کو باور کرانا چاہتے ہیں۔

اس نامور قوم کی اصل و نسل کا احوال پردۂ خفا[۴۶۲] میں ہے۔ ہمارے پاس قابل اعتماد و استناد ذرائع معلومات ہی اب کون بہت سے باقی ہیں۔ صرف دو! ایک ٹےسی ٹس TACI-TUS اور چند اور لکھنے والوں کی شہادت و تصدیق۔ دوسرے "خود" زبان کا "قول فیصل" یعنی اُسکی صاف و صریح توثیق۔ چوتھی صدی مسیحی میں بشپ الفلس (BISHOP ULPHILAS) نے بائبل کا ترجمہ گوتھک زبان میں کیا تھا، جو اَب تک محفوظ ہے اور جس کی تحویل میں یہ شہادت موجود ہے۔ انھیں دونوں کے بھروسے پر کہا جاتا ہے کہ "گوتھ جرمن قوم کے زہ و زاد[۴۶۳] تھے"۔ حسب روایت الفلس ان کا وطنی (اصلی) نام گُتھنڈا (GUTTHINDA) تھا۔ مختلف لکھنے والوں خصوصاً یونان و رُوما کے اہل قلم کی بدولت اس نام نے بہت سی صورتیں، طرح طرح سے، اختیار کر لی تھیں۔ یعنی گوٹون GUTTONE، گٹ ٹون، گوتھوں GOTHONES، (GOTONES) گتائی (GUTAE) سب کچھ ہی تھے۔ بالآخر گوتھ GOTHI قرار پائے۔ سلسلۂ تلاش کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ اسکندر اعظم کے زمانہ میں پائی تھی اس

---

[۴۶۲] بفتح، پوشیدگی۔ [۴۶۳] بچہ و فرزند۔ اہل و عیال۔

(PYTHEAS) جو مارسیلز MARSEILLS کا جہاز راں اور اپنے فن کا ماہر کامل ہے گوتھونس کو بحر بلٹیک BALTIC کے جنوبی ساحل پر خلیج ڈانٹ سیک (دانسیخ) DANZIG میں پاتا ہے۔ یہ زمانہ سالِ مسیحی کی ابتدا کے قریب قریب تحقیق ہوتا ہے۔ یہ حقیقت تو اب تک عریاں نہ ہو سکی کہ آیا یہ قبائل اپنے وقتوں کے قواعد اور دستوروں کے مطابق خانہ بدوش سمجھے جاتے تھے یا کیا؟ البتہ اس قدر ثابت ہوا ہے کہ ان لوگوں کے خاص مواطن و مساکن اسی ساحل پر تھے۔ جو دریائے وسچولا VISTULA کے بائیں کنارے پر دور تک چلے گئے تھے۔

تیسری صدی کے شروع ہوتے ہی ان لوگوں نے زبردست ترکِ وطن کر ڈالا اور پرشیا (PRUSSIA) کے ساحل بالا سے بحر بالٹک کو چھوڑ کر اوکرین (UKRAINE) کے اسٹپ (میدانوں، بیابانوں) میں چلے آئے۔ بحرِ اسود کے شمال، بود و باش اختیار کی۔ اور ڈیسیا (DACIA) میں برابر بڑھنے اور اپنی آبادی بڑھانے پر کمر ہمت باندھ لی۔ ان کا مقصود ممالک کو فتح کرنا نہیں ہوتا تھا نہ حکومت و سربلندی پر نظر رکھتے تھے۔ بلکہ اپنی تجارت کو فروغ دینے اور کاروبار کے بڑھانے اور صنعت و حرفت کی گرم بازاری کے لئے اپنی بستیاں ساحلوں پر قائم کرتے چلے جاتے تھے۔ وہ دولت و قوت، اجتماعی نظام، آزادی

وتہذیب میں خود کو اپنے قرب وجوار اور وطنِ اصلی سے بڑھ چڑھ کر رکھنا اور دکھانا چاہتے تھے۔

پھر یہ قوم دو شاخوں میں منقسم ہو گئی تھی۔ (۱) آسٹروگوتھ OSTROGOTHS۔ (۲) وزی گوتھ (VISIGOTHS) بہ اختلاف لہجہ و تغیر بعض حروف یہ دونوں آسٹروگوتھ AUSTROGOTHI اور وزی گوتھ (WESEGOTHI) یعنی مشرقی و مغربی گوتھ بھی کہے جاتے تھے۔ مقدم الذکر یورپ کے رتیلے اسٹپ (میدانوں) میں صحرانشیں و سکونت گزیں تھے۔ دوسری شاخ نے پچھم کے زیادہ سرسبز اور درختوں سے ہرے بھرے قطعاتِ زمین کو پسند اور آباد کیا تھا۔ یوں سمجھئے کہ وزی گوتھ اب اس ملک میں آباد ہو گئے جو پہلے تھریسیا کے گیٹائی لوگوں (THRACIAN GETAE) کے تصرف و قبضہ میں تھا۔ ان دونوں ناموں کی عجیب و غریب مماثلت[۲۶۴] سے ان دونوں قوموں کے باہم اشتباہ پیدا ہو جاتا تھا۔ جو بہت سی کشاکش اور پریشانی کا سبب ہوتا تھا۔ یا یہ کہہ دیجئے کہ اکثر دھوکا ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر لے تھم (LATHAM) کا خیال ہے کہ یہ تشابہ[۲۶۵] محض اتفاقی تھا۔ وہ قرار دیتے ہیں کہ GET یا گوتھ کا

---

[۲۶۴] مانند ہونا۔ [۲۶۵] ایک دوسرے کے مانند ہونا۔

نام عام تھا جو سلے وانی SLAVONIC (یعنی مشرقی یورپ کی روسی بلغاری، سربیا، پولینڈ، بوہیمیا وغیرہ کی) قوموں نے لی تھوانی لوگوں (LITHUANIANS) کو دے رکھا تھا۔ موصوف کا خیال ہے کہ انھیں لیتھوانی قوموں سے یہ دونوں یعنی دریائے وسچولا کے دہانہ کے رہنے والے گوتھ اور دریائے ڈینیوب کے گٹائی (فرقہ جرمنی)[۴۶۷] GATAE منسوب و وابستہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب یقین فرماتے ہیں کہ تاریخ میں جن گوتھوں کا ذکر پایا جاتا ہے وہ جرمن خون ہی کے تھے۔ یہی جلائے وطن کر کے ڈینیوب پر آگئے تھے۔ انھوں نے جب گتائی GETAE کے ملک میں رہنا سہنا اختیار کر لیا تو سب سے پہلے گوتھ کا نام انھیں نے پایا۔

مزید برآں گوتھوں کا التباس[۴۶۶] سرماشیا SARMATIA والوں سے بھی ہو جاتا رہا ہے۔ سرماشیا والوں کا مقابلہ مختلف اقوام ممالک سے ہو چکا تھا۔ اہل فارس سے تو اکثر بلکہ ہمیشہ یہ شکست ہی کھاتے رہے ہیں[۴۶۸] انھیں سرماشیا والوں کو پرانے یونانی مورخ سیتھین (SCYTHIANS) لکھتے تھے۔

---

[۴۶۶] صفحہ ۲۱۴، مصطفیٰ۔ [۴۶۷] پوشیدہ ہو جانا۔ مل جانا۔

[۴۶۸] صفحہ ۲۲۷، مصطفیٰ۔

ایسی ہی خانہ بدوش جماعتوں کی نسبت لاطینی شاعر ہوریس (حارث) (HORACE) یعنی HORATIUS کہتا ہے۔

THE SCYTHIANS OF PLAINS

MORE HAPPY ARE, HOUSED IN

WANDERING WAINS

(ترجمہ) میدانوں میں بسر کرنے والے سیتھین لوگ زیادہ خوش اور فارغ البال ہوتے ہیں جب اپنے ہرزہ گرد انہ چھکڑوں اور لدو گاڑیوں میں مکین ہوں۔

ان کے علاقوں پر جنوبی روس میں اس وقت گوتھ قابض و متصرف ہو چکے تھے۔ یہ بھی گمان کیا جاتا ہے کہ یہی سرماشین لوگ باشندگان روس اور پولینڈ کے اجداد تھے۔ سیتھین پرانا نام ہے جو ایک بڑے لمبے چوڑے قطعۂ زمین کو جو شمال و مشرق میں بحر اسود، بحیرۂ خزر اور بحیرۂ آرال کے واقع تھا، دیا گیا تھا۔

گبن کی رائے یہ ہے کہ "نوعِ انسانی کے یہ بڑے بڑے گروہ بعض بعض باتوں میں امتیازات خاص رکھتے تھے۔ ان کے جھونپڑے یا قابلِ حمل و نقل خیمے مستقل طور پر نصب رہتے تھے۔ ان میں سے کسی کا لباس چست ہوتا تھا، کسی کا ڈھیلا ڈھالا۔ ایک زوجہ

یا کئی کئی ہی بیان کرتے تھے۔ لشکری قوت رکھتے تھے۔ جس میں بڑا
حصہ فوج پیادہ کا ہوتا تھا یا سواروں کا۔ سب سے بڑی بات تو
یہ تھی کہ ٹیوٹانک (TEUTONIC) یا سلیوانی SLAVANIAN زبان
بولتے تھے۔" (ٹیوٹانک میں بہت سی زبانیں داخل ہیں یعنی گوتھک
اینگلو سیکسن اور انگلش نیز ڈچ کی، جرمن کی، آئس لینڈ کی،
ناروے کی، ڈنمارک اور سویڈن کی۔ یہی زبانیں یا زبان مجموعی
طور پر ٹیوٹن لوگوں کی کہلاتی تھیں)۔

کچھ گیت اور کہانیاں = مگر ان بہشتی اوراق کے قصیدہ گویانہ
ادب و انشا کی قدر و قیمت کا مسئلہ و شہادتوں سے پاک
نہیں ہے۔ مشہور فلسفی و مورخ گبن کا ارشاد ہے "پرانے گیتوں پر ایمان
رکھنے سے جو غیر معتبر بلکہ عہدِ توحش کی محض یادگاریں ہیں، انھوں نے
(یعنی CASSIDORUS AND JORNANDES نے)
گاتھ لوگوں کی پہلی نسل FIRST ORIGIN کا نتیجہ نکالا تھا[۲۷]
شاعر کبھی کبھی واقعات قابل قدر بھی لکھ ڈالتا ہے لیکن اُس کو تو ڈھن

---

۶۹ بھاگ جانا۔ نفرت کرنا۔ نمبر ۲۷ سلطنت روما کا عروج و زوال، مرتبہ
اسمتھ، جلد اول، صفحہ ۳۷۵۔ DECLINE AND FALL. ED. W.

SMITH, I., 375.

ہوتی ہے اُس قبیلہ و قوم کی مدحت سرائی و عزت افزائی کی، جس کا وہ ایک فرد ہوتا۔ اس لیے وہ اُن کی فتوحات میں مبالغہ کر جاتا اور شکستوں میں بھی رنگ بھر بھر کر دکھاتا ہے۔ بے شبہ شاعرانہ دفاتر، داستانیں اور تحریرات، سب نہیں تو بھی کچھ نہ کچھ وقوعات قدیمہ کی شہادت کے لیے کارآمد ہو سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ لیجیے کہ ان سے اُن عادات و عقاید پر روشنی پڑتی ہے جو اس شاعر کے زمانہ میں پھیلے ہوئے تھے۔

مشیر الدولہ خلیفہ محمد حسین نے وقائع سیر و سیاحت ڈاکٹر پرفی اور میں لکھا ہے کہ شہر الفیسس EPHISUS (واقع ایشیا ئے کوچک) کے مندر کو دوبارہ تعمیر ہو جانے پر بھی گاتھ قوم کے لوگوں نے (جو پرانی جرمنی کی ایک مشہور لڑاکا اور وحشی قوم تھی) ۲۵۶ء میں تجلا ڈالا۔[۱]

پرنسپل وائٹ (R.A. WHYTE) گوتھ کے متعلق اسی قدر لکھ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ یہ وحشی یورپ کے قدیم باشندوں میں کی اُس ایک قوم سے تھے جو دریائے الیب (ELBE) اور وستولا (VISTULA) کے درمیان کی سرزمین پر رہتی تھی۔[۲]

---

[۱] جلد دوم صفحہ ۱۸۶، نوٹ مطبوعہ آگرہ ۱۳۲۱ھ۔ [۲] دی نیو سنچوری انگلش اردو ڈکشنری، مدراس، ۱۹۰۵ء

ہمارے زمانہ میں دو چیزیں گوتھ کے ساتھ منسوب اور باقی رہ گئی ہیں۔ ایک تو ان کا طریقہ تعمیر ہے۔ اور "گوتھک" سے موسوم ہے۔ اس طریقہ کی عمارات میں ایک شان اور کچھ خصوصیات ہوتی ہیں جن کی اب بھی قدر و تحسین کی جاتی ہے۔ مثلاً۔ محرابوں کا نکیلا ہونا۔ بیل بوٹے خوش نما ترکیب سے گو دیچے پڑتے بڑے، ناتراشیدہ۔ اسی کے تناسب و باہدگر پیوستگی کے ساتھ عمارت کے سارے اجزا کا متصف ہونا وغیرہ۔ [۲۷۴] بلندی، ستون، مرغول اور کارنس ہر چیز میں اہی تناسبتیں، اور عمارات کے اوضاع خمسہ کا تطابق اور احتیاط و توافق کے ساتھ ملحوظ رہنا۔ ہندوستان کی بعض مغلیہ تعمیرات کے سلسلہ میں بھی اس کا نام لیا جاتا ہے۔ قلعۂ دہلی کے لاہوری دروازہ کی نسبت بشپ ہیبر (BISHOP REGINALD HEBER) فرماتے ہیں کہ "میں نے ایسا شاندار پھاٹک اپنی عمر میں نہیں دیکھا تھا اس دروازہ میں ایک عظیم الشان گاتھک محراب کے علاوہ ایسی مسقف گزرگاہ ہے جیسی کہ گاتھک وضع کے گرجاؤں میں ہوتی ہے" [۲۷۴]

واضح رہے کہ چوک چیتہ یا مسقف بازار یا کوچہ خود شاہجہاں کی ایجاد ہے۔ انگلستان کے پارلیمنٹ کے فلک فرسا ایوانات (لندن)

---

[۲۷۳] نیو سینچوری ڈکشنری [۲۷۴] رہنمائے سیر دہلی، صفحہ ۶۳۔

گا تھک تعمیرات کا بہترین نمونہ اور اُس طرز کے نقش و نگار و آرائش کی خوشنما یادگار ہیں۔ عرب بھی اس طریق عمارت نہ ہندسۃ الغوثیہ پر فریفتہ نظر آتے ہیں۔ لوبیس البری اپنے قطعہ "دار الندوہ" میں فرماتا ہے :-

نقش المھندس سقفھا و جدارھا
بنقوش اھل "الغوث" احسن نقشۃ [۴۷۵]

(ترجمہ) ماہرِ فنِ تعمیر (انجینئر) نے اس کی چھت اور دیوار پر گوتھ والوں کی نقاشی سے اچھے سے اچھے نقش کردئے ہیں۔

دوسری چیز گوتھک ٹائپ ہے۔ جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے یہ سیسے کے حروف جلی اور اُبھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ لوح (سر ورق) کی تیاری و تکمیل اور متفرق کاغذات کے چھاپنے میں اچھا کام دیتے ہیں۔

صفحہ ۲۵۱۔ ڈی سی اس

کا نام آغازِ مقالہ ہٰذا میں لے چکا ہوں اب بقدرِ قلیل اُس کا ذکر کردینا بھی لازم سمجھتا ہوں۔ ٹراجے نس ڈی سی اس (TRAJA- NUS DECI- US) افریقہ والوں کا سپہ سالار تھا، جس کو فلیفوس

---

[۴۷۵] دیوان شعر النحلہ، لوبیس بک صاحب جی، صفحہ ۵۷

عرب بادشاہ نے ایک حملہ آور کے مقابلہ و مدافعت کے لئے بھیجا تھا۔ ڈی شی اس نے خود کو قیصر مشہور کر دیا۔ ڈی شی اس اور گارڈین متعددی سے ۲۴۹ء میں لڑائی ہوئی۔ اس نے اپنے حریف مقابل کو شکست دی۔ وہ مارا گیا۔ یہ خود مستقل بادشاہ بن بیٹھا۔ اس نے عیسائیوں پر بڑے بڑے ظلم کئے تھے۔ ٹیلر صاحب "تاریخ قدیم" میں لکھتے ہیں کہ اس کے جور و ستم کی نظیر تاریخ میں پائی نہیں جاتی۔ یہ بے رحم شخص عیسائیوں کو گرجاؤں سے گھسیٹ گھسیٹ کر لاتا اور طرح طرح کی ایذائیں دیتا تھا۔ بہت سے عیسائی مقتدا جیسے پولوس ربانی فرقہ راہبان) وغیرہ بھاگ بھاگ کر پہاڑوں اور جنگلوں میں جا چھپے اور پناہ گیر ہو گئے تھے۔ بڑے بڑے پادریوں پر اس کی نظر قہر پہلے پڑتی تھی۔ روم کا اسقف فیبئن انطاکیہ کا اسقف بی بی لز یروشلم کا اسقف سکندر سب کے سب اسی کے حکم سے شہید اور طعمۂ نہنگ اجل بنائے گئے تھے۔ اس کے ظلم و تعدی کو قوم گوتھ کے حملہ نے تھوڑے دن کے لئے روک دیا تھا۔ وہ ڈینیوب کو عبور کر کے میسیا کو آئے اور تاخت و تاراج کیا۔ ان سے مقاتلہ و مجادلہ میں ڈی شی اس بھی ۲۵۱ء میں مارا گیا ۔ اس کے بعد مارکس پردیس کا نام ملتا ہے جو بے لڑے

۱؎ صفحہ ۲۲۵ امر مصطفیٰ۔

جھگڑے شاہنشاہ ہو گیا تھا جس نے ایشیا سے فرانس کی جانب کوچ کیا تھا۔ جہاں جرمنوں نے حملے شروع کر دیئے تھے۔ اس نے جرمنی کو شکست دی۔ تھریس سے گزر کر گوتھوں کا مقابلہ کیا۔ بہادری سے لڑا اور اُن کو مار مار کر بھگا دیا[۴۷۷]۔ گوتھوں کا نام عیسوی تقویم کی ابتدائی لڑائیوں اور کامیاب فوج کشیوں میں بار ہا آیا ہے[۴۷۸]۔ یہ ملکی دستور تھا کہ بادشاہت کا کام دو شخص کیا کرتے تھے۔ ایک شہنشاہ کہلاتا تھا۔ دوسرا قیصر، جو درجہ میں اُس سے کم ہوتا تھا[۴۷۹]۔

صفحہ ۱۲۹ - نوٹ نمبر ۶۹ - منوجی

ہندوؤں کے اقوال و روایات و اعتقادات کے مطابق برہما کے فرزندِ دلبند اور تمام اولادِ نرینہ میں پہلوٹھی (سب سے پہلے) تھے۔ کپل جی منو کے پوتے تھے۔ یہی بزرگ "سنکھ شاستر" کے مصنف ہیں جس میں وہ "گینا" کا نام بھی لیتے ہیں جو اُن معاملات کے متعلق ہے جو "دواپر کے خاتمہ یا کل جگ" کے آغاز میں وقوع پذیر ہوئے۔ منوجی اُس آئین کے بھی مدوّن و جامع ہیں جو اُن کے نام نامی سے منسوب چلا آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ "ست جگ" میں بھی موجود تھا جس کی سند

---

[۴۷۷] صفحات ۲۲۷ و ۲۳۴۔ [۴۷۸] صفحات ۲۳۴، ۲۳۶، ۲۳۷۔

[۴۷۹] صفحہ ۲۲۰۔

یہ اشلوک ہی :-

"جب ست جگ کے ایک ہزار دس برس گزر گئے تو میں (منو) نے بہدرمہینے کی پورن ماسی کو برہما کے حکم سے اس شاستر کو ختم کیا۔ نمبر ۴۸

یہ شاستر میری نظر سے تو نہیں گزرا، لیکن مسٹر کروک لکھتے ہیں کہ اس کا ترجمہ DR. G. BÜHLERS ڈاکٹر بوہلرز THE LAWS کے قلم سے شائع ہو چکا ہی۔ آکس فورڈ میں ۱۸۸۶ء میں چھپا تھا۔ ابھی حال میں (۵ اپریل جنوری ۱۹۴۵ء کو) مسٹر ایس۔ آر۔ مسر اسنے ایک لکچر میں فرمایا تھا کہ جرائم کا سب سے پرانا قانون اور ان کی سزاؤں اور تعزیرات کا مجموعہ آئین وہی ہی جو منو شاستر کے نام سے شہرت رکھتا ہی۔ اور جس کی ترتیب و تدوین حضرت مسیح سے تقریباً ۸۰۰ سال پیشتر ہوئی تھی۔ سماج کی حالت پر جو اس وقت تھی نگاہ ڈالتے ہوئے تسلیم کرنا پڑتا ہی کہ میکالے (MACAULAY) کے مجموعہ سے وہ کہیں زیادہ مکمل تھا۔ سر ولیم جونز نے منو کے مجموعہ کی جو تنقید فرمائی ہی اس کی تردید خود اسی تنقید سے ہو جاتی ہی۔ اور روشن ہو جاتا ہی کہ سر ولیم نے سوسائٹی کی اس وقت کی حالت کا قطعاً لحاظ

نمبر ۴۸ بیل کی ڈکشنری صفحہ ۱۷۱ -

نہیں فرمایا جس کے لئے یہ قانون مرتب ہوا تھا۔ مسٹر مسرا نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قانون مذکورہ کے رُو سے جو رعایت برہمنوں کے لئے رکھی گئی تھی وہ بالکل واجب اور قطعاً منصفانہ تھی۔ اُس زمانہ کا برہمن نہایت درجہ قیمتی و بیش بہا ہوتا تھا۔ وہ تمامی علوم دینی و دنیوی کا جامع و حافظ اور ایک زندہ انسائیکلو پیڈیا (دائرۃ معارف) ہوتا تھا۔ یہ ہی سبب تھا کہ راجہ کو برہمن کی جان لینے کی ممانعت تھی۔ وہ جلاوطن کیا جا سکتا تھا مگر جسمانی ایذا اُس کو نہیں پہنچائی جا سکتی تھی۔ کہ جس سے دنیا اُس کے فیوض اور کارآمد ہونے سے محروم ہو جائے۔ اسی منوشاستر نے ایک بڑی حد تک مجموعۂ تعزیراتِ ہند کے مسودہ و مناط ہونے کا کام دیا ہے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ منوشاستر نیز بارہ فہرستیں اور اینگلو سیکسن قانون کا نقش یا ٹھپہ اس پر لگا ہوا ہے۔ جہاں ہر متنفس کی زندگی کی قیمت لگا دی گئی ہے۔ اور عورتوں کے بارہ میں اُس وقت سماج کے خیالات کیا تھے اسکو بھی ایک قدیم مستند ہند و دانش مند کی زبان قلم سے سن لیجیئے، جو ان ہی برگوالر کے حوالہ سے لکھتا ہے:۔

" زہر قاتل پہ یا دریا کی طغیانی یا آندھی پہ یا خوبصورت قوی الجثہ ہاتھی پہ یا شکار کے بھوکے شیر پہ یا موت کے فرشتہ پہ یا چولہ

ڈاکو، قاتل پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے، مگر عورت کا کسی نے اعتبار کیا تو یقیناً یاس و حرماں کے صحرا میں سرگرداں ہوگا۔" ایک دوسری ملت کا فیصلہ و فتوے بھی سن لیجئے۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی (صفحہ ۳۳، رسالہ معارف ماہ فروری ۱۹۳۵ء) تحریر فرماتے ہیں کہ "عیسائی مذہب میں عورت ہی پر اُن سارے مصائب کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے جن میں آدم اور اولادِ آدم اس خاکدانِ ارضی میں مبتلا ہے۔ اربابِ کلیسا کا فتوے ہی یہ تھا کہ عورت صرف گندگی اور نجاست ہے۔ وہ شیطان ہے۔ اُس میں روح نہیں ہے ...."

صفحہ ۱۳۹۔ نوٹ ۷۰۔ گھونگھٹ

"گھونگھٹ" کا نام کسی مستقل پارچہ یا جزوِ پوشاک کی حیثیت سے نہیں لیا جا سکتا۔ بے شبہ یہ ایک ایسی بنیادی چیز ہے جو فروشِ گندم نما ہے، جس کے بغیر ظاہری سوشیل معاشرت و لباسِ نسوانی کا تکلف و ثقاہت[۱۸۱]، عروسانہ لوچ اور نزاکت ناقص و رادعوی رہ جاتی ہے۔ نفس الامریہ ہے کہ گھونگھٹ اور اُس کے نگاہ کو چھپا لینے والے تمام انداز بجائے خود ایک مستقل بحث و تحریر کے متقاضی

[۱۸۱] استوار رہنا۔ معتبر و معتمد ہونا۔

وحقدار نظر آتے ہیں۔ مگر اس کا پورا ہونا شاید کسی دوسرے وقت پر منحصر یا مقدر ہے۔[۴۸۲]

ع۔ رہروِ راہِ فنا تو آخری منزل میں ہے

سات سو برس ہوئے شیراز کا جہاندیدہ جہاں گرد دانش مند اسکی بدولت دھوکا کھاتے کھاتے بچا تھا۔ اُس نے اپنی زبان بھی کسی رنگین نوائی سے کام نہیں لیا بلکہ اپنے روکھے پھیکے پند و نصائح کے انبار میں اپنے تلخ تجربے اور خوبرویانِ زیرِ چادر کی نمائشی رعنائی دلربائی کی حقیقت کو بے نقاب فرما دیا ہے:۔

بس قامتِ خوش کہ زیرِ چادر باشد

چوں باز کنی مادرِ مادر باشد[۴۸۳]

اسی (گھونگھٹ) کی دل لبھانے والی اداؤں پر مفتون ہو کر یا یوں کہیئے کہ اپنی افسردگیوں اور حسرت ناکیوں سے مجبور و محجوب ہو کر مرزا نوشہ ایسے مردہ دل فلسفی شاعر کی بجھی ہوئی طبیعت میں بھی گرمی اور ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس جامِ بے صہبا میں خمِ بادہ

---

۴۸۲ تقدیر کیا ہوا۔ ۴۸۳ گلستانِ سعدی، مطبوعہ آصفی کانپور، سنہ ۱۲۸۰ھ باب ہشتم آدابِ صحبت، صفحہ ۱۴۷۔ ۴۸۴ افسردہ بمعنی سردی اور ٹھنڈ سے پژمردہ ہو گیا ہو۔ یخ بستہ۔

Mahar Online Composing Center | Mahar M. Mazhar Kathia | 0303-761-96-93

کا جوش اس طرح آیا تھا۔

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں[۴۸۴]

سنتا ہوں کہ اس سے بھی۔ ڈیڑھ صدی پہلے مغلوں کے عہد میں مغلوں ہی کے قلمرو سے فارسی اور بھاکا کی ملی جلی سرزمین سے ایک صدا بلند ہوئی تھی:۔

قیامت ہے نرا گھونگھٹ کے اوٹوں میں لٹک جانا
ملا انکھیاں سو انکھیاں مسکراہٹ کر سٹک جانا[۴۸۹]

دیکھتا ہوں کہ ہندی کا یہی مسلمان شاعر حکیم الدین خان پنچھی[۴۸۷] اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ ریختہ میں کہہ اٹھتا ہے:

نین! تم سے چلی ہے ناز کی یہ طرح دنیا میں[۴۸۸]
کہ دکھلا دو اسے جھلکی نہ ملنا اور ٹھٹک جانا

---

[۴۸۵] دیوان غالب اردو، نول کشور، ۱۳۰۴ھ صفحہ ۳۶۔ غالب نامہ مطبوعہ ۱۹۳۶ء صفحہ ۳۶۶۔ [۴۸۶] تذکرہ چمنستان شعرا، از شفیق اورنگ آبادی صفحہ ۴۳۔ رسالہ ہندستانی، سہ ماہی، صفحہ ۲۰۱ بابت ۱۹۳۹ء جواہر سخن، صفحہ ۸۵۔ [۴۸۷] ہندی کا تخلص "پنچھی" یعنی عشقی بلگرامی تھا۔ مد نون حیدر آباد۔ شائق و ماجز تخلص نیز رسالہ [۴۸۸] مکان کی بنیاد کا قائم کرنا۔ نئی عمارت کا نمونہ۔ نقاشی۔

مظہر علی خاں شفیق عرف مرزا بڈھن کہتے ہیں :-

گھونگھٹ کو تمہارے اب منھ پر سے اٹھا لیجے

آنا ہے یہی جی میں سینے سے لگا لیجے [۴۸۹]

اس سے پیشتر عہد اورنگ زیب کا مایۂ ناز کامل فن علامہ [۴۹۰]

اپنا خیال یوں ظاہر کر چکا تھا۔

پھلواری گھونگھٹ کی باتیں جات

سُمن باس بن چھائیں ہنیں سُہات

(گھونگھٹ نکال کر باغ میں اس لئے جاتے ہیں کہ بغیر سایہ کے

خوشبو کا لطف نہیں ہوتا۔) [۴۹۱]

میر میراں ہاشمی، بیجاپور کے متوطن، علی عادل شاہ کے درباری

شاعر تھے۔ ۱۱۰۹ھ (۱۶۹۷ء) میں انتقال کیا۔ دکن کے مثنوا فی نوعمر

میں فرماتے ہیں :-

پکڑ کر بات پردے میں لے جاویں گے تو میں کھول گی

گھونگھٹ میں مکھ چھپا کر کمکمیں ہر کا مار بیٹھوں گی [۴۹۲]

---

[۴۸۹] صفحہ ۳۴۴ - مجموعۂ نغز، حصہ اول۔ [۴۹۰] میر عبدالجلیل بلگرامی۔

[۴۹۱] حیات جلیل، حصہ دوم، صفحہ ۸۲، بحوالہ سرو آزاد، صفحہ ۳۷۰۔

[۴۹۲] تذکرۂ ریختی گویان، صفحہ ۸۴، از تمکین کاظمی۔

یہ تو اپنے ہی اہل وطن کا افسونِ جنون اور اُن کی دید و وادید کی فلسفیانی داستان تھی۔ اب اغیار اور باہر والوں کی سرگزشت بھی کچھ سن لیجئے۔

مصر کے نامور مفکر اور قائد قاسم بک امین[۲۹۲] نے پردۂ نسواں کے سلسلہ میں اسکی پوری تحقیق کی ہے۔ باوجود اپنی وسیع المشربی روشن خیالی اور آزادروی کے عورتوں کی بے پردگی، مردوں کی بے راہ روی اور آوارگی سے اور نظر بازیوں سے بچانے کے لئے اس احتجاب و نقاب یا چہرہ کو چھپانے والے گھونگھٹ کو ضروری قرار دیا ہے۔ شاید موصوف کے نزدیک حجابِ شرعی کی حد بندی یہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"جس کسی نے تاریخ کو دیکھا اور پڑھا ہے اُس کو علم ہوگا کہ اس عالم میں عورت کی زندگی کے دوروں میں سے حجاب و پردہ بھی ایک تاریخی دور تھا۔ فرانسیسی فلاسفر لاروس LAROUSSE نے کلمہ "خمار" کے تحت میں لکھا ہے کہ یونان کی عورتیں "خمار" استعمال کرتی تھیں، جس وقت باہر نکلتیں اس کے ایک پلو سے منہ چھپا لیتی تھیں کانت نساء الیونان یستعملن الخمار اذا خرجن

۲۹۲ فوج کا سردار۔ لشکر کش۔ اندھے کو لاٹھی کے سہارے لے چلنے والا۔

ویخفین وجوھھن بطرف منہ کما ھو الآن عند الامم الشرقیۃ۔ مشرق کی قوموں میں بالکل ایسا ہی دستور اب بھی چلا آتا ہے۔[۴۹۴]

اسی دیار کا وسیع العلم و محقق مورخ محمد طلعت بک عرب اپنی کتاب تربیۃ المراۃ و الحجاب میں ان کا ہم آہنگ و ہم نوا ہے۔[۴۹۵]

علامہ محترم سید سلیمان ندوی نے اپنے شباب اور معارف کے بچپن میں ایک مضمون "اسلام اور زنانِ ہند" کے عنوان سے لکھا تھا۔ فرماتے ہیں کہ:۔

"اوڑھنی یا دوپٹہ کے آنچل کو چہرہ پر اس طرح لٹکانا کہ "گھونگھٹ" نکل آئے اور چہرہ بالکل چھپ جائے، ہندوستان کی نہایت قدیم رسم ہے۔ جو ہر حصہ ملک میں عام ہے۔ اور ہر طبقہ میں پسندیدہ و رائج ہے۔ اس کے لئے ہر ہندوستانی زبان میں لفظ موجود ہے۔ گھونگھٹ کے لئے یہ ضروری ہے کہ عورت اپنے سسرال کے ہر شخص کے سامنے نکال کر بیٹھے۔ اور صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ سسرال کے قریب پہنچتے ہی اس کا نکال لینا عورت پر واجب ہو جاتا ہے۔[۴۹۶]

---

[۴۹۴] صفحات ۵۴ و ۵۵، تحریر المراۃ، مطبوعہ مکتبہ ترقی قاہرہ، ۱۳۱۶ھ

[۴۹۵] مطبوعہ مصر القاہرہ، ۱۸۹۹ء ـ [۴۹۶] معارف، نمبر ۳ جلد ۶ ماہ ستمبر ۱۹۲۰ء صفحہ ۲۲۲، بحوالہ برٹش اینڈ انڈیا۔

خاتمہ و معذرت

ذی علم زندہ دل پڑھنے والو! خدا اگر کے میری ہرزہ گوئی[۴۹۷] یاوہ سرائی[۴۹۸] اور پریشان نگاری ختم پر آئی۔ ساتھ ہی بنجامن فرینک لن (BENJAMIN FRANKLIN) (ولادت ۱۷۰۶ء – وفات ۱۷۹۰ء) کا ایک حسب حال دلچسپ واقعہ یاد آ گیا۔ جو ایک امریکی نژاد قادر الکلام صاحب علم تھا۔ کچھ کم دو صدی پرانی بات ہے، جس کو میر ناصر علی خاں بہادر دہلوی نے "صلائے عام" میں نقل فرمایا ہے۔[۴۹۹] فرینک لن کسی انگریزی رسالہ کی مجلس ادارہ کا صدر تھا۔ کوئی صاحب اس کے پاس اپنی تصنیف لے کر پہنچے۔ عرض کیا کہ "اسے چھاپ دیجئے" ان کی طبع زاد کی ترکیب و ترتیب مجنوں کی بڑ کی طرح بے ربط تھی۔ فرینک لن نے کہا کہ "آپ کے کلام کی ترکیب و ترتیب ٹھیک نہیں"۔ صاحب تصنیف معقول پسند و زود رس

---

[۴۹۷] بے ہودہ۔ [۴۹۸] ترکی لفظ ہے، بیہودہ۔ گم دنیا پدید [۴۹۹] نمبر ۵ جلد ۸ ماہ جون ۱۹۱۵ء صفحہ ۵۔ یہ امریکا کا مشہور فاضل و موجد مصنف تھا جس نے سب سے اول علم برق کے اصول دریافت کئے تھے۔ بوسٹن میں پیدا ہوا تھا۔

معاملہ فہم تھے فرمایا کہ "جہاں سے آپ کو پسند آئے چھاپ دیجئے۔ میری طرف سے آگے پیچھے، متقدم و موخر کی شرط نہیں۔ چاہے بیچ میں سے چھاپئے، چاہے آخر سے، جہاں سے آپ کی خوشی ہو چھاپ دیجئے۔"

مقبول، ہیچ مداں کے اس نامعقول مجموعۂ ہفوات اور اس کے بے سلسلہ، سوختہ سامان اجزا کی حالت بھی یہی ہے کہ اس میں پچھلے اور پہلے کا خیال و لحاظ نہیں۔ جو کچھ چاہئے اور جہاں سے چاہئے اسے پہلے پڑھئے۔ اور پہلا پیچھے۔ اور جو پسند نہ آئے، بے تکلف چھوڑ دیجئے

فسانہ گو نیند کیونکر آئے، یہ سوچ رہ رہ کے ہے کہ تو نے

عجب کہانی کہی کہ جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا ہے

اس سیہ کار کو اپنی کم علمی اور اس پر غلط اندیشی و بے راہ روی کا اچھی طرح احساس ہے۔ اعتراف بھی۔ اس بلند آہنگ و دانش مند کا ہم نوا کیسے ہو سکتا ہوں، جس نے یہ سبق دیا تھا:۔

کلمتان غیر بینتانِ فاحتملوا ھما کَلِمَةُ حِکَمٍ من سَفِیہ فاقبلوا ھا وکَلِمَةُ سَفِہٍ من حَکِیمٍ فاغفروا ھا

(دو باتیں بے محل تو ہیں انھیں گوارا کرو۔ دانائی کی بات جو نادان

کہے اُسے قبول کر لو۔ اور نادانی کی بات جو دانا کہے اُسے بخش دو)۔

اس تنگ حوصلہ کوتہ دست کے حصہ میں فرزانگی [۵] اور دانائی کے پھول بہت کم آئے ہیں۔ خار دِ خسک [۱۰] ہی سے اپنی ہوس کا دامن فراخ بھرا ہوا ہے۔ فاغفروہ

عرض مقبول

حضرات ناشرین کا منت پذیر ہوں، سپاس گزار بھی۔ اس تجویز یا تحریر کا ایک خاکہ میں نے مئی ۱۹۴۸ء کے "شاہکار" میں شائع کیا تھا۔ جب ہر طرف سے سکوت رہا تو میں نے بھی تجسس و تلاشِ مزید کا خیال چھوڑ دیا۔ اور دوسری علمی و ادبی خدمتوں میں مشغول ہو گیا۔ تھکا ہوا مسافر دم لینا در کنار، ابھی بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ ان عزیزوں نے بھولی ہوئی کہانی یاد دلائی۔ اپنی توجہ و التفات سے سرگرم و مصروفِ کار رکھا، اور یہ اوراق بعجلت تمام سیاہ کرا دیئے۔ اچھا۔ ایک بیدادگرِ رنج فزا اور بھی ہا

اس کے بعد طباعت و اشاعت میں جو تاخیر ہوئی یا مجبوریاں پیش آئیں اُن پر افسوس ہے۔ مقامی حالات و انتظامی موانع سے ناگزیر تھیں۔

---

[۵] دانش مندی۔ [۱۰] گھانس دار دانہ۔ ہندی گوکھرو جو ایسے ہی لوہے کے بنے ہوئے میدانِ جنگ میں ڈال دیے جاتے تھے۔

فہرست مضامین

مغل

عرضِ مقبول ۳۸۰

نوٹ اور مقالے ۔ اختتام

عدد سلسلہ	مقالہ یا نوٹ	دربارہ	صفحہ
۱	مقالہ	راجپوت	۱۳۵
۲	"	مغل	۱۶۷
۳	نوٹ	ملا نورالدین جامی	۱۷۳
۴	"	توران	۱۷۵
۵	"	زبانیں	۱۷۷
۶	"	ابوریحان بیرونی	۱۷۹
۷	"	ابواسحٰق اصطخری	۱۸۲
۸	"	ابن حوقل موصلی	۱۸۳
۹	"	کرنل ٹاڈ	۱۸۴
۱۰	"	گروتس اور بیمس	۱۸۷
۱۱	"	محمود خلجی	۱۹۰
۱۲	"	مالوہ	۱۹۲
۱۳	"	راجہ تندا	۱۹۳
۱۴	"	ذوالکفل	۱۹۴
۱۵	"	جودی (پہاڑ)	۱۹۶
۱۶	"	یہودیہ	۱۹۹

مصنف محترم کی دو کتابیں

(۱)

(منقول از رسالۂ زمانہ کانپور' بابت ماہ اپریل ۱۹۳۰ء تنقید کتب)

حیات جلیل از مولوی سید مقبول احمد صمدنی - اوسط تقطیع - حجم تقریباً پانچ سو صفحات - مجلد قیمت للعہ

یہ "تذکرہ مولانا آزاد بلگرامی مرحوم کے نانا میر عبدالجلیل بلگرامی کے سوانح حیات' نیز ان کے علمی و ادبی مشاغل وغیرہ پر مشتمل ہے۔ یہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں میر صاحب کے ذاتی حالات و صفات ہیں اور دوسرے میں ان کے علمی و ادبی ذوق و تصانیف کا ذکر۔ ان پر تبصرہ۔ نیز ان کی اولاد' معاصرین وغیرہ کے حالات ہیں۔

بظاہر یہ میر عبدالجلیل صاحب کا تذکرہ ہے لیکن باطن میں علمی ادبی اور تاریخی رموز و نکات کا ایک دریا ہے مواج ہے۔ اصل تذکرہ میں ضمناً جس قدر علمی و ادبی مسائل' تاریخی واقعات و اشخاص اور شعراء کا ذکر آگیا ہے۔ ان کے متعلق حاشیہ پر نفید و کارآمد بحث اور مفصل حالات لکھ دئے ہیں۔ ایسے حواشی کی تعداد ۳۷۹ ہے۔ اگرچہ حواشی کی کثرت اکثر جگہ اصل تذکرہ کے مطالعہ میں خلل انداز ہوتی ہے اور قاری کی توجہ متن سے ہٹ کر حاشیہ کی طرف چلی جاتی ہے لیکن یہ حواشی بھی متن سے کم کیا زیادہ ضروری اور مفید ہیں جن سے قاری کی معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی خوبی ہے جس نے اس تذکرہ کی اہمیت بڑھادی ہے۔
علمی و تاریخی مسائل سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔

نیز مسٹر آر۔ پی ڈیوہرٹ کا فاضلانہ ریویو رائل ایشیاٹک سوسائٹی برطانیہ عظمیٰ و آئرلینڈ (لندن) کے جرنل اکتوبر ۱۹۲۹ء میں ملاحظہ ہو۔

(۲)

تبصرہ۔ از رسالہ شاہکار لاہور بابتہ ماہ مارچ ۱۹۳۹ء

تاریخ الہ آباد حصہ اوّل۔ تاریخی اور تحقیقی اعتبار سے اس کتاب کا پایہ بہت بلند ہے۔ مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی مؤلف ہیں۔ مؤلف نے اپنی تاریخی معلومات کا بہترین ثبوت پیش کیا ہے۔ کتاب کے پچیس ابواب ہیں بعض مختصر اور اکثر مفصل۔ شروع میں مصنف کی تصویر ہے۔ اس کے علاوہ نو تصویریں اور بھی شامل کتاب ہیں۔ دو سہ رنگی اور سات یک رنگی کتاب کے مؤلف تصویر سے ضعیف العمر معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن انداز تحریر دلکش اور شباب ریز ہے۔ انداز بیان میں اتنی روانی ہے کہ مجبوراً داد دینی پڑتی ہے۔

اس تاریخ میں دو بہت بڑی خوبیاں ہیں۔ اجمالی حیثیت سے تو یہ ہندوستان کے مغل حکمرانوں کی تاریخ ہے اور تفصیلی حیثیت سے الہ آباد کی تاریخ ہے اور تیسری حیثیت یہ بھی ہے۔ کہ جہانگیر کے لڑکے خسرو کی مفصل سرگذشت کی آئینہ دار ہے ہر لحاظ سے کتاب جامع ہے اور اس قابل ہے کہ ہندوستان کی لائبریریاں اس سے مزین ہوں۔ بلکہ اگر الہ آباد کی ٹیکسٹ بک کمیٹی اس کو منظور کرے تو بہت زیادہ مفید ثابت ہوگی۔

ہندوستان کے مصنفین کی بہت کم ایسی تصنیفات ہوتی ہیں جو ٹھوس بھی ہوں اور دلچسپ بھی۔ اور تاریخی مضامین تو اتنے روکھے پھیکے ہوتے ہیں کہ بہت کم لوگ پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن تاریخ الہ آباد کے پڑھنے والے اس کی دلچسپی کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور یہ مؤلف کا کمال ہے ہندوستان کو ایسے مؤلفوں کی اور ایسی تصنیفات کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔

کتاب کا آغاز خسرو باغ سے ہوتا ہے اور صرف خسرو باغ کی تفصیلات

۱۲۸ صفحات میں ختم ہوئی ہیں۔ اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ مؤلف نے اختصار کی کوشش کی ہے۔ اگر حسب منشاء لکھنے کا موقع ملتا تو اس کے لئے دفتروں کی ضرورت تھی۔ پھر لطف یہ ہے کہ شروع سے آخر تک پڑھ جائیے کہیں کوئی جملہ فضول یا بھرتی کا نہ ملے گا۔ مختصر یہ کہ بڑی دلچسپ کتاب ہے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب، کاغذ عمدہ، مجلد۔ نہایت نفیس اور عمدہ جلد اور قیمت صرف للعہ

الہ آباد پبلشنگ ہاؤس۔ الہ آباد

سے
طلب کیجئے